جاپانی افسانہ نگار خواتین

بیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب

تالیف

نوریکو میزوتا لپٹ اور کیوکو اریے سیلڈن

ترجمہ

الطاف فاطمہ

جاپانی افسانہ نگار خواتین

جاپانی افسانہ نگار خواتین

(بیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب)

تالیف

نوریکو میزوٹا لپٹ اور کیوکو اریے سیلڈن

ترجمہ

الطاف فاطمہ

مشعل

آر۔بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور 54600 ' پاکستان

جاپانی افسانہ نگار خواتین: بیسویں صدی کی خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب

Japani Women writers: Twentieth Century Short Fiction

کاپی رائٹ انگریزی: ۱۹۹۱ ایم۔ای۔شارپ
Copyright English, 1991: M.E. Sharpe

کاپی رائٹ انگریزی: ۱۹۹۴ مشعل پاکستان
Copyright English, 1994: Mashal Pakistan

آر۔بی۔۵۔عوامی کمپلیکس عثمان بلاک
R.B. -5 Awami Complex, Usman Block

نیو گارڈن ٹاؤن۔لاہور پاکستان
New Garden Town, Lahore Pakistan

تاریخ اشاعت: اکتوبر 1992ء
Date of Publication: October, 1992

اردو ترجمہ: الطاف فاطمہ
Urdu Translation: Altaf Fatima

پبلشر: مشعل بکس، لاہور
Publisher: **Mashal Books Lahore**

یہ کتاب مشعل پاکستان سے براہ راست حاصل کی جاسکتی ہے۔

This Book is also available with Mashal Pakistan

پیش لفظ

جاپانی بساط ادب کے تازہ وارد شائقین جنہیں جاپانی ادب سے نئی نئی شناسائی حاصل ہوئی ہے، یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ اس زبان کے عظیم ادبی فن پاروں میں بڑی تعداد خواتین کی تخلیقات کی ہے۔

''داستان گنجی'' اور سرہانے والی کتاب (Pillow Book) جیسی عظیم نثری تخلیقات جن کا تعلق کلاسیکی دور سے ہے، خواتین ہی کی تصانیف ہیں۔ اسی طرح شعری الحان اور اسالیب میں لکھے ہوئے روزنامچے جو جاپانی کلاسیکی ادب میں ایک خاصے کی چیز اور بہت بڑی صنف شمار ہوتے ہیں، تمام تر خواتین کی ہی قلمی کاوشوں کا ثمر ہیں۔

کلاسیکی ادب میں جو نمایاں حیثیت خواتین کو حاصل ہے وہ نثر تک ہی محدود نہیں بلکہ کوئی ایک سو تیس سے زائد خواتین شاعر کا وہ کلام بھی شامل ہے جس کو روح عصر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ قورن اولیٰ کی جاپانی شاعری کے منتخب نمونے شعری گلدستے مانیوشو میں شامل ہیں۔ یہ گلدستہ انتخاب آٹھویں صدی عیسوی میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں شامل خواتین شعرا کی علمی اور طبقاتی سطحیں مختلف اور متنوع تھیں۔

اس اولین شعری گلدستے: مانیوشو کے پوری ایک صدی بعد دوسرا قدیم ترین انتخاب کوکن شو کے نام سے مرتب ہوا اور اس انتخاب کی خصوصیات یہ تھی کہ اس میں صرف چوٹی کے منجھے ہوئے سخن وروں کا منتخب کلام شامل تھا۔ ''کوکن شو'' میں بھی خاتون شعرا کا کلام ہر اعتبار سے مرد شعرا کے کلام کے ہم پلہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اونونوکوماچی (Ono Nokomachi) اور ازومی شیکی بو (Izumi Shikibo) کو اپنے عہد کی مقبول ترین اور نغز گو شاعر کا مرتبہ اور مقام حاصل تھا۔

ورجینا وولف نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ روایتی لحاظ سے شاعری عورتوں کے لئے کوئی مناسب اور موثر ذریعہ اظہار نہیں ہوسکتی، اس لئے وہ خود کو کائنات کا مرکز بنانے اور اس مقام سے اس کی توضیح یا تنقید کرنے کا خیال بھی نہیں کرسکتیں، لیکن کلاسیکی دور کی جاپانی شاعرات نے

جس خوبی اور قادر الکلامی سے شعری اسالیب کو برتا ہے وہ کم از کم جاپان کی حد تک مذکورہ بالا نظریے کو باطل کر دیتا ہے۔

مانیوشو کے دور میں جاپانی خواتین کی حیرات زا تخلیقی جودت، بلاشبہ جاپانی عورت کی آزادی فکر و خیال اور نسبتاً اعلیٰ سیاسی اور اقتصادی پوزیشن کی عکاسی کرتی ہے۔ جو انہیں اس سماج میں حاصل تھی۔ ہیان عہد (1185-794) میں جب بدھ مت اور کنفیوشس کی تعلیمات اور افکار کے زیر اثر عورت کے دائرۂ کار کو محدود کر کے اس کی سیاسی اور اقتصادی ذمہ داریوں کو صرف گھر کی چار دیواری تک محدود کر دیا گیا تھا تو اس وقت بھی ان کی ذہنی اور فکری کاوشوں پر کوئی بند نہ باندھا جا سکا تھا اس وقت بھی عورتوں کے کلاسیکی شاعری کی ترویج میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاعری کو کلیتاً گیت یا نغماتی واکا یا تانکا (Waka or Tanka) طرز اظہار سے تعبیر کیا جانے لگا تھا اور اسے متفقہ سماجی سطح پر اظہار محبت کا ذریعہ اور پیمانہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ شاعری کے لئے جو تحریری رسم الخط منتخب کیا گیا تھا وہ وہی تھا جو کانا (Kana) کہلاتا ہے۔ جاپانی حروف صوت کے انداز پر لکھی جانے والی یہ تحریر چینی زبان کے اس ''کانا'' سے بہت مختلف تھی جو سرکاری دستاویزات کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ رسم الخط کا یہ تحریری انداز اونوموچی یعنی نسوانی حروف سے مشخص کیا جاتا تھا۔ مردوں کے نزدیک یہ انداز بے وقعت اور شائستگی و شستگی سے گرا ہوا تھا۔ اور یہ فقط ''واکا'' یعنی شاعری کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

جاپان کے نثری داستانی ادب کے ارتقاء اور ترویج میں شعری الحان کا بڑا کردار رہا ہے۔ اس نثری اسلوب کا سرچشمہ وہ طویل پیش لفظ اور مقدمات ہی قرار پائے جو نظموں اور ادب لطیف یعنی نثر میں شعری اسالیب پر لکھے ہوئے روزناچوں کے تعارف اور نقد و نظر کے پیش نظر لکھے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں یہی طرز بیان لوک کہانیوں اور داستان گوئی کے سلسلے میں بھی استعمال کیا گیا۔ کلاسیکی شاعری کا مخصوص تغزل بڑی حد تک نثری داستانی ادب اور قصہ گوئی میں سرایت کرتا رہا۔ اور اس طرح نثر میں شعری الحان کی روایت جاری رہی۔

مثنوی یا شاعری میں تحریر کیا ہوا غنائیت سے بھر پور ادب جو ''اوٹا مونو گٹاری'' (Utamonogatari) کے نام سے موسوم ہوا اور منظوم روزناچے جو خواتین نے تحریر کئے ان کی نفسیاتی اور داخلی کیفیتوں اور شور کے آئینہ دار بھی ہیں، اور تجزیہ بھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خواتین

کی ہی یہ تخلیقات کلاسیکی ادب کی بنیاد قرار پائیں۔

ورجینیا وولف کا یہ قول جاپانی خواتین پر حرف بحرف صادق آتا ہے کہ ''ناول نگاری'' خواتین کے لئے موزوں ترین اور بڑی ہی مناسب صنف ادب ہے۔ اس نے کہا زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر خواتین کی گرفت، ان کی متجسانہ فطرت اور قوت مشاہدہ کی بنا پر مضبوط ہوتی ہے۔ خصوصیت سے اس دور میں جب عورت کے دائرہ کار کو گھر کی چار دیواری اور امور خانہ داری تک محدود کر دیا گیا ہو، سماجی سرگرمیوں میں شرکت کا دروازہ ان پر بند ہوتا ہے تو ان کے اپنے اندر ایک اور در کشادہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ نیا باب نانیوں اور دادیوں کے روپ میں قصہ اور داستان گوئی کا ہوتا ہے۔ ان میں سینہ بہ سینہ وا ہوتا چلا جاتا ہے۔

عورتوں میں داستان گوئی یا قصہ کہانی سنانے کا فن بہت پرانا ہے اور اس کے ڈانڈے عہد قدیم سے ملتے ہیں۔ عہد قدیم میں جاپانی خواتین لوک داستانوں اور زبانی ادب کے ابلاغ وترویج کا موثر ترین وسیلہ تھیں۔ اس لوک ورثہ کی پہلی کتاب ''کوہی کی'' (712ء) تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مجموعہ ایک خاتون ہائی ایڈانو آرے نے مرتب کیا تھا۔

اس کے ذمہ یہی کام تھا کہ ابتدائی دیومالائی عہد سے لے کر اپنے زمانہ تک کی قومی تاریخی نوعیت سے متعلق کہانیاں بیان کرے۔ ایک چینی عالم یاسومارو کے ذمہ یہ فرض تھا کہ وہ اس کی بیان کردہ کہانیوں کو ضبط تحریر میں لائے۔ افسانوی ادب کی منفردہ صنف مونو گٹاری (Monogatari) ہے جو فن داستان گوئی کی ایک شاخ یعنی ناول نگاری سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں خواتین اہل قلم نے ہیان (heian) عہد میں بڑا فیصلہ کن رول ادا کیا۔ اگرچہ اس وقت عورتوں کو درباری امتحانی نظام سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، اس طرح وہ چینی زبان، تاریخ اور ادب کی تعلم کی اس محنت شاقہ سے محفوظ رہیں جو مردوں کو لازمی طور پر بھگتنی پڑتی تھی۔ تاہم تعلیم کی اس روشنی اور چرچے سے خواتین کا طبقہ بھی فیض یاب ہوتا رہا۔ اس عہد میں چونکہ محلات اور دربار شاہی میں تعلیم یافتہ عورتوں ہی کو بچوں کی اناؤں اور کھلائیوں کے طور پر ملازمت دی جاتی تھی اور اس طرح ملکہ اور شہزادیوں کی خادماؤں، خواصوں اور مصاحب خواتین کے لئے بھی ملازمت کی شرط تعلیم یافتہ ہونا ہی تھی۔

اس لئے اوسط اور نچلے درجے کے خوش حال لوگوں میں اپنی بیٹیوں کو تعلیم دلوانے کا شوق پیدا ہوا۔ شاہی خواتین کی درباری مجلسوں اور مہمان خانوں کی محفلوں میں خاتون شاعر اور فن

موسیقی کی ماہرین کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

مونو گٹاری (غنائی افسانوی ادب) کی ترویج اور ''واکا'' (Waka) شعری ادب کیلئے روزمرہ کی قومی زبان (کجی توبی) ''کانا'' (Kana) ہی مستعمل تھی۔ اور یہ بہت منفرد بات تھی۔ جس طرح چاسر نے اپنے معاصرین کی لاطینی تحریروں کے مقابلے میں انگریزی ادب کے استعمال کو رواج دے کر انگریزی ادب میں ایک نئی روایت کا آغاز کیا تھا۔ اسی طرح جاپانی خواتین نے اپنے کلام اور بیان کے لئے عوامی روزمرہ ''کانا'' کے استعمال سے جاپان کی ادب روایت میں ایک نئے کوچے کو دریافت کیا اور ایک نئی رسم کی بنا ڈالی۔

''ہیان'' دور میں ادبی میدانوں میں عورتوں کی سربلندی اور فعال کردار کے باوجود ان کی سماجی حیثیت اور مرتبہ گھٹتا اور گرتا گیا۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مکمل طور پر ان کے سیاسی اور معاشی حقوق سلب کر لئے گئے۔ ہیان دور کے بعد برسر اقتدار آنے والا دور جاگیرداری عہد تھا اور اس دور کا نمایاں وصف ہی یہ تھا کہ عورت کلیتاً گھریلو دنیا میں پابند اور مقید ہو کر رہ گئی۔ اسی دور میں ان کو شوہروں کی کثیر الازدواجی کے دکھ بھی بھوگنا پڑے۔

لٹریچر اور آرٹ میں اعلیٰ صلاحیت اور اس کی فنی لطافتوں اور نزاکتوں سے بہرہ ور اور مزین ہونے اور انسانی جذبوں کی راخلیت کا ادراک رکھنے کے باوجود عورتیں سماجی بندشوں کے تحت اس کے اظہار سے محروم کر دی گئی تھیں لیکن ان کے اندر تخلیق کے سوتے بدستور جاری رہے۔ چنانچہ اعلیٰ طبقے کے عورتوں نے خارجی ہنگاموں سے دور تنہائی میں اپنے ہی گرد پھیلے زندگی کے مصائب و آلام پر خامہ فرسائی شروع کر دی۔ خواتین خالص شاعرانہ انداز میں اپنی ڈائریاں لکھتی تھیں۔

جبکہ مردانہ ڈائریاں یا روزنامچے سرکاری دستاویزیں اور تاریخی اسناد چینی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔

ان ڈائریوں میں وہ جذبات و محسوسات کی داخلی دنیائیں تخلیق کرتی تھی۔ ان روزنامچوں اور آپ بیتیوں نے، جو گہر نفسیاتی تجزیات پر مبنی ہوتی تھیں، جدید ناول نگاری کے لئے بنیادیں فراہم کیں۔ ان روزنامچوں اور آپ بیتیوں کا جاپان کے افسانوی ادب کے ارتقا میں اہم کردار ہے۔

جاپانی ادب کے ساخت میں ایک طرح کی ثنویت ہے۔ یعنی ادب دو قسم کے طرز اظہار''

کان بن'' اور'' کانا'' کے درمیان منقسم ہے یایوں کہہ لیجئے ایک وہ انداز بیان اور اسلوب جو مرد اہل قلم کو مرغوب تھا اور ان کی تحریروں کے لئے مخصوص تھا۔ اور دوسرا نسوانی انداز بیان۔ مردوں نے بھی بلاشبہ'' واکا'' میں شاعری کی اور'' کانا'' میں دوسری اصناف لکھیں۔

ایڈو (Edo) میں جب تاجر طبقہ ادب نوازی کی طرف مائل ہوا اور ایک طرح سے اس کا سر پرست اور مربی بن گیا تو افسانوی ادب بھی کانا میں لکھا جانے لگا۔ تاہم مجموعی طور پر صورت حال یہ تھی کہ چینی انداز اور اسالیب میں لکھے ہوئے مردانہ ادب کی بالا دستی اور دانشور حلقوں میں موجودہ دور تک برقرار رہی۔ تاوقتیکہ اہل جاپان نے مغربی علم ودانش کو علم وحکمت کا سرچشمہ تسلیم کر کے اس طرف اپنا رخ نہ کر لیا۔ یوں مردانہ ادب وتحریریں چینی نثر ونفوذ سے آزاد ہوا۔

ادب کے زنانہ دبستان کو رفتہ رفتہ ایک مستقل علیحدہ صنف تسلیم کر لیا گیا تو ان کے لئے اسالیب اور طرز بیان کو بھی بھرپور انداز میں قبول عام کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں جاپانی ادب کی فضا میں ایک نئی تخلیقی صورت حال نمایاں ہوئی جو مغربی ادب کی عصری روایتوں سے یکسر مختلف اور قطعی طور پر منفرد تھی۔ عہد قدیم کے پورے کلاسیکی ادب پر تعلیم یافتہ خواتین ہی چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ مستقل شعری ادب، مونوگٹاری اور روزناموں کی تحریر وتصنیف میں مصروف نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایسی یادداشتیں بھی تحریر کرتی ہیں جن کو اعترافات اور اقبالی بیان کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان میں وہ کھلم کھلا اپنی لغزشوں، خطاریوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی بات کرتی ہیں۔ ان تحریروں میں از منہ وسطیٰ بلکہ ایک حد تک'' ایڈو'' دور تک روز افزوں اضافہ ہی نظر آتا ہے۔

زنانہ دبستان ادب کا مکمل احیا میجی (1868-1912) اور تائشو (1912-1926) عہد میں اس وقت ہوا جب جاپان نے جدید اقدار اور رجحانات کو اپنایا۔ انسانی حقوق کی تحریک نے خواتین کے جذبہ خود آگہی کو جھنجھوڑ کر بیدار ہی نہیں کیا بلکہ ان کی گم گشتہ خواہش اظہار اور تمنائے تخلیق کو تحریک دی۔ اس دور میں مسیحی مشنریوں کی آمد مغربی افکار کی ایک رو اپنے ساتھ لائی جو خصوصاً طبقہ نسواں کے حقوق کی تحریک کا باعث بنی۔ اس تحریک کے تحت جاپانی عورت کا سماجی اور ادبی شعور ایک تدریجی انداز میں ارتقاء پذیر ہوا۔ اس کے نتیجے میں ایسی دانشور خواتین ابھریں جو اپنے سماجی رتبے اور نئے سماجی تناظر میں اپنے تشخص کے بارے میں انتہائی فکر مند تھیں۔

چنانچہ اسے ایک فطری امر ہی کہنا مناسب ہوگا کہ 1911ء میں سیتو (Seito) نیلی

جرابیں کے نام سے جاپان کی صف اول کی خواتین کے ادبی گروپ نے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی، یہی وہ تنظیم تھی جس نے جاپانی خواتین کا پہلا رسالہ جاری کیا۔ اس انجمن نے بہت سی ایسی خواتین کو اپنی جانب متوجہ کیا جن کا بنیادی مسئلہ اظہار ذات تھا۔ اس انجمن کا یہ رسالہ بہت جلد ایک ادبی فورم کی شکل اختیار کر گیا۔

دوسری طرف دور جدید کے سماجی رویوں نے ادیب خواتین کو ان کے گروہ سمیت ادبی دنیا کی سرگرمیوں سے الگ تھلگ کر کے تنہائی کا شکار کر دیا۔ ان کی تصانیف سے یہ سلوک اختیار کیا گیا کہ ان کا خانہ ہی الگ کر دیا گیا جیسے وہ کسی علیحدہ نوع سے تعلق رکھتی ہوں۔ ان کو ادبی ہریجنوں کا درجہ دے کر ان کی خدمات ارتقا کے عمل میں ان کے حصہ کو یوں نظر انداز کیا گیا جیسے انہوں نے ادب کی کوئی خدمت ہی نہ کی ہو۔ اس علیحدگی نے اگرچہ خواتین ادیبوں میں مردوں سے مسابقت کے جذبے کو بیدار اور فعال رکھا، لیکن خواتین کے حلقوں میں مذاق ادب کا وہی طور راہ پا گیا جو زنانہ تعلیمی اداروں کی شکل میں خواتین کی جداگانہ تعلیم اور تربیت نے کیا۔ اور جس طرح جداگانہ کالجوں نے خواتین میں تعلیم کے پھیلاؤ میں مدد دی اسی طرح زنانہ دبستان ادب کی مسلمہ اور مستقل حیثیت قائم ہو جانے کے سبب خواتین کے اندر ادبی موضوعات پر جرات مندانہ اظہار کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔

نسوانی تشخص کو اجاگر کرنے اور عورت کے اصولوں اور کردار کی نئی تعریفات کا تعین کرنے کے لئے جاپان کی نئی ادیبہ نے بھی اپنی مغربی معاصرین کی طرح نسوانی سائیکی اور اس کے تحت شعور کی دنیا دریافت کرنے اور اسے متعارف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اینچی فیوموکو اور اوہامنا کو جیسی ادیباؤں کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ عورت کے بطون میں پوشیدہ اس لاشعوری دنیا کا احاطہ کیا جائے تا کہ صنف نازک بطور ادیب اپنے کھوئے بے لاگ طرز اظہار کو بحال کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے اور اس قبیل کی دوسری لکھنے والیوں نے شعوری اور دانستہ طور پر قدیم گوتھک روایات کو علامتی یا نیم تجریدی انداز میں آج کی عورت کی جدید سائیکی سے ہم رشتہ کر کے پچھلے دور کی اس عورت کی سائیکی کی ترجمانی کا حق ادا کیا جس کی آواز کو مردانہ استبداد کے تحت گھونٹ کر بدسلوکی کا ہدف بنا دیا گیا تھا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صنف نازک سے تعلق رکھنے والی اہل قلم کی تخلیقات میں ادب کے زنانہ دبستان کا وہی مخصوص تواتر اور تسلسل جو دوسری جنگ عظیم سے قبل روایت کے طور پر

موجود تھا، آج بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی محبت کے نفسیاتی تجزیے، نسوانی جنسیت اور جذبات کے اسرار اور پیچ وخم کی کھوج اور انسانی تعلق اور رشتوں کی پیدا کردہ ذہنی الجھنیں۔ آج بھی لکھنے والیاں اسی تصوراتی عورت کے امیج کے زیر اثر لکھ رہی ہیں۔ جو مشرقی ایشیا کی قدیم روایت کا آئیڈیل رہی ہے۔ اب یہ آئیڈیل جدید ناولوں اور ٹیلی ویژن کے لئے لکھی جانے والی تحریروں میں بھی سرایت کر گیا ہے۔

زیر نظر مجموعے میں جن اہل قلم خواتین کی تخلیقات شامل ہیں ان پر یقیناً اور واضح طور پر اس عہد میں ہونے والے واقعات کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں، اس لئے کہ بہر حال عورتیں تاریخی عمل کی شاہد بھی ہوتی ہیں اور مشہود بھی۔ چنانچہ اس دور کی اہل قلم خواتین نے جنگ اور ایٹم بم کی تباہ کاریوں اور طبقاتی اور صنعتی استحصال کے خلاف بھر پور آواز بھی بلند کی ہے۔ انہوں نے مفلوک الحال محنت کش طبقہ کا احوال اور سرمایہ دارانہ شاہ پرستی کے جبر سے ان کی نجات کی تجاویز بھی اپنے طور پر پیش کی ہیں حالانکہ خود ان کا اپنا تعلق اس طبقہ سے نہ تھا۔ کچھ اہل قلم خواتین ایسی بھی تھیں جن کی وفاداریاں سوشلسٹ انقلابی تحریک سے استوار تھیں۔ انہوں نے یہ سوال نہایت سنجیدگی سے اٹھایا کہ لٹریچر اور آرٹ کا سماجی اعتبار سے کیا رول ہے؟ ان لکھنے والیوں نے حقیقت پسندی کے کینوس کو وسیع تر کرنے میں مدد دی۔ اس قبیل کے ادب میں میاموٹو، یوری کو، ہیرا بیاشی، تائی کو، ساتا انی کو، ہیاشی فومیکو، اوتایوکو اور ہیاشی کایوکو کی نگارشات آتی ہیں۔ یہ ادب اس امر کا غماز ہے کہ جاپان میں خواتین ادیبوں کا سماجی شعور پوری طور بیدار ہے۔

ان کے علاوہ افسانہ نگار خواتین ایسی ہیں جو نئے طرز زندگی اور جنس کے بارے میں لکھ رہی ہیں۔ ان کا نقط نظر یہ ہے کہ جدید طرز حیات کی وساطت سے ہی وہ اس روایتی جنسی سماجی کردار کی بندشوں اور قیود سے نجات حاصل کر سکیں گی۔ جو موجودہ سماجی ڈھانچے نے ان پر مسلط کر رکھی ہیں۔

دوسری صنف میں وہ خواتین نظر آتی ہیں جو ایک قدم آگے بڑھ کر غیر متوازن نفسیاتی کیفیتوں، تشدد اور اسرار جیسے موضوعات پر جرات مندانہ انداز میں قلم اٹھاتی ہیں۔ ان میں تاکاہاشی، تکاکو اور کونوتائے کو جیسی اہل قلم شامل ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی موشگافیوں اور تجزیوں سے جدید طرز زندگی کی تنہائیوں اور سوختہ سامانیوں کی تہہ تک اتر کر اس کے اسباب وعلل کو دریافت کر سکیں۔ بسا اوقات ان کی بسائی ہوئی خیالی دنیا حد درجہ مبہم ہو جاتی

ہے اور کبھی انتہائی مضحکہ خیز اور حیرت زا بھی۔ ان کی ایسی بیشتر تحریروں اور تخلیقات عجوبہ خیالات کی عکاسی کرتی ہیں۔

مقبول عام لٹریچر کے مصنفین سے قطع نظر عام طور پر جدیدی دور کی لکھنے والی خواتین وجود ذات اور نجی اظہار کی تسکین اور تشفی کی خاطر وہ تشخص حاصل کرنا چاہتی ہیں جو ان کو ادیبوں کی صف اول میں لا کھڑا کرے۔ چنانچہ ان کی تخلیقات میں مرکزی حیثیت رکھنے والی خاتون ہیروئن سے زیادہ ہیرو نظر آتی ہے۔ اور ان ہی اوصاف سے متصف ہوتی ہے۔ یعنی وہ ہیرو کے ساتھ اس کی پخ یا حاشیہ بن کر نہیں ابھرتیں بلکہ قصے میں وہ ایک جداگانہ حیثیت کی حامل جدید اسلوب حیات کی نمائندہ بن کر سامنے آتی ہیں۔

نو ریکو میز ور ٹالپٹ اور کائی یوکولیری سلیڈن

ترتیب

میا موتو یوری کو

کوئی وائی کا کنبہ

فروری کی سرد اور تاریک رات اور کمرے میں آگ کے نام ایک چنگاری بھی نہ تھی۔ اوتامی، سلائی والی میز سے ٹیک لگائے سفید اور گہرے گہرے رنگین پھولوں والی روایتی چھینٹ سے سلے شب خوابی کے فرغل میں لپٹی لپٹائی منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔ فرغل کے کندھے پر ایک بڑا سا تیل کا داغ پیوند کی طرح چمک رہا تھا۔ میز کے نیچے پڑی چینی کی بھورے رنگ کی کانگڑی کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور اب تو بھوبل کی راکھ میں بھی گرمی باقی نہ تھی۔

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ نواحی علاقوں کے کالے آسمان جھمکتے ستاروں کی راہگذر سے چلتا ہوا پالا اب سڑکوں، گلیوں اور کھیتوں میں ڈیرے ڈال رہا تھا۔ کھیتوں کی مٹی تو مٹی یوں لگتا تھا کہ پالے کی ٹھر جسم کے پار ہوجانے والے تیر کی طرح ٹین کی چھت کو چھیدتی ہوئی کمرے میں روشنی اور حدت کا احساس دلانے والا وہ واحد بلب تھا جو سلائی والی میز کے عین اوپر چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ روشنی کا عکس میز کی سطح پر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کو بھی پالے نے یخ بستہ کر دیا ہو۔ اور اس کو انگلی لگانے کی بھی ہمت نہ ہو رہی تھی۔

اور تامی نے حسب معمول سردی سے بچنے کی خاطر اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لئے تھے اور ہاتھوں کو فرغل کی آستینوں کے اندر دبکا لیا تھا۔ منہ اٹھا کر اس نے اپنے شوہر کو دیکھا اور سردی سے بجتے ہوئے دانتوں میں گویا ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولی

ارے! گرم پانی کی بوتل تو ابھی گرم ہے نا!

اس کا شوہر سوتو مو میز کے نزدیک گھر کی واحد بید کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس وقت اس نے بھی گھر میں پہننے والی صدری کے بجائے شب خوابی کے فرغل ہی میں اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ وہ چہرہ دونوں ہتھیلیوں پر ٹکائے اپنے فراخ جبڑے فراخ دہانہ شمالی علاقہ جات

کے باسیوں کا امتیازی نشان ہے۔سوتو مومنہ ہی منہ میں بولا ’’ہاں ہے۔کہوتو تمہیں پکڑا دوں؟‘‘

’’ارے نہیں ٹھیک ہے تم اپنے پاس ہی رہنے دو۔‘‘

دونوں میاں بیوی نے اپنے منحنی اور مختصر جسموں کو فرغلوں میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ دونوں ہی دبکے دبکائے خاموش اپنے اپنے خیالوں میں گم بیٹھے تھے۔ اچانک ہی اوتامی نے اپنے پٹپرائے ہوئے خشک ہونٹوں کو اپنی زبان کی نوک سے تر کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ اپنی کمان سی ہلالی بھنویں اچکا کر بولی

’’مجھے تو کچھ یوں لگ رہا ہے کہ اس بارتو دادا جی منسوکو کا بستر گول کر کے یہاں بھیج ہی دیں گے۔‘‘

ہونہہ!

’’ان کے بارے میں کچھ کہا تو جا سکتا نہیں۔نہیں معلوم کس وقت کیا کر بیٹھیں۔‘‘

سامنے ہی میز پر دادا، تنیوسو کے کا خط آیا پڑا تھا۔ وہ خط سکے والی پنسل سے باریک جیسے کاغذ پر انتہائی بے ڈھنگے اور لاابالی انداز میں لکھا ہوا تھا۔ جس میں بزرگوں کے مروجہ دستور کے برعکس سرے سے کوئی القاب آداب یا دعائیہ کلمات موجود ہی نہ تھے......سیدھی سیدھی مطلب کی بات ہی سے خط کا آغاز کر دیا گیا جس کا وعدہ کر رکھا ہے اور یہ کہ ’’اس سے پہلے بھی تقاضہ کر چکا ہوں۔‘‘ پھر یہ کہ سوتو موتو اپنی تحریک کے کسی انتہائی کام میں الجھا ہوا ہوگا۔لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ یہاں بھی تو کنبے کے پانچ دم ہیں اور ان کے ساتھ پیٹ بھی لگا ہوا ہے۔ان کے پیٹ بھرنے کا سوال مقدم ہے۔اور صاف بات تو یہ ہے کہ ہمیں مطلب نہیں کہ سوتو موکی مصروفیات اور مسائل کیا ہیں۔ ہمارے آگے تو یہ پانچ جی ہیں۔جن کے پیٹ بھرنے کا سوال ہے اور اب تو آدھا پیٹ کھا کر بھی گذارا نہیں ہو رہا ہے۔بس اب میرے پاس تو ایک ہی صورت ہے کہ اب بھی اگر پیسے نہ آئے تو پھر مجبوراً متسو کو کا بوریا بستر سمیٹ کر واپس تم لوگوں کے پاس بھیجنا پڑے گا۔اب وہ ہمارے اوپر بوجھ بن کر رہ گئی ہے..........تنیوسو کے کے خطوط ہمیشہ ہی مچڑے اور مڑے تڑے ہوا کرتے تھے اور اسی انداز میں لکھے ہوئے، داغ دھبے لگے۔آج بھی جس پر مسٹر کوئی وائی سوتو لکھا ہوا تھا اس کے عین نیچے تیل کا یہ بڑا داغ لگا ہوا تھا جو خط کے کاغذ میں جذب ہو گیا تھا۔ یہ خط میاں بیوی دونوں ہی کو دادا کی تنی ہوئی موٹی موٹی بھنوؤں اور ماتھے کی لکیروں کی یاد دلا رہا تھا۔

وہاں اپنے قصبے میں تنیوسو کے سالہا سال سے ریڑھی لگا کر سامان بیچا کرتا تھا۔ اور اب اماں جی ما کی نے آمدنی میں مزید اضافے کے خیال سے یہ کیا کہ شام کے وقت اسی ریڑھے پر گرما گرم ایماگاوا مٹھائی لگا کر اس کو دریا کنارے گھاٹ پر بھیج دیا کرتی تھی۔ سچی بات ہے کہ گھاٹ والی سڑک تیز جھکڑوں کے باوجود خوب چلتی تھی۔ اور وہاں راہگیروں کا بڑا ہجوم رہتا۔ اس طرح ایک بجے تک خوب بکری ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ سوتو مو کا سترہ سالہ چھوٹا بھائی اسامو پرائمری پاس کر کے ایک بینک میں قاصد لگ گیا اور یوں جب کنبے میں اس کی چھوٹی بہن ایا کا اضافہ ہوا تو ان کو ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوئی بری بھلی گذر بسر ہوتی رہی تھی کہ ان میاں بیوی نے اٹھا کر اپنی تین سالہ بچی میتسو کو وان کے پاس بھیج دیا۔ یہ گذشتہ موسم بہار کی بات ہے۔ اب سچی بات یہ ہے کہ مرغی کو تو تکلے کا گھاؤ بھی بہت ہوتا ہے۔ ایسے مفلوک الحال کنبے میں ایک فرد کا اضافہ، چلو وہ ننھی بچی ہی سہی، ایک بڑا بوجھ بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان دونوں کو اس بچی کو اپنے پاس سے جدا کر کے دادا کے سر مارنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی۔ مگر اس کا ایک سبب تھا۔

دراصل یہ پچھلے موسم بہار کی بات ہے کہ جب موسوتو کو ایک پرولتاری گروہ کے ساتھ کام کرنے کی پاداش میں پولیس پکڑ کر لے گئی تھی اور وہاں اس کی پٹائی...... پٹائی کے دوران ایک تھپڑ کنپٹی پر ایسا پڑا کہ کان کا پردہ پھٹ گیا۔ اور اس میں ایسا انفیکشن ہوا تھا کہ تھانے سے اٹھا کر ایک رفاہی ہسپتال میں ڈال دیا گیا۔ لیکن ہسپتال میں تو اس وقت داخلہ ملا جب چوٹ کا زخم بگڑ چکا تھا۔ اتنا کہ انفیکشن دماغ تک پہنچ چکا تھا۔ اور آپریشن اس طور پر ہوا کہ ایک فوجی نظر بند کو اس کام پر آمادہ کیا گیا۔ اس طرح کہ اوپر سے اس کو ہدایتیں ملتی رہیں۔ یہاں سے کاٹو، یہ یہاں پر ٹھونسو...... یہ کرو وہ کرو۔ ایسے آپریشن کے بعد علاج معالجہ بھی اس لاپرواہی اور اناڑی پن سے کیا گیا کہ بعد میں جب ایک اسپیشلسٹ نے اس کا معائنہ کیا تو وہ اس ناڑی پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ بہرحال گرمی کے آتے آتے اس کا کان بری طرح بہنے لگا۔ پھر اس کے ایک دوست نے اس کو اس ہسپتال سے اٹھا کر ایک دوسرے ہسپتال میں لے جا کر ڈال دیا۔ وہاں وہ ایک ماہ سے زیادہ مدت موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ خدا خدا کر کے ناک، کان اور گلے کے ایک بڑے ڈاکٹر نے دوبارہ اس کا آپریشن کیا۔ آپریشن کامیاب تو رہا لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ سوتو موجو اس وقت کسی قزاق سردار کی پگڑی کے انداز پر خون میں تر بتر پٹی سر پر باندھے، بستر پر پڑا ہے،

زندہ بچ بھی سکے گا کہ نہیں۔ ان حالات سے بوکھلا کر اتامی نے ایک اور حرکت کی، وہ یہ کہ اپنے طور پر سوتو موکی خاطر کچھ کرنے کے نیک ارادے سے اس نے اپنی ایک دوست سے اس کا کمونو عاریتاً مانگ لیا۔ اور کمونو پکڑے ہی سیدھی سودی بنئے کی دکان پہنچ کر گروی رکھ آئی۔ پہلا کام یہ کیا کہ متسو کو کو ساتھ لے کر پہلی گاڑی سے اپنی سسرال جا پہنچی۔ اور متسو کو کو ان کے سپرد کر کے بدقت تمام روتی ہوئی بچی سے جان چھڑا کر واپس آ گئی۔ بچی کی پرورش کے لئے اس نے جو رقم بھیجنے کا وعدہ کیا تھا وہ وفا یوں نہ ہوا کہ مشکل سے دو تین ماہ تک کبھی دو اور کبھی تین ین بھیجتی رہی۔ موسم خزاں نے زور پکڑا تو اتامی نے بیٹی کے لئے اون سے ایک فرغل بن کر بھیج دیا۔ تاہم ان کے مالی حالات نے ان کو اجازت نہ دی کہ حسب وعدہ بچی کے خرچے کی رقم ماہ بماہ بھیج سکیں۔

مختصر یہ کہ تسوتو موجی تو بچا تھا لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ موسم بہار سے لے کر اب تک پارٹی کا شعبہ نشر و اشاعت ایسی مشکلات سے دوچار رہا کہ پیسے کی کمی کے باعث اب وہ اس جیسے کارکن کی، جو اپنے شعبہ میں انتہائی خلوص اور تن دہی سے کام کرتا رہا تھا، محنتوں کا خاطر خواہ معاوضہ ادا کر سکے۔ اب تو صرف چند گنے چنے لوگ ہی کام پر لگائے جا سکتے تھے۔ ان دنوں سوتو مو کا معمول یہ تھا کہ ہر صبح کو وہ اپنے مجروح کان کے زخم کے بچاؤ کے خیال سے کوٹ کا کالر کان تک اٹھا کر صدر دروازے سے نکل جاتا۔ اس کے ہاتھ میں مرکسزم پر لکھے ہوئے مضامین کے بے ڈھنگی سی کتاب ہوتی یہ مضامین اس نے بڑی تنگی اور بچت سے خریدے تھے۔ اس کے نکلتے ہی اتامی اگلے دروازے کو تالا لگا کر باورچی خانے والے دروازے سے باہر نکل کر سکینڈ ہینڈ کتابوں کی دکانوں پر پہنچ جاتی جہاں سوموتو دس ین کے سکے وصول کرتی اور سیدھی گھر واپس آ جاتی۔ ایسا کئی مرتبہ ہوتا۔ پہلے پہل تو اتامی کے ساس سسر صرف رقم اور خرچے کے بارے میں تقاضہ کرتے رہے بعد میں انہوں نے اب یہ الہنے بھی دینا شروع کر دیئے کہ متسو کو کی دیکھ بھال کی وجہ سے ماں کی تو کسی کام کی رہی نہیں اب تو اس کو رہڑی لگانے کا وقت بھی کم ہی ملتا ہے اور مٹھائی کی رہڑی کی بکری گھٹتے گھٹتے نہ ہونے کے برابر ہی رہ گئی ہے۔ یہ سارے لمبے لمبے قصیے وہ اسامو سے لکھوا کر بھیجا کرتے تھے، جنہیں پڑھ پڑھ کر سوتو اور اس کی بیوی اداس اور جان سے بیزار ہو جاتے کہ وہ اب ان کی مطلوبہ رقم بھیجنے کے قابل ہی نہ رہے تھے۔ سوتو موا پنے باپ کے تھڑ دلے پن پر رہ رہ کر کڑھتا کہ وہ دھندے میں گھاٹے کا ذمہ دار ذرا سی بچی متسو کو کو ٹھہراتا ہے۔ اس کو تو اسامو پر بھی غصہ آتا کہ جو کچھ وہ بولے جاتے ہیں، وہ لکھ مارتا ہے۔ غصے میں تو اس

وقت خود اس کے محسوسات کیا ہوا کرتے تھے۔ اور یہ نوعمر لڑکا بھی اپنے باپ کے لکھوائے لمبے چوڑے شکایت نامے لکھنے پر مجبور تھا۔ وہ خود تو اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہ لکھتا تھا............ جنگ چھڑ گئی تو ایک افتاد یہ بھی آن پڑی کہ شمال مشرقی قحط زدہ علاقے تو ہوکو کا ایک دوسرے سے الحاق ہو گیا۔ اور یوں پہلے جنگ کے ستائے ہوئے دہقانوں کی محرومیوں اور پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا............ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پچھلے سال محاذ جنگ پر بھیجے جانے والے نوجوانوں کی ماؤں نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ ماؤں نے متفقہ طور پر مطالبہ کر دیا کہ ''ہمارے بیٹوں کو واپس لایا جائے۔''

ظاہر ہے وہ تمام نوجوان جو اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر شام پڑے اس راستے سے اپنے گھروں کو جایا کرتے تھے، منظر سے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اب ان نوجوانوں کی تعداد بڑی تیزی سے گھٹ رہی تھی جو گھروں کی طرف واپسی پر اس کے رہڑے سے گرما گرم ایما گا وا مٹھائی خرید کر اپنے کمونو کے گریبانوں میں سنبھال کر رکھ لیا کرتے اور بے فکری اور آرام سے نکال نکال کر کھاتے چلے جاتے ......اب جن کے پاس ایسی چیزوں پر خرچنے کو پیسے ہوتے بھی تھے تو ایما گا وا کی رہڑی کے بجائے کسی عام اور معمولی سی رہڑی سے کچھ خرید کر کھا پی لیتے تھے۔

اپنے جوابی خطوں میں سوتو مو انتہائی زور و شور سے اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ان کی مالی اور معاشی پریشانیوں کا سبب دنیا بھر میں پیدا ہونے والی صورت حال ہے۔ پھر وہ خط کے کسی حاشیئے پر یہ بات تاکید سے لکھتا کہ یہ بات اسامو کو ضرور پڑھوا دی جائے۔ لیکن اس کے جواب میں تینوسو کی جانب سے آنے والا ہر خط شاہد تھا کہ اس کی یہ تمام سر مغزنی بے سود اور رائیگاں ہے۔ اس کی لکھی ہوئی ہر بات اس کے باپ کے سر سے اوپر ہی اوپر نکل جاتی۔ وہ بدستور اپنے خط میں اپنی بدحالی کا تمام تر الزام ننھی سی متسو کو پر دھرتا رہتا اور سوتو مو کا یہ تھا کہ بے بسی سے جھنجھلا کر اپنا بڑا سا بے ہنگم دہانہ تیزی سے چلانے لگتا۔ ایسا لگتا جیسے منہ ہی منہ میں لعنت لعنت کہہ رہا ہو۔ ساتھ ہی وہ ٹیڑھی ٹیڑھی تند نظروں سے اتامی کو گھورتا۔ اور اس کو بتانے لگتا

''بات یہ ہے کہ میں نے بھی تو کبھی فضول خرچیاں کی ہی نہیں۔ اب تم یہ دیکھو کہ اٹھارہ برس کی عمر تک ایک مرتبہ بھی حجام کے آگے اپنا سر لے کر بیٹھا اور نہ ہی کبھی جانگیہ خرید کر پہنا۔ بس مجھے تو ایک ہی شوق تھا۔ کتابیں خرید کر پڑھنے کا۔ ساری بچت اسی شوق کی خاطر کرتا تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اپنے شوق کی خاطر وہ دن رات محنت کرتا۔ دن بھر ڈاک خانے کی ڈیوٹی دیتا اور شام

کے وقت رسیاں بٹنے والے کارخانے میں جا کر کام کرتا۔ اماں ما کی بھی تو اسی کارخانے میں کام کرتی تھی۔ اماں نے اپنی مزدوری کے پیسوں سے ایک قینچی خریدی اور کچھ کپڑا خرید لیا کرتی تھی۔ کپڑے کو کاٹ کر جانگیہ اور اپنے ہاتھ سے ہی سی لیا کرتی تھی اور قینچی سے اس کے بال تراش دیا کرتی تھی .... اس کے علاوہ وہ اپنی روگی بیٹی آیا کی آئے دن کی بیماری کی دوا دارو اور علاج معالجہ بھی اپنی ہی مزدوری سے کرتی تھی۔

سوتو مو نے اپنے باپ کا خط جلا دیا تھا کہ ہر خط میں وہ اس کو تلقین کرتا تھا کہ تم تنظیم کو چھوڑ دو۔ اور دیکھو اگر تمہاری خانہ تلاشی کے نتیجے میں میرا کوئی خط پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

اتامی کو اپنے شوہر کی خفگی اور جذبات سے ہمدردی تھی۔ اس نے اپنی غلافی آنکھوں کو کھول کر اپنے شوہر کے سر کی طرف دیکھا تو دل کٹ کر رہ گیا۔ اس بیماری سے ایک دم ہی اس کے بال جھڑنے لگے تھے۔ بہت ہی چھدرے اور ہلکے ہو گئے تھے۔ دھیرے سے وہ کہنے لگی

''خیر اتنا تو یقین ہے کہ دادا متسو کو سے برا سلوک تو نہ کرتے ہوں گے۔''

اس کی آواز میں عجیب سی ندامت اور احساس جرم تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ حسب وعدہ ان کو بچی کی پرورش کے پیسے نہ بھیج سکی۔ دوسری بات یہ ہے کہ واقعی اپنی بچی کا بوجھ دوسروں پر ڈالنے کی بجائے خود ہی پالنا چاہئے تھا۔ اور یہ ہر گھڑی سوتو مو کو ادھر سے جو کچوکے لگائے جا رہے ہیں۔ ان سے تو بچا رہتا۔ وہ غریب تو خود ہی مقدر کا مارا ہوا ہے اس کے تو مسائل ہی مسائل ہیں۔

قمری حساب سے آنے والے نوروز کے بعد ہی سے ایا کے خط آنے لگے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی شکستہ تحریر میں لکھے ہوئے خطوط میں ہر بار وہ یہی لکھتی تھی کہ اماں تو اب ہر وقت مرنے کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ میں تو مر ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ وہ مر ہی جائیں گی۔ ان خطوط کو پڑھ کر سوتو مو کی نظروں میں اپنی ماں کا شفیق اور مسکین سراپا گھوم جاتا۔ اس کا شفیق اور دانا چہرہ اور تیزی سے سفید ہوتے بال۔ ماں اپنی ہٹی کٹی اور موٹی تازی پوتی کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے یوں لگی جیسے سوتو مو کی ضرورت اور پریشانیوں اور اس خود غرض باپ کے جبر کی چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پسی جا رہی ہو۔

صرف اپنی ماں ہی کے خیال سے تو وہ ہر جتن کرتا تھا کہ اتنا تو ہو جائے کہ وہ یا تو متسو کو کی پرورش کے لئے ان کو کچھ پیسے بھیج سکے یا پھر متسو کو ہی کو واپس بلا لے .... پر کہاں ....

وہ جو شاعری تھی نا۔جس کی بنا پر وہ پرولتاری تحریک سے وابستہ ہوا۔اس سے تو کسی قسم کی کمائی کا تصور ہی فضول تھا۔

اور اب کی بار جو تیل کے دھبوں میں تر بتر خط پہنچا تو اسی وقت سوتو مو ابھی ابھی کام پر سے واپس آیا تھا۔خط دیکھتے ہی اس کو چپ لگ گئی۔منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر گنگ سا بیٹھا رہا۔ اتامی باورچی خانے میں گھسی کچھ لٹر پڑ کر رہی تھی۔باورچی خانہ اندھا پڑا تھا۔کوئی بلب تک تو تھا نہیں وہاں۔اتامی نے اپنے پیروں کو گرم رکھنے کے لئے سوتو مو کے پھٹے پرانے موزوں کے چیتھڑے لپیٹ رکھے تھے۔بدقت تمام پانی گرم کر کے گرم پانی کی بوتل میں ڈالا......اب تو یہی نوبت تھی کہ جو پیسے کوئلے کے لئے بچا کر رکھے تھے وہ سوتو مو کی آمدورفت کے کرایوں کی نذر ہو گئے۔

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا پھر باپ کا خط دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پھاڑنے لگا۔اس کے ہاتھ کی درمیانی انگلی پر سرخ رنگ کی روشنائی کا دھبا چمک رہا تھا۔حسب عادت اسی گھٹی گھٹی آواز میں بولا

''ٹھیک ہے اب میں ان کو لکھے دیتا ہوں کہ گھر میں ڈالیں تالا اور ٹوکیو آ کر ہمارے ساتھ رہیں۔''

اتامی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ سوتو مو کی بات پر وہ کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرے۔لمحہ بھر تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے سوتو مو کی طرف اس نے یوں دیکھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔پھر پلکیں جھپکائیں اور اپنی غلافی آنکھیں پھاڑ کر ناگواری سے تیوری چڑھائی اس کو تو یہ بھی احساس نہ تھا کہ یہ جان بوجھ کر کر رہی ہے یا خود بخود ہی تیوریاں اور بھنویں چڑھ گئی ہیں۔سردی کی شدت سے اس کی ناک کی پھننگ سرخ ہو رہی تھی اور اب وہ عین مین ایک ننھا سا دہشت زدہ خرگوش لگ رہی تھی۔

''لو، یہ اور ہوئی، بیٹھے بیٹھے حکم لگا دیا کہ گھر کو لگاؤ تالا اور ایک نہ دو پورے پانچ جی یہاں آ جاؤ، مستقل رہنے کو۔ارے آسان ہے پانچ دموں کا پیٹ بھرنا۔کھائیں گے کیا یہاں آن کر۔''

ایک عجیب طرح کا بوجھ وہ اپنے آپ پر محسوس کر رہی تھی۔ہاں سوتو مو ہی کا ڈالا ہوا ہی تو تھا یہ بوجھ۔نکلا نہ اپنے باپ کی طرح یہ بھی خود غرض............مطلبی۔میرے سر ہی پر تو لا کر بٹھائے گا ان سب کو............

ادھر سوتو موکی بھی اپنی مجبوری تھی۔ اپنی دن بھر کی مصروفیات کے دوران ہر وقت یہی سوچتا رہتا تھا کہ اس مسئلے کو حل کرے تو کیونکر۔ جہاں تک پیسوں کا انتظام کر کے ان کو بھیجنے کا سوال تھا، وہ تو قطعی ناممکن تھا۔ نہ ہی وہ متسو کو وا کیلے بلوا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ تنیو سو کے، کے حالات تو اب سدھرنے سے رہے۔ البتہ ابتری کا امکان بے شک تھا۔ بس اب تو ایک امید ہی پر انحصار کرتے ہوئے ان کو یہاں آجانے کا مشورہ دیا جا سکتا تھا کہ اگر ٹوکیو آنے کے بعد ایسا موکسی کام سے لگ جائے تو تنیو سو کے ابلی ہوئی سویا بین کی چاٹ کی ریڑھی لگانے لگے اور اگر اماں ما کی کو بھی کسی جزوقتی کام پر لگی تو............ارے وہ تو ایسی ہنرمند اور کارگذار ہے کہ وہ تو گھر بیٹھے بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ کم از کم روکھی سوکھی تو پیٹ میں پڑتی رہے گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس طرح وہ ٹوکیو آ کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ بیٹا بہو کس طرح گذر بسر کر رہے ہیں۔ سوتو موکو تو کامل یقین تھا کہ اس گھر کے حالات دیکھنے کے بعد تنیو سو کے کی تنگ نظری میں کمی آجائے گی۔ دماغ درست ہو جائے گا، آنکھیں کھل جائیں گی۔ اور پتہ چل جائے گا متسو کو کی پرورش کو بہانہ بنا کر انہوں نے جو اپنا سارا بوجھ اپنے بڑے بیٹے پر ڈال رکھا تھا، یہی نہیں وہ اسی آڑ میں اب ایسا موکو بھی اسی ڈھرے پر ڈالنا چاہ رہے تھے۔ اب کم سے کم ایک ہی گھر میں رہ کر وہ سب کے سب یہ اندازہ تو کر سکیں گے کہ سوتو مو کس انداز سے جی رہا ہے۔ اور اس کی مشکلات کیا ہیں۔ اپنے شوہر کی اتنی دلیلوں اور تاویلوں کو سن کر اتامی اس کی ہم خیال ہو چکی تھی۔ اس نے بھی سوچا

''واقعہ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال اچھا ہی ہو۔''

چنانچہ اس نے صدق دل سے اپنے شوہر کے منصوبے کی تائید بھی کر دی اور منظوری بھی دے دی۔ اپنے اسی مخصوص انداز میں زبان کی نوک نکال کر اپنے خشک ہونٹوں پر پھیرنے اور ان کو تر کرنے لگی۔

''اچھا بس اب تم جا کر سو جاؤ میں ان کو ابھی خط لکھتا ہوں۔''

سوموتو نے تنیو سو کے نام تفصیلی خط لکھنے کے بعد کاغذ کی ایک اور باریک سی چٹ پر علیحدہ کچھ لکھا۔ دونوں خطوں کو لفافے میں بند کر کے پتے لکھے پھر ایک لفافہ نکال کر کمرے سے باہر لے جا کر کہیں چھپا دیا۔

جتنی دیر سوتو مو خط لکھتا رہا۔ اتامی، تسوجی (سفید کاغذی دروازے) کی طرف منہ کئے لیٹی رہی۔ بھلا نیند کہاں آتی۔ بس چپ چاپ منہ موڑے لیٹی رہی۔ اس کا ہمیشہ سے ہی دستور تھا

کہ جب سوتو مو اس کو حکم دیتا کہ جاؤ جا کر سو جاؤ۔ تو وہ بلا چون وچرا کئے چپ چاپ اٹھ کر اس کمرے میں جا لیٹتی جہاں تہری چٹائیوں کا فرش لگا تھا۔ یہ خواب گاہ ہی باورچی خانہ سے ملحق تھی۔ کان کی تکلیف کی وجہ سے سوتو مو کی یہ عادت پڑ گئی تھی کہ لکھتے لکھتے رک کر اپنا بایاں ہاتھ فرغل کی آستین سے کھینچ لیتا اور کنپٹی پر رکھ کر کان کے اندرونی زخم کو انگلیوں سے دبانے لگتا تا کہ زخم سے اٹھی ہوئی درد کی ٹیسوں میں کچھ تو افاقہ ہو سکے گا۔ بات یہ ہے کہ اس کے مجروح کان کا پچھلا حصہ خلا کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ پچھلی طرف کی ہڈی کاٹ کر نکال دی گئی تھی اور اس سے پیدا ہونے والے گڑھے میں جالی دار پٹی کو دبا دبا کر ٹھونس دیا گیا تھا۔ اور اب یہ جگہ شدید سردی اور محنت مشقت سے درد کرنے لگتی۔ زخم میں ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ تقریباً اسی جگہ کان کی پشت پر آپریشن کے نشان کے قریب ہی ایک اور داغ چمکتا تھا۔ اور اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ وہ یہ کہ تسوتو مو 1930ء سے ادبی محاذ کی جس تنظیم کار گردگی سے مطمئن نہ رہ سکا۔ نتیجہ میں اس تنظیم ایشو فیوجی کو مو کے نام سے مشہور تھی۔ اسی محاذ کے ایک شخص نے جو اپنی شکاریوں جیسی وضع قطع اور ہیٹ کی وجہ سے مشہور تھا، سوتو مو کے کان کے پچھلے حصے کو گرم گرم لوہے سے داغ دیا۔ اور یہ داغ اب آپریشن کے نشان کے ساتھ ساتھ ہی چمکا کرتا تھا۔

............................(2)............................

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب دادا، دادی، ایا واسا مو اور متسو کو اپنے ٹھکانے کو خیر باد کہہ کر یوٹی نو اسٹیشن کے راستے سے ہوتے ہوئے کوئی وائی کے ٹین کی چھت اور دو کمروں پر مشتمل مختصر سے گھر میں اس شان سے گھسے کہ ان میں ہر ایک نے کوئی نہ کوئی گٹھڑی مٹھری اٹھا رکھی تھی۔ وہ پورا کا پورا گھر سمیٹ کر رنگ برنگی بوغ بندوں میں لپٹے ہوئے بنڈلوں کی شکل میں اٹھا لائے تھے۔ گھر میں گھستے ہی پورا کنبہ گھر بھر پر چھا گیا۔ گٹھر کھلے۔ ان میں تھا ہی کیا، میلے کچیلے گودڑ کے سوا۔ وہی گدڑیاں اور گٹھریاں ہر طرف پھیلا دی گئیں۔ حد یہ کہ کمرے کے کونے والی نیچی سی چبوتری تک پر گدڑیاں گٹھریاں بچھ گئیں۔

''وہ کیا آئے کہ میاں بیوی کی زندگی کا ڈھرا ہی بدل گیا۔''

ہوتا یوں تھا کہ دادا کی آنکھ تو صبح پانچ بجے ہی کھل جاتی اور وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ سردیوں

میں صبح پانچ بجے اندھیرا ہی ہوتا مختصر سے تنگ کمرے میں بچھی چٹائیوں پر سارا کنبہ پاس پاس ایک دوسرے میں گھسا ہوا سورہا ہوتا تھا۔ اب دادا صاحب اٹھتے ہی پہلی حرکت یہ فرماتے کہ پٹ سے بتی جلا کر اپنی چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور اپنی گڑگڑی اٹھا کر گڑ گڑ کرنا شروع کر دیتے۔ دادی راکھ دانی پاس ہی رکھ دیا کرتی تھی۔ حقہ کی گڑ گڑ پورے کمرے میں پھیل جاتی۔

سوتو موکی نیند خراب ہوجاتی کچھ دیر تو وہ کروٹیں بدلتا، اپنے چہرے پر چادر کھینچ کر دوبارہ سونے کی کوشش کرتا مگر توبہ کیجئے۔ ایسے میں متسو کو کے نخرے شروع ہوجاتے وہ رونا ٹھنکنا شروع کر دیتی تو اتامی اس کو چپکے چپکے تھپکنے لگتی ''سو جاؤ............سو جاؤ۔ ابا کی نیند نہ خراب کرو۔'' سر گوشیوں میں اس کو سمجھانے کی کوشش میں اس کی اپنی نیند غائب ہو چکی ہوتی۔ ماں کی للو پتو پر متسو کو اور زیادہ بکھر جاتی۔ مچلنے لگتی اور اپنی بیٹھا اکڑ کر پھٹے بانس گلے سے چنگھاڑنا شروع کر دیتی۔

''دادی! دادی پاس جانا''

دراصل اس کو اس چھ ماہ میں دادی سے لپٹ کر سونے کی عادت پڑ چکی تھی۔

''نائیں! دادی پاس............نائیں۔''

اور دادی صاحبہ اپنا ایپرن باندھتی ہوئی فوراً اٹھ کھڑی ہوتیں۔

''اچھا......اچھا......دیکھو متسو کو رونہیں میں ابھی اپنی بچی کو چیجی کھلاؤں گی۔''

دادی سپڑ سپڑ کرتی ایک رکابی میں چاول ڈال کر لے آتی اور اتامی کی چٹائی پر بیٹھ کر متسو کو کو کھلانے لگتی۔ اس تمام چپقلش میں سوتو موکی نیند اڑ جاتی وہ اپنی پتلی سی رضائی پھینک کر کھڑا ہو جاتا۔ تمام رات کی بے چین نیند اور بے خوابی سے اس کا چہرہ خشک اور بجھا بجھا سا نظر آتا۔ وہ منہ دھونے نکلنے پر جاتا تو دادا تنیوسو کے موقع پاتے ہی لپک کر جھاڑو پکڑ لیتا۔ باہر نکل کر صدر دروازے کے سامنے سر سر جھاڑو لگانا شروع کر دیتا۔ یہ کام ختم کر کے واپس اپنی جگہ آ بیٹھتا۔ اسی اثنا میں کمرے کی صفائی ستھرائی پہلے ہی ہو چکی ہوتی تھی............ پھر ایا کھانے والی نیچی سی چوکی نما میز کمرے کے وسط میں لا کر رکھتی۔ اسا مو دادا کے اخبار سے نکل کر گر جانے والا رنگین اشتہار دروازے کی دہلیز کے پاس سے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا۔ اتامی باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے بیٹھ جاتی۔ خاک تیار کرتی گھر میں پکانے کے لئے ڈھنگ کی ہانڈی تک تو تھی نہیں۔

''اے اماں ذرا نمک تو چکھ دیتیں۔'' وہ اپنے اردگرد بطخ کی طرح چلتی ساس کے ہاتھ میں

میسو کے حریرے کی رکابی تھما دیتی۔ اور اپنے مخصوص سوالیہ انداز میں گویا پوچھتی کہو کیا ہے،
تیوریاں تو ان دنوں اس کی ہر وقت ہی چڑھی رہتی تھی۔''

دادی میسو سوپی یعنی پسی ہوئی سویابین کے آٹے سے تیار کردہ نمکین حریرہ شڑاپ شڑاپ
کی آوازوں کے ساتھ پیتی اور پھر دبی زبان سے کہتی ہے

''ٹھیک ہی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اتامی اور دادی پیالوں میں حریرہ ڈال ڈال کر اور اس میں ڈھیروں نمک
ملا ملا کر چھوٹی سے میز کے گرد بیٹھے کنبے کے آگے رکھنا شروع کر دیتیں۔ ناشتہ بڑی عجلت اور
خاموشی سے ختم کیا جاتا۔ سوتو مو کے پاس اگرچہ گھر سے نکلنے سے پہلے اچھا خاصا وقت ہوتا تھا،
تاہم وہ گھر والوں سے کسی قسم کی بات چیت کرتا ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ کوارٹر کے آگے والے برآمدے
میں اوندھا لیٹا کوئی کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار اس انداز میں گویا یہ بات اسے ابھی
یاد آئی ہو۔ اپنے باپ سے سوال کر بیٹھا۔

''ارے اوہ! آپ نے ایما گاوا مٹھائی بنانے والے سانچے کیا کئے؟''

''وہ تو میں نے بیچ دیئے۔''

بس تینوسو کے اتنا ہی کہتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کے درمیان سلسلہ کلام منقطع
ہو جاتا۔ تو سومو اٹھ کر اپنا پھٹا پرانا نیوی بلو کوٹ پہنتا، گھر سے نکل جاتا اور تینیسو کے کو اتنی بھی توفیق
نہ ہوتی کہ دروازے تک جا کر بیٹے کو خدا حافظ کہہ دے۔ وہ اپنی جگہ پر بت بنا بیٹھا رہتا۔ کندھے
اچکائے اور کمونو پر پہننے والی حاوری اونی صدری جو ہاتھ سے بنی ہوئی تھی، کو اچھی طرح سے لپیٹے
ہوئے۔

شام پڑے جب سوتو مو کام پر سے گھر لوٹتا تو عموماً دادا اپنی اسی جگہ پر اخبار ہاتھ میں لئے
ایش پڑے پاس دھرے تھوا بنا بیٹھا ہوتا۔ فرق صرف یہی ہوتا کہ اس وقت بتی جل رہی ہوتی
تھی۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کی واپسی سے پہلے اتامی دادی کے لائے ہوئے آٹے سے
تیار کئے ہوئے کلچے تیار کر کے سب کو کھلا چکی ہوتی تھی۔ یہ آٹا بھی دادی کہیں نہ کہیں سے لے آتی
تھی۔ تہری چٹائیوں والی اس نام نہاد خواب گاہ میں پہنچ کر تو سومو اتامی سے پوچھتا

''ارے دادا صبح سے شام تک کرتے کیا رہتے ہیں؟''

''بس بیٹھے رہتے ہیں۔''

پھر وہ ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے کہتی۔

''مجھے تو لگتا ہے دادا کا دماغ چل گیا ہے۔''

لیکن سوتو مو کوئی جواب نہ دیتا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ یوں چپ چاپ بیٹھے بیٹھے اندازہ لگا رہے ہوں سوتو مو کے حالات کا۔ اس کے انداز زیست کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا چاہتے ہوں کہ آیا انہیں کچھ کرنا چاہئے یا نہیں۔

ادھر اسامو کا یہ دستور بن گیا تھا کہ ہر روز پانچ بجے کے قریب ڈھلواں راستے کے نشیب میں بنی ریڈیو کی ایک دکان پر پہنچ جاتا اور وہاں پر بیٹھ کر ریڈیو پر ہونے والے خالی اسامیوں کے اعلان بغور سنا کرتا اور دکان کی نمائیشی کھڑکی کے شیشے پر ٹکٹکی جما کر گھورتا رہتا۔ نمائشی کھڑکی کے شیشے کا نیلگوں عکس اس کے نوخیز سرخ رخساروں پر پڑتا رہتا۔

ایک ماہ کی تگ ودو کے بعد آخر اس کو کیوہاشی کے قریب ایک کمپنی میں چپراسی کی ملازمت مل ہی گئی۔ سوتو مو نے اس کی آمد ورفت کا یہ انتظام کر دیا کہ وہ پانچ ین اور بیس سین میں ایک پرانی سائیکل دو ماہ کی قسطوں پر دے دی۔ اسامو نے دو ماہ کی یہ کٹوتی بخوشی منظور کر لی۔ اب وہ بڑی بے فکری سے سائیکل چلاتا ہوا گھر میں گھستا۔ اس نے سب کو بتایا تھا۔

''ارے یہ تو بہت بڑی کمپنی ہے وہاں تو میرے جیسے پانچ اور چپراسی لگے ہوئے ہیں۔''

یہ بات اس نے ایسے منہ پھاڑ کر کہی گویا یہ کہنا چاہتا ہو کہ وہ بینک بھی کوئی بینک تھا۔ بہت چھوٹا اور معمولی۔

پھر وہ کہنے لگا۔ وہ اس وقت بے خیالی میں اپنی علاقائی زبان میں باتیں کر رہا تھا۔

''پر ایک بات ہے، میرے ساتھی کہتے ہیں کہ اتنی کم عمر میں تم بوڑھے لوگوں کی طرح خسیس اور کنجوس ہو۔''

''بات یہ ہے کہ اس کمپنی کے ملازموں کا قاعدہ تھا کہ باری باری اپنے ساتھیوں کو کھلایا پلایا کرتے تھے۔ اب انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اسامو کھاتو سب کا لیتا ہے مگر اپنی باری گول کر جاتا ہے۔'' یہ بات دادی کو جو پاس ہی بیٹھی متسو کو کے کاٹ کی پیٹی میں الٹے سیدھے ٹانکے مار کر اس کی مرمت کر رہی تھی، بری لگی اور وہ زور زور سے بولنے لگی۔

''وہ کھلائے گا کہاں سے۔ اس غریب کے پاس کیا دھرا ہے۔ بات یہ ہے کہ تم نہ کسی کا کھاؤ نہ کسی کو کھلاؤ۔''

تسوتو آج خلاف معمول کام پر سے جلدی واپس آ گیا تھا اور بیٹھا میز پر کام کر رہا تھا۔ اس کی بات سن کر کچھ نہ بولا۔ پھر اس نے اپنا پھیلایا ہوا دہانہ ادھر ادھر ہلا کر بڑی نرمی سے اس کو حوصلہ دیا۔ ''دیکھو تم ایسی باتوں کی پرواہ نہ کیا کرو بلکہ تم تو فخریہ ان سے صاف صاف کہہ دو کہ میں اپنے کنبے کا خرچہ اٹھا رہا ہوں۔ میرے پاس ان کلچھروں کے لئے فالتو پیسے نہیں ہیں۔''

اساموگٹھے ہوئے مضبوط بدن والا لڑکا تھا۔ اس کی رنگت اپنے بھائی کی طرح صاف تھی لیکن دہانہ اس کی طرح پھیلا ہوا نہ تھا۔ اس کا دہانہ چھوٹا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی بات کا نہ تو برا ہی مانا نہ ہی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ بلکہ کوئی ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے چپ چاپ بیٹھا بچوں کی سائنس پر ایک بہت پرانے ایڈیشن کی کتاب کے ورق الٹتا رہا۔

اتامی کا جی چاہ رہا تھا کہ اس موضوع پر دادا بھی زبان کھولیں اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس گفتگو میں حصہ لیں۔ پر وہ تو اسی طرح چپ چاپ بیٹھے حقہ پیتے رہے۔

خیر پھر ایک حادثے نے دادا کو بھی گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا کہ وہ نہ صرف اپنی جگہ سے ہلے بلکہ ٹوکیو کے جن گلی کوچوں سے آشنائی بھی نہ تھی، انہیں ان کی خاک بھی چھاننا پڑی۔ ہوا یوں کہ آیا شروع سے کمزور اور سدا کی روگی تھی۔ بالکل ہی بستر پر پڑ گئی۔ اسے آنتوں کی دق کا انفیکشن ہو گیا تھا۔ اس کو ہسپتال میں داخل کرنا ضروری تھا۔

تسوتو موان دنوں ہر رات کو گھر واپس نہیں آ سکتا تھا۔ ایک تو کام کی زیادتی دوسرے کچھ پکڑ دھکڑ کا خطرہ بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اب یہ کام دادا ہی کے ذمہ تھا۔ اتامی دادا کی کھڑاویں اٹھا کر لائی اور ان کو ٹھیک ٹھاک کر کے دادا کو ان کے ایک چچا کے پاس بھیج دیا جو میکا واشیما میں رہتے تھے۔ چچا بھتیجے کی عمروں میں کچھ ایسا فرق بھی نہ تھا۔ تینوسو کے کے چچا کان کنی میں تقریباً دس سال سے اپنے شہر کے ایک حلقہ انتخاب کے سرکاری دفتر میں ملازمت کر رہے تھے۔ اور کوائی خاندان کا یہ واحد رشتہ دار تھا جو ٹوکیو میں رہتا تھا۔ جس سے وہ بچی کے علاج معالجے کے لیے قرض لے سکتا تھے۔ رقم کی ادائیگی اسامو کی تنخواہ کے ستر سین ماہانہ سے کرنے کے وعدہ پر۔ علاوہ ازیں یہ توقع بھی تھی کہ سرکاری ملازمت میں ہونے کے سبب سے ضلعی کمیٹی سے باپ کے علاج معالجے سہولت بھی دلوا سکیں گے۔

چند دن کا بعد نیکچی کی تیسری بیوی قرضے کے معاہدے کے کاغذات پر تینوسے کے دستخط اور مہر لگوانے ان کے گھر پہنچی۔ شوجی کے پھٹے پرانے بوسیدہ کاغذی پردے کے درمیان سے

گذر کر اندر آتے ہی پہلا لفظ جو اس کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا۔

''توبہ ہے! ان اجڈ دیہاتیوں کی مدد بھی کیسے کی جائے۔ ارے ان کو تو گھر رکھنے کا بھی ڈھنگ نہیں۔ دیکھو تو کیا گندڈالا ہوا ہے۔''

اس کی بڑبڑ سن کر اتامی نے کندھے اچکا کر تیوری چڑھالی۔

اوئی شی ہر چیز سے مبالغہ کی حد تک گھن کھا رہی تھی۔ اپنے کمونوں کے گھیر تلے نظر آتی ہوئی رنگین جوتیوں میں وہ پنجوں کے بل صحن میں داخل ہوئی۔ کمونو کے دامن کو سمیٹے ہر چیز سے بچتی بچاتی کہ ایسا نہ ہوا یا کو دیکھا اور مڑ کر دادی سے بڑے طنز سے مخاطب ہوئی۔ ادھر دادی غریب بری طرح مرعوب جذبہ احسان مندی سے گھگیائی جا رہی تھی۔ بوکھلا کر اس نے جلدی سے آستینوں پر لپٹی وہ پٹی کھول ڈالی جس سے کام کاج کرتے وقت کمونو کی آستینوں کو باندھا جاتا ہے ......اور بڑی بڑی ممنوعیت سے اپنا کھچڑی بالوں والا سر اس کے آگے جھکا دیا۔

اوئی شی نے فوراً ہی چٹکی بھری

''ارے بھئی ہماری تمہاری رشتے داری تو اسی حد تک ہے کہ جب کوئی کام، کوئی برا وقت پڑے تو اس حوالے کو کام میں لاؤ......ورنہ تو آگے پیچھے برسوں تم میں کسی کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ چلو ادھر لگاؤ مہر۔''

اتامی نے ایک بار پھر اپنی بھنوئیں اور سوکھے چمرخ کندھے اچکائے اور اوئی شی کے ہاتھوں سے پیسے لے لئے ...... پیسے پکڑتے ہی اس نے متسو کو اپنی پیٹھ پر اٹھایا اور بازار کو چل دی۔ جہاں سے دس سین کے آلو کی شراب اور پانچ سین کے تلے ہوئے پکوڑے لانا چاہ رہی تھی۔ اس کی خاطر مدارات کرنے کیلئے کہ گذشتہ کئی سال تو تسوتو مو نے اپنے چچا............اور اس کی بیگم سے جو ایک زمانے میں شراب کی دکان میں ملازمت کرتی تھی، اور علاقے میں خاصی بدنام رہی تھی، کوئی تعلق رکھا ہی نہ تھا...... جیسے ہی اتامی نے متسو کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر............اور شراب کی خالی بوتل کہ جس میں ایک پیالی شراب ہی آسکتی تھی، ہاتھ میں پکڑ کر باہر قدم نکالا کہ چچی صاحبہ بول پڑیں

''ہے ہے تم یہ بوتل لے کر بازار چلی ہو جس میں ایک پیالی زیادہ شراب نہ آئے......دیکھ لینا وہ اس میں ایک کے بجائے آدھی پیالی ہی ڈالے گا۔ ارے بھئی کم از کم ایسی بوتل تو لے جاؤ جس میں چار پیالی شراب تو آسکے۔''

اوئی شی کی ساری زندگی ایسے ہی فلسفہ حیات سے عبارت تھی۔ بہر حال اتامی نے اس کی خاطر کے طور پر پکوڑے اور آلو کی شراب لا کر میز پر رکھی تو پھٹی پھٹی گول گول آنکھوں والی متسو کو نے مچلنا شروع کر دیا۔ اپنا ننھا سا ہاتھ پھیلا کر رٹ لگا دی۔

''تامی یہ کھانا............ میں نے بھی کھانا............ یہ یہ۔'' اس کی بڑھی ہوئی انگلی تقریباً پکوڑوں کو چھو رہی تھی۔

اوئی شی نے بچوں کی طرح اپنا نچلا ہونٹ پچکا کر اس کی نقلیں اتارنا شروع کر دیں اور بڑی نفرت سی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اچھا تم نے یہ کھانا۔۔۔یہ۔۔۔یہ۔۔یہ مامی نے کھانا ہے'' یہ کہتے کہتے پکوڑے اٹھا اٹھا کر کھانا شروع کر دیئے ساتھ ہی شراب کی چسکیاں بھی لگاتی رہی۔ بیچ بیچ میں گپیں بھی لگاتی رہی۔ بات یہ ہے کہ تم لوگ بے دین ہو نا اس لئے تم پر غربت اور بیماریاں عذاب بن کر نازل ہوتی ہیں۔ اور تمہارے بیٹے سرخے بن جاتے ہیں۔''

بک بک کرتے کرتے سارے پکوڑے اور پورے دس سین کی شراب اکیلی ہی ڈھکوس گئی تو پھر خود اپنے کمونو کی اوبی کی پیٹی میں سے اپنا بٹوا نکال کر دس سین کی شراب اور منگالی۔ وہ ختم ہوئی پھر منگالی۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب یہ یاد آیا کہ اس کے شوہر کے دفتر سے واپسی کا وقت ہو رہا ہے۔ خدا خدا کر کے اوئی شی ٹلی تو تینوسوکے نے تسوتومو کی ڈیسک میں سے قرضے کے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیئے اور پھر بولا

''اس کا مطلب ہے کہ افلاس نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ساتھ ساتھ ہی لگا چلا آیا ہے۔''

یہ بات اس نے ایسے جذباتی انداز میں اور گہرے ملال سے کہی کہ اتامی کو حیرت ہوئی۔ ٹوکیو آنے کے بعد سے اب تک تینوسوکے نے کوئی اچھی بری آواز نکالی ہی نہ تھی۔ وہ چپ رہتا تھا۔

تینوسوکے کہتا رہا

''ہاں بیٹی جن کے پاس پیسہ ہوتا ہے وہ اسی طرح بڑھ بڑھ کر بولتے ہیں۔ باتیں بناتے ہیں۔''

''دیکھا......دیکھا تم نے یہی بات تو بڑے بھائی کہا کرتے تھے۔'' اب اتامی کا یہ حال کہ کچھ تو وہ اوئی شی جیسی عورت کی باتوں پر جھلائی ہوئی تھی اور کچھ یہ حیرت کہ دلوانے جو اتنے دن

سے چپ سادھ رکھی تھی، اب یہ ایک دم ہی ان کو زبان کیسے لگ گئی۔ بول بھی رہ ہیں اور تیور بھی بدل رہے ہیں۔ مارے حیرت اور اچنبھے کے اس کا منہ خشک ہو گیا۔ گلے میں کانٹے سے پڑنے لگے۔ بدقت تمام تھوک نگلتے ہوئے زبان کو ہونٹوں پر پھیر کرانے بھی بولنا شروع کر دیا۔''بات یہ ہے کہ اگر معاشرے کا نظام بدل جائے تو ایا کے علاج معالجے کی کوئی پریشان ہی نہ ہو رہے۔''
پھر وہ بڑی تفصیل سے سمجھانے لگی کہ کسی طرح سوویت روس میں طبی کلینک مفت کام کر رہے ہیں اور مریض کو کسی وقت بھی وہاں داخل کیا جا سکتا ہے اور یہ کلینک دن رات کام کرتے ہیں۔ مریضوں کو مفت طبی امداد اور ہر سہولت دی جاتی ہے۔ اس سے قبل بھی جب گھر والے وہاں دوسرے قصبے میں تھے تسو تو موان کو باقدگی سے سوویت فرینڈز نامی باتصویر رسالے بھیجتا رہتا تھا۔ لیکن اتامی کو کوئی اندازہ نہ تھا کہ دادا ان کو دیکھ اور پڑھ کر کیا تاثر قبول کر رہے ہیں۔ لیکن آج وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کی ہر بات کان کھول کر سن رہا ہے۔ اور پھر اسی رات اس نے دادا کو دادی سے یہ بھی کہتے سنا کہ بڑی غلطی کی ہے میں نے وہ مٹھائی کے سانچے بیچ کر۔

..................(3)........................

خاموش شاہراہ جو مکمل طور پر سنسان اور خوابیدہ تھی۔ اس کے بائیں جانب ایک پٹرول پمپ تھا۔ جس کے ساتھ گھوم کر یہ سڑک دوسری سمت کو نکل جاتی۔ اسی سمت سے نکل کر اتامی ایک نو آباد بستی میں داخل ہوئی جہاں اکا دکا مکان یہاں وہاں بنے ہوئے تھے۔ اچانک ہی چاند بلند ہو گیا اور اس کی روشنی کی ٹھنڈک میں اضافہ ہو گیا۔ اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی یہاں سے وہاں تک پھیل گئی۔ آس پاس کھڑے کیا کی درختوں پر چھائی ہوئی دبیز دھند چاند کی منور کرنوں کی روشنی میں پگھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، آسمان پر دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی مانند سفید بادل تیر پھر رہے تھے۔ چاندنی رات میں یوں تنہا چلتے ہوئے اتامی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے روشن اور شفاف چاند کی نور بیز کرنوں نے دھرتی پر اتر کر اس کے گرد ہالہ ڈال دیا ہے۔ رات کے اس سناٹے میں فقط اس کے قدموں کی چاپ ہی سنائی دے رہی تھی۔ یا پھر اس کے لہنگے کے کناروں کی سرسراہٹ کی آواز تھی۔ اتامی کو لگ رہا تھا کہ اس کے جوتوں اور لہنگے کی سرسراہٹ کی ملی جلی آوازیں چاند کے ٹھنڈے پر سکون اور نورانی ہالے کی خاموش خلوتوں میں مخل ہو رہی ہوں۔

اندھیری رات کے اس پہر اس ویران شاہراہ پر چلنا کسی طور خطرے سے خالی نہ تھا۔ اور یہ بھی اتامی ہی کا حوصلہ تھا کہ رات کے اس سناٹے اور اندھیرے میں شن جوکوتک کا لمبا سفر تنہا طے کر رہی تھی۔ محض قرضے کی یکمشت ادائیگی کے خیال سے تاکہ وہاں جا کر ساقی گری کی ملازمت زیر تربیت خادمہ کے طور پر مکمل حاصل کر سکے۔

بات یہ تھی کہ ضلعی کمیٹی کی کوشش اور سفارش سے ایا ایک خیراتی ہسپتال میں داخل تو ہو گئی تھی لیکن بیمار بچی کی دیکھ بھال کی خاطر کسی نہ کسی کو تو ساتھ رہنا تھا۔ رہنے والے کے آنے جانے کے کرایہ کا سوال بھی تھا اور یہ اگر دادا تمام دن کے لئے ہسپتال جا کر رہیں گے تو آخر اس کے کچھ کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ بس ایک خالی سوپ پر تو تمام دن کے لئے ٹرخایا نہیں جا سکتا۔ پھر ایک بات یہ تھی کہ جب سے اوئی شی نے ان کے گھر آنا جانا شروع کیا تھا، وہ ان کو سلائی کے کپڑے لا کر دینے لگی تھی کہ یوں ہی کچھ کمائی ہو سکے۔ کہنے کو تو کمائی کا سلسلہ تھا۔ لیکن حال یہ تھا کہ دونوں ساس بہو اس کو گھر میں آتے دیکھ کر ہی لرز جاتی تھی۔ وہ سلائی کا سلسلہ یہ تھا کہ ایک سوتی کمونوں کی سلائی کے پچیس سین طے ہوئے تھے۔ لیکن دھاگا انہیں پاس سے لگانا پڑتا تھا۔ پھر وہ بے زبان عورتیں تھیں، لڑنا جھگڑنا انہیں آتا نہ تھا۔ بس اوئی شی کو پچیس سین لے کر گھر میں گھستے دیکھ کر ڈر جاتی تھی۔ اور یہ پچیس سین لے کر وہ بڑی مستعدی اور پابندی سے پہنچ جاتی اور آتے ہی شروع ہو جاتی

''بھئی دیکھو یہ پچیس سین میں نے یہاں میز پر رکھ دیئے ہیں۔ ہاں بھئی تمہارا کیا ہے تم تو اپنی جگہ پر بیٹھی سلائی کرتی رہتی ہو۔ اور ہر کارے کا کام میرے سپرد ہے کہ سلائی کے کپڑے بھی دینے آؤں اور لینے بھی۔ تمہاری سلائی بھی میں ہی لاؤں۔

ہاں بھئی تم بڑے لوگ جو ٹھہرے کیا کہنے ہیں تمہارے''

جتنی دیر میں دادی کمونو کو آخری ٹانکا لگا کر سوئی کا دھاگا دانت سے کاٹ کر الگ کرتی اور پھر برآمدے میں جا کر کمونو کو جھٹکتی کہ کوئی دھاگہ وغیرہ نہ لگا رہ جائے، اتنی دیر میں اوئی شی صاحبہ آلو کی شراب کا پیالہ چڑھا چکی ہوتی تھیں'' دیکھوں .... ذرا دکھاؤ تو مجھے...... اور پھر اس طرح جیسے وہ بڑی سگھڑ با سلیقہ خاتون ہو، کمونو کو تہہ کرتی اور اس کو دبانے اور استری کرنے کی خاطر اس پر چڑھ کر بیٹھ جاتی...... پھر اٹھ کھڑی ہوتی اور کمونو ایک گٹھری میں باندھ کر کبھی دادی سے مصافحہ کرتی اور کبھی کبھار اتامی کے دبلے پتلے پنجہ سے ہاتھ کو ہلا کر روانہ ہوتے ہوئے کہتی

’’بھئی اس میں سے بیس سین مجھے دے دو آج رات کا کھانا میں بازار سے ہی خرید کر لے جاؤں گی۔‘‘

یہ بات وہ بڑی ڈھٹائی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی کیا مجال جو ذرا بھی ندامت کا شائبہ ہو اس کے چہرے پر۔

اس کی اس ڈھٹائی پر وہ دونوں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتیں۔حلق خشک ہو جاتا یہ خیال کر کے کہ جو بھی تھوڑی بہت کمائی ہوئی تھی اس میں سے بیس سین تو یہ نکل گئے تو اب رہ کیا گیا۔

اسی صورت حال سے تنگ آ کر اتامی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شراب پلانے والی خادمہ کی ملازمت کر لے گی۔ بلا سے اس چڑیل سے تو پیچھا چھوٹے گا۔ اچھا اس بات کے علاوہ بھی ملازمت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ تسوتومو کی نقل و حرکت کو پوشیدہ طور پر بے خطر جاری رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ایک علیحدہ کمرہ گھر سے دور کرائے پر لے لیا جائے۔ اس لئے کہ کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے کہ جب چھپے ہوئے رسالے کی کاپیاں جلد ساز کو دی گئیں تو اسے پتہ چلا کہ پولیس ان کی تلاش میں ہے تسوتوموان کو لے کر وہاں سے بھاگا۔ اب یہ ایک ایسی اچانک افتاد تھی کہ یہ بھی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ انہیں لے جا کر چھپائے کہاں۔ بس الل ٹپ اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اس میں یہ بنڈل ڈالے اور چل پڑا۔ چلتے چلتے ایسے علاقے میں پہنچ گیا جہاں گھنا جنگل تھا۔ اس نے سوچا چلو یہیں چھپا دیتے ہیں فی الحال............ یہ اتوار کا دن تھا اور سوتو موسر پر کتابوں کا گٹھا لادے ادھر سے ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا کہ کوئی مناسب جگہ ملے تو ان کو چھپا دے۔ اسی طرح بھٹکتا بھٹکتا وہ ایک تنگ سے قطعہ کی طرف بھٹک گیا۔ یہ ایک لان تھا جس کے سبزے پر تین نوجوان طالب علم لیٹے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اب ایک طرف تسوتوموان کو دیکھ کر ٹھٹکا اور ادھر وہ بھی اس کو دیکھ کر چوکنے ہو گئے۔ طالب علم باتیں کرتے کرتے چپ ہو گئے اور ان میں سے ایک نے کھڑے ہو کر دیکھا کہ چھوٹے سے قد کا ایک شخص جس نے سر پر ہیٹ رکھا ہوا ہے اور اپنے فراخ دہانے کو سختی سے بند کر رہا ہے، کتابوں کا ایک بڑا سا گٹھا اٹھائے مارا مارا پھر رہا ہے۔

تسوتومومڑ کر تو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے وہ چلتا چلتا جنگل کی اس سمت کو نکل گیا جو کھلے میدان کے آگے پھیلا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کو رک کر اس نے کچھ سوچا اور پھر طے کر لیا کہ وہ ان کو یہیں کہیں چھپا دے۔ رسی اور کاغذ اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے رسالوں کو کاغذ میں لپیٹ کر باندھنا

شروع کر دیا۔اسی لمحے طالب علموں کی جانب سے سیٹی کی تیز اوراونچی آواز آئی۔سیٹی میں جاز کے بول بجائے گئے تھے۔تسوتو موان سے واقف نہ تھا۔تاہم اتنا سمجھ گیا کہ سیٹی میں جاز کے بول بجائے گئے تھے۔تسوتو موان سے واقف نہ تھا۔تاہم اتنا سمجھ گیا کہ سیٹی بجانے والا اسی سے مخاطب ہےاوراسے باخبر کرنا چاہ رہا ہے۔رسالوں کواس نے گھاس میں چھپا کران پراپنا پھٹا پرانا کوٹ ڈال دیا۔اوراس طرح بیٹھ گیا جیسے پیشاب کرنے بیٹھا ہو۔اسی وقت کچھ عورتوں کے ہنسنے کی آوازوں کے ساتھ تین چار لوگوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ان کے قدموں تلے چھوٹی چھوٹی خشک ڈالوں کے چرمرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ایسا لگتا تھا کہ آنے والے یہ فیصلہ نہ کر پارہے ہوں کہ وہ کدھر کو جائیں۔قدرے توقف کے بعد آخر کا انہوں نے اپنا رخ بدل دیااور بائیں جانب مڑ گئے۔

اپنے رسالوں کومحفوظ طور پر چھپانے کی کارروائی میں تسوتو موکوتقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ پھر وہ سیٹی کی آواز سنائی جس کے اونچے سروں میں پھران طالب علموں نے خطرہ قریب ہونے کا پیغام اس کی طرف بھیجا تھا جس کا مطلب تھا کہ کچھ لوگ پھر جنگل کے اسی رخ آرہے ہیں۔اس رات توسوموتو مونے کے لئے لیٹا تو اس نے اتامی کو یہ سارا واقعہ سناتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں بتایا کہ کس طرح ان اجنبی طالب علموں نے اپنی سیٹی کے اونچے سروں سے پیغام رسانی کر کے اس کوخطرے سے بچالیا۔پھراس نے کہا میں سوچتا ہوں کہ اپنے اوراپنے کاغذات کےتحفظ کے لئے مجھےایک علیحدہ کمرہ کرائے پر لے لینا چاہئے۔

پس یہی وجہ تھی۔اتامی کےشراب خانے میں شراب پلانے والی خادمہ کی ملازمت کرنے کی۔

اب تواس کا حلیہ بھی اور ہی تھا۔بالوں میں گھونگھریالی لہریں ڈالے،اس رات بھی حسب معمول وہ تسوتو موکی میز کےقریب کھڑی تھکان سے چور خشک لبوں پر اپنی زبان پھیلاتے ہوئے،دھیمی آواز میں روز کی طرح ''بیوٹی کلب''میں ہونے والے دن بھر کے واقعات سنارہی تھی۔

وہاں پرایک جمہوریت پسند ہے۔جو''سرخ پرچم''والانغمہ گاتا ہے۔اس نے مجھےاپنی کلائی پرزخم کانشان دکھاتے ہوئے بڑے فخر سے بتایا کہ یہ تشدد کانشان ہے جواس پر کیا گیا تھا۔

''ہونہہ''

پھر وہ کہنے لگی مجھے بڑی شرم آئی کہ لوگ کیا سوچیں گے کہ سارے کمیونسٹ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

تسوتو موجودادی اور دادا کے آنے کے بعد سے مستقل بے خوابی کا شکار تھا، اوتامی کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا اور اپنے کان کے پیچھے والے زخم کو رہ رہ کر دباتا رہا............ وہ کبھی اس شراب خانے کی روداد پوچھا ہی نہیں کرتا تھا کہ دن بھر میں کیا ہوا کیا نہیں۔ بس وہ اپنے آپ ہی بولے چلی جاتی۔ تب وہ بیزاری سے کہتا

''اچھا بھائی اب جا کر سو جاؤ تم۔'' دراصل وہ اب تک اس حقیت کو ٹھیک سے قبول ہی نہ کر پایا تھا کہ اتامی شراب پلانے والی خادمہ کی حیثیت سے ملازمت کر رہی ہے۔

جہاں تک اتامی کی خادمہ کے طور پر کام کرنے کا تعلق ہے۔ وہ اس دم کے قطعی موزوں نہ تھی۔ اور ان طور وطریق اور ادب وآداب سے واقف ہی نہ تھی۔ اس بات کا نہ خود اس کو اندازہ تھا نہ ہی تسوتو موکو............ ایک دن ایسا ہوا کہ ایک گاہک نے آ کر شراب طلب کی۔ اور آرڈر دیا۔

''میرا خیال ہے میں کاک ٹیل لینا چاہوں گا۔''

اتامی نے جو اس کی میز کے قریب ہی آرڈر لینے کے لئے کھڑی تھی ایک دم بھنویں اچکا کر کہا

ایک کاک ٹیل! ٹھیک! اپنے کندھے اچکائے اور منہ منہ میں آرڈر دہراتی چلی گئی۔ اور پھر اس کے سامنے مشروب لا کر رکھ دیا۔ گاہک نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو بجائے اس کے کہ طریقے سے اس کو باز رکھتی یا کوئی ایک آدھا چہکتا ہوا فقرہ کہہ کر ٹل جاتی۔ اس نے اپنے جسم کو اکڑا لیا اور تیوریاں چڑھا............ اب یہ ہوا کہ اس کے چہرے کی جو تھوڑی بہت ملاحت تھی وہ غائب ہو گئی اور اب اس کا چہرہ ایک خوفزدہ اور بھڑکے ہوئے خرگوش کی امیدگی کا تاثر دینے لگا۔ اس غیر متوقع صورت حال سے گاہک بھی بوکھلا سا گیا۔ عجیب مضحکہ خیز سی صورت حال تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ہاں اس کے منہ سے چچ کا لفظ ضرور نکلا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کل بیس دن کی ملازمت میں جس میں ٹریننگ کا عرصہ بھی شامل تھا، اتامی کو ''بیوٹی کلب'' کی ملازمت سے جواب مل گیا۔ اور سبب اس کا یہ بتایا گیا کہ اتنے دن کی تربیت کے بعد پہلی مرتبہ تسوتو مو نے ایک کتاب اٹھا کر اپنے بستر کی طرف جاتے ہوئے سوال کیا۔

''اچھا تو وہ گاہک کو خوش کرنے والا طریقہ کیا ہے؟''

''میں کیا جانوں بھئی مجھے کیا پتہ۔'' اتامی نے اپنے مصنوعی گھونگھر پڑے بالوں کی لہروں سے سجے سر کو جھٹکا............وہ بہت ہی دل گرفتہ ہو رہی تھی۔

اتامی نے جس غصے اور سختی سے کہا تھا ''میں کیا جانوں بھئی مجھے کیا پتہ'' تو اس کے انداز نے آج سے چار سال قبل اس کے اپنے اندر کی مضبوطی اور پختہ خیالی کو یاد کیا۔ ان دنوں شہر کے مضافات مین ایک قصائی نے اپنی دکان کے شیشے پر لکھ رکھا تھا۔

''ہم سور کا گوشت بیچتے ہیں''

اور قصہ یہ ہے کہ اتامی اسی قصائی کی بیٹی تھی۔ اب اتفاق یہ ہوا کہ تسوتو مو کے ایک رشتے کے لئے بھائی کو آنکھوں کی خطرناک بیماری لاحق ہوگئی۔ اور وہ شہر کے ہسپتال میں داخل ہوگیا۔ اتامی اس ہسپتال میں بطور آیا کام کرتی تھی۔ تسوتو مو جو بھائی کی دیکھ بھال کے لئے آتا جاتا رہتا تھا رفتہ رفتہ اس کی اتامی سے بات چیت ہونے لگی۔ تسوتو مو ان دنوں پوسٹ آفس میں ملازمت کر رہا تھا۔ اس نے اتامی کو جو کتابیں پڑھنے کو دیں ان میں وار فلیٹ اور کئی ایسی ہی کتابیں تھیں۔ اگر چہ اتامی نے پرائمری تعلیم ہی حاصل کی تھی۔ تاہم وہ ان کتابوں کو بڑے غور اور توجہ سے پڑھا کرتی تھی۔ اس طرح اس نے تسوتو مو کی کتابیں پڑھنے کے لئے لیں۔ اور ایک دن وہ مارکس کی کیپٹل مانگ بیٹھی۔ دراصل اس کا خیال تھا کہ شاید یہ کسی اور موضوع پر ہوگی۔ پانچ دن بعد اتامی جو ابھی تک اپنے بالوں کی چٹیاں باندھا کرتی تھی۔ مریض کے کمرے میں داخل ہوئی، اس کی ناک پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور اس نے کتاب اس کو واپس کردی۔

''کچھ پلے بھی پڑا؟'' اس وقت یہ سوال کرتے ہوئے تسوتو مو نے غیر ارادی طور پر اپنا دہانہ ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے جواب میں اتامی نے اپنی طویل بھنویں اتنے زور سے اچکائیں کہ لگتا تھا کہ وہ اس کے ماتھے پر ہی سے سرک گئی ہیں۔ پھر اس نے بغور تسوتو مو کو دیکھا جو قد میں اس سے صرف بارہ سینٹی میٹر ہی زیادہ تھا۔ (اگر چہ دونوں ہی پستہ قد تھے) پھر اس نے اپنی پوری قوت سے جما کر جواب دیا

''مجھے پتہ نہیں۔''

یہ کہتے وقت اس نے بالکل ایسے سر ہلایا تھا جیسے آج اس وقت سر کو جھٹک کر پوری قوت سے کہا تھا۔

''مجھے پتہ نہیں۔''

اب تسوتو مو اس کی اس ادا کو تقریباً بھول چکا تھا۔

شادی کے وقت اس نے کہہ دیا کہ وہ لڑکی والوں کو شادی کے لئے کوئی رقم نہیں ادا کرے گا۔ اس لئے کہ وہ ان سے بھی سلامی میں گھوڑا، گائے یا کسی بھی قسم کا تحفہ قبول نہیں کرے گا۔ اس کی اس بات پر اتامی کی اماں نے رونا پیٹنا ڈال دیا کہ ہماری لڑکی کوئی گائے، بھینس یا گھوڑا تو نہیں کہ کسی کے ہاتھ میں اس کی رسی تھما دی اور بس۔ ارے لڑکی جہیز کے نام پر کچھ تو لے کر ماں باپ کے گھر سے جائے.................اس پر اتامی نے کہہ دیا کہ اگر اس کے گھر والوں نے زیادہ گڑ بڑ مچائی تو پھر وہ گھر چھوڑ کر خود ہی چلی جائے گی۔ چنانچہ وہ تو سوتو مو کے پاس ٹوکیو آ گئی۔

بہر حال تسوتو مو کی ناراضگی کے باوجود اس بادل ناخواستہ ملازمت سے جو پیسے ملے تھے، اتامی نے اوئی شی کے قرضے کے دس ین اتار کر جو بچے وہ تسوتو مو کے کمرے کے کرائے کی نذر ہو گئے۔

تسوتو مو کمرے میں جا کر رہنے لگا تو ابھی اتامی سکھ کی سانس بھی نہ لینے پائی تھی کہ اوئی شی کا قرضہ دگنا ہو گیا۔ وہ ایسے کہ ایا مر گئی اور ان کے پاس اس کے کفن دفن کے لئے بھی کچھ نہ تھا۔ اب ظاہر ہے کہ وہ اوئی شی کے سوا اور کس کے آگے ہاتھ پھیلاتے............ چنانچہ کوآئی کا کنبہ اوئی شی کا مزید قرضہ اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔

دادا اور دادی مرگھٹ سے ایا کی خاک لے کر واپس آئے تو ''متسو کو'' دادی کی پیٹھ پر کمونو کی پیٹی سے بندی ہوئی تھی۔ دادی نے آتے ہی الماری کا ایک خانہ خالی کر کے اس پر رکھا ہوا سامان پیچھے ڈال کر خالی خانے میں فیوجی سلک کی ایک گٹھری قرینے سے بچھا کر وہ خاکدان اس پر سجا دیا جس میں ایا کی راکھ تھی۔ ان دنوں اتامی نے ایک شراب خانے کی صبح کی شفٹ میں کام شروع کر دیا تھا۔ صبح کی گئی شام کو لوٹی تو دیکھا کہ دادی بت بنی اس راکھ دان کے آگے بیٹھی ہے۔ متسو کو اسی طرح پیٹھ پر بندھی ہوئی ہے اور اس کی ٹانگیں پیٹی کی جھولی سے باہر جھول رہی ہیں۔

''ہے۔ اب ہمیں سرخ کپڑے کی کیا ضرورت رہی۔'' اس نے اپنی نگاہیں خاکدان پر سے اٹھائے بغیر کہا۔ اسامو بھی کام پر سے واپس آ گیا تھا۔ ایک عجیب سے ندامت کا تاثر لئے ہوئے کھڑے ہی کھڑے وہ خاکدان کے آگے تھوڑا سا جھکا اور پیچھے ہٹ گیا۔

اس موقعہ پر کوئی رویا دھویا نہیں ہاں البتہ متسو کو، جس کے بال ولندیزی اسٹائل میں کٹے

ہوئے تھے۔ خاکدان کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کر کے وہ............ وہ رٹے جارہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کو دکھ ہے کہ اس میں اس کے کھانے کی کوئی چیز نہیں۔ دادا دادی کوئی اپنے دیس میں تو تھے نہیں کہ ان کو اپنی بیٹی کو دفن کرنے کے لئے دو گز زمین مل سکتی۔ اور نہ ہی یہاں ان کا مندر تھا جہاں وہ اس کی ہڈیوں کی راکھ سے بھرا خاکدان رکھ سکتے۔ ایا کی موت کے بعد سے دادا کے روٹھے اور اکڑے ہوئے رویئے میں تبدیلی آرہی تھی۔ اتامی اس بات کا اندازہ دادا کے بیٹھنے کے انداز سے ہی کر سکتی تھی۔

یہ تو خیر نہیں پتا تھا کہ اوئی شی اپنا روپیہ واپس لینے کے لئے کوئی چال بھی چل سکتی تھی۔ اور کوئی حرکت بھی اس سے بعید نہ تھی۔ اتامی کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی دن شراب خانے میں بن بلایا مہمان بن کر آدھمکے۔

اور دادی اس بات پر صاد کرتی ''ہاں یہ تو ٹھیک ہے ایسا لگتا ہے کہ وہ یہ تائید بلا سوچ سمجھے کرتی تھیں۔'' لیکن اس رات وہ معاملے پر غور کرتی رہی ہوگی جب ہی اگلی صبح وہ اٹھتے ہی اتامی کے پاس جا بیٹھی۔ اتامی باورچی خانے میں بالٹی رکھے کپڑے دھو رہی تھی۔ دادی کی گود میں متسو کو چڑھی ہوئی تھی۔ صابن کے جھاگ دیکھتے ہی وہ بالٹی میں ہاتھ ڈالنے اور صابن کے جھاگوں سے کھیلنے لگی۔ دادی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہٹاتے ہوئے اتامی کو بتایا۔

''کل چچی آئی تھی اور آتے ہی پوچھنے لگی ایک بات بتاؤ کیا اتامی بھی سرخوں کے لئے کام کرتی ہے۔''

''ہاں دیکھا............ میں کیا کہتی تھی۔ اچھا پھر تم نے کیا جواب دیا۔''

''میں نے کہہ دیا کہ شراب خانے میں کام کرتی ہے۔''

اتامی کو افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت خود موجود نہ تھی۔ اس نے اپنی ساس سے کہا اچھا تو دادا کو ہوشیار کر دینا۔ ایسا نہ ہو وہ ان سے کچھ اگلوا لے۔

ان دنوں دادا نے ایک بچہ گاڑی میں بچوں کے لئے مٹھائیاں وغیرہ لگا کر بچوں کے ہاتھ بیچنا شروع کر دی تھیں۔ موسم اچھا ہو یا خراب دادا بڑی پابندی سے صبح صبح نکل جاتا اور اساموکی واپسی کے وقت ہی گھر میں داخل ہوتا۔ اس طرح کہ پچھلی گلی میں گھس کر پہلے یہ اطمینان کر لیتا کہ گھر میں اوئی شی تو نہیں آئی بیٹھی ہے۔ احتیاطاً گاڑی باہر ہی چھوڑ دیتا۔ پھر صدر دروازہ کھول کر اپنی گاڑی اندر کرتا۔ اس پر بھی ایک دن وہ راہ میں کہیں ٹکر گئی تو بکری کے تھوڑے سے پیسوں میں

سے بھی دس سین لئے بغیر نہ ٹلی تھی۔اس تلخ تجربے کے بعد وہ اور زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔
گاڑی کے اندر آنے کی آواز سنتے ہی متسو کو لڑھکتی ہوئی پہنچ جاتی۔
''دادا۔دادا آ گئے۔مجھے مٹھائی دو۔'' وہ بڑے دعوے اور یقین سے سر اٹھا کر کہتی۔اور پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی۔ گٹھری میں لپٹے ہوئے مٹھائی کے بڑے سے چوکور پیکٹ پر اپنے گندے سندے ہاتھ رکھ کر کہتی۔ یہ میرا ہے۔
''ٹھہر جا دادا کو اندر تو گھسنے دے۔''
مگر وہ اصرار کرتی ''نائیں یہ میلا (میرا) ہے۔''
مجبوراً دادا وہیں دروازے میں بیٹھ جاتا اور کچھ شکر چڑھی ہوئی گولیاں نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتا۔ پھر وہ دادا کے منہ میں ایک گولی ٹھونس دیتی۔ اور پھر جلدی جلدی ساری گولیاں اپنے منہ میں بھر لیتی۔ دادی اور اتامی کے درمیان باورچی خانے میں ہونے والی بات کے پانچ یا چھ دن کے بعد کی بات ہے ''للی آف دی ویلی'' نامی شراب خانے کے کام سے فارغ ہو کر ہاتھ میں کروشیا سے بنائی ہوئی چیزیں اٹھائے وہ آرام سے گھر کو واپس آ رہی تھی۔ یہ ملازمت ایسی تھی کہ وہ وہاں ایک اشد ضرورت کے وقت ہی کام پر بلائی جاتی تھی اور تین دن میں صرف ایک مرتبہ یہ موقع آتا تھا۔ چنانچہ فارغ اوقات میں وہ کروشیا کا کام کرتی رہتی تھی۔اس کے پاس تقریباً ساٹھ سین اس وقت اپنی کمائی کے تھے اور وہ بڑی بےفکری سے ڈھلواں راستے سے گذرتی گھر کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے ایک پولیس والے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ یہ واحد سڑک تھی جو اس کے گھر کو جاتی تھی اور اس کے دوسرے سرے پر صنوبر کے پودوں کی نرسری تھی۔ جب ہی وہ آہستہ آہستہ ڈھلوان پر چڑھنے لگی تو اس نے دیکھا کہ وہ پولیس والا تمام گھروں کے نمبر اور ناموں کو بڑے غور سے دیکھتا پھر رہا ہے۔ بالآخر وہ اس گھر پر رک گیا جس پر ایک کاغذ چپکا ہوا تھا اور کاغذ پر ''کوئی وائی'' لکھا تھا۔ وہ وہیں رک گیا۔ پھر دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔
اتامی کی سانس تیز ہو گئی۔ کچھ ڈھلوان راستے کی چڑھائی اور کچھ یہ پریشانی منہ کھولے ہانپتی ہوئی آگے بڑھی اور لاتعلقی سے اپنے گھر سے دو گھر کے فاصلے پر چھپ کر کھڑی ہو کر دیکھنے لگی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اتنے میں دادی ہاتھ میں بالٹی اٹھائے باہر نکلی اور کپڑے نچوڑ کر الگنی پر پھیلانے لگی۔ اتامی سانس روکے۔ دادی اور پولیس والے کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کرنے لگی۔ پولیس والا سوال کر رہا تھا

''یہاں اب پانچ آدمی رہتے ہیں؟''

''ہاں''

''وہ بچی۔اچھا اچھا یہ متسو کو ہے۔''

یہ کہتے کہتے پولیس والا خاموش ہوکر اپنی نوٹ بک ٹٹولنے لگا۔ پھر ایک سے دوسری ٹانگ پر اپنا وزن ڈالتے ہوئے۔اپنی تلوار کو ٹکرایا۔

''اچھا تو تمہارا بیٹا تسو تو مو غائب ہے؟''

دادی متسو کو کی گلابی جانگیہ نچوڑنے لگی۔ اتنی دیر میں اتامی کے کانوں میں مارے وحشت کے سائیں سائیں کی آوزیں سنائی دینے لگیں۔دادی نے اپنی مخصوص مری مری نرم آواز میں جواب دیا۔''ہاں''

''ارے کیوں کہاں غائب ہوگیا اتنی چھوٹی بچی کے ہوتے۔کیا وجہ ہے۔''

''آوارگی۔بے راہ روی''

''ہاں یہ ٹھیک ہی لگتا ہے۔''

بے خبری میں اتامی مسکرا دی تھی۔ نیچی نظروں اور کسے ہوئے بازوؤں سے اس نے گویا اپنے آپ سے کہا۔

''خوب دادی۔ بڑا کام کر دیا تم نے'' واقعی بات بنا دی۔ وہ صدق دل سے محسوس کر رہی تھی۔

افلاس اور غربت کی زندگی گذارتے ہوئے آج تک دادا کو گھر بار سے کوئی مطلب نہ تھا وہ تو اپنے لئے ایک وقت کے چاول ابالنے جوگا بھی نہ تھا۔بس نہ جانے کیسے اسا مو کو پرائمری تک پڑھوا دیا تھا۔سب ذمہ داری دادی ہی پر ڈال رکھی تھی۔ بقول تسو تو مو کے دادا کی زندگی تو دادی پر منحصر ہے۔ وہ نہ ہو تو ایک دن گذارا نہ ہو۔اتامی بھی یہ بات جانتی تھی کہ دادی بڑی زیرک اور حاضر دماغ ہے۔وہ بگڑی کو بنانا جانتی ہے۔

اب کچھ دن سے ''للّی آف دی ویلی'' کی دھندلائی ہوئی سرخ اور سبز روشنیوں کے درمیان گھومتے پھرتے اور بیٹھے بیٹھے اتامی کے کانوں میں دادی اور پولیس کے درمیان مکالمے گونجنے لگتے اور پھر ایک بات واضح اور صاف طور پر سنائی دیتی

''آوارگی''

ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ بات اتنی غلط بھی نہ لگتی تھی۔ لیکن جوں جوں وہ اس پر غور کرتی، وہ مسئلہ پیچیدہ ہونے لگتا۔ وہ عجیب ملے جلے جذبات سے دوچار ہونے لگی۔ جو سچ پوچھا جائے آوارگی اور تسوتوموں و متضاد لفظ تھے۔ اور اس کے شوہر کا اس لفظ سے دور کا تعلق بھی نہ بنتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ حالات نے ایک عرصے تک اس کو یہ سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا تھا لیکن اب جبکہ اس کا شوہر اس سے الگ اور دور جا کر رہنے لگا تھا، تو اس کو محسوس ہوا تھا تسوتوموتو وہ شخص تھا جس کا بے راہ روی یا آوارگی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور یہ کہ وہ اپنی بیوی اور بچے کو محض آوارہ گردی کے لئے چھوڑ بیٹھے۔ یہ اس شخص سے بہت بعید بات تھی۔ اب اس کے بارے میں کہی ہوئی یہ بات کتنی مضحکہ خیز محسوس ہوئی۔ اتامی کو یہ صورت حال بڑی دلچسپ لگی۔ اور وہ اس سے لطف اندوز ہوا کرتی تھی...... جوں جوں وہ ان باتوں کو سوچتی تھی۔ اسے اپنے دونوں کے رشتے اور تعلقات کی مضبوطی اور استواری کا احساس ہو رہا تھا۔ البتہ اتامی کو شروع ہی سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر کسی سبب سے تنظیم کی سرگرمیوں میں حصہ نہ لے سکی تو تسوتوموکی اس سے نبھ نہ سکے گی۔ اور اب تو وہ بخوبی جان چکی تھی کہ اگر کبھی بھی ایسی کوئی صورت پیدا ہوگئی تو خود اس کے ساتھ چمٹی نہیں رہ سکے گی اور اس طرح وہ اس کے آگے شرمسار نہیں ہوگی۔ دراصل پرولتاری کی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ تسوتوموکی وقعت ہی تو اس کے وجود کی تشکیل کرتی تھی اور اس کے اندر جاری وساری۔ ایسی باتیں اس نے تسوتوموکے الگ جا کر رہنے کے بعد پہلی مرتبہ سوچی تھیں۔ رات گئے تک وہ سو نہ سکی تھی۔ میز پر منہ اوندھائے متسو کو گود میں لیے بیٹھی رہی۔

پھر ایسا ہوا کہ گرم کپڑوں کا موسم اچانک ہی آ گیا۔ رہ رہ کر بڑی اچھی بارشیں پڑ رہی تھیں۔ بارش کے دنوں میں صنوبر کے جنگلاتی فارم کی جانب سے گندہ بیروزہ کی بھینی بھینی بھیگی بھیگی مہک ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ صنوبر کے نوخیز پودوں سے اٹھی ہوئی یہ مہک ان کے گھروں تک پہنچتی تھی۔ اس لئے کہ دو کمروں کے گرد کھلے برآمدوں والا یہ گھر صنوبر کے جنگلاتی فارم کے عین مقابل تھا اور وہاں سے اٹھنے والا پہلا جھونکا اس طرف کو ہی آتا تھا۔ جہاں الماری کے ایک خانے میں ایا کی راکھ والا خاکدان سجا ہوا تھا۔

آج اسے لیٹ شفٹ میں کام پر جانا تھا۔ اس لئے وہ تسوتوموکی میز پر بیٹھی پڑھتی رہی۔ دادا بھیگے اور برستے موسم میں پھیری پر نہ جا سکے تھے اور وہ نہ جانے کب سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ایک دم انہوں نے اتامی کو آواز دی اور اپنے منہ میں بغیر چلا پائپ دبائے وہ کہہ رہے

تھے۔

''ارے سن رہی ہو میں نہیں مانتا وہ اس طرح تو گرفتار نہیں ہو سکتے۔''

حیرت زدہ سی ہو کر وہ ان سے اخبار لے کر دیکھنے لگی۔کون؟ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔وہ بوکھلا گئی۔اخبار کے تیسرے صفحہ پر ایک کونے میں یہ خبر لگی تھی۔

''کوٹو کے علاقے میں ایک روزگار دلوانے والی ایجنسی کے کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔''

دادا کے اخبار پڑھنے کا طریقہ میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔اس کا احساس اتامی کو بڑے واضح طور پر ہو گیا تھا اس لئے کہ وہ اب اخبار پڑھتے پڑھتے ذرا ذرا سی باتوں کے بارے میں ایسے سوالات کرتا کہ کبھی اسامو نے کبھی نہ کئے تھے۔اتامی کی جھجکتی ہوئی وضاحتیں اور جواب بڑی خاموشی اور توبہ سے سنتے سنتے اچانک پوچھتا

''ارے بھائی پھیری لگا کر مٹھائی بیچنے والوں کی بھی کوئی یونین ہے؟''

''مجھے تو پتہ نہیں۔''

جواب ملتا۔تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد دادا اپنے پائپ کے سرے کو دانتوں سے کچلنے لگتا۔پھر ایک دم ہی پائپ منہ سے نکال کر ایش ٹرے پر کھٹ کھٹ مارتا۔جس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ دنیا نے اگر تسوتو مو کے کہنے کے مطابق اپنی روش نہ بدلی تو بڑے دکھ جھیلے گی۔

دادا کی اس قسم کی باتوں ہی سے اتامی اندازہ کر سکتی تھی کہ اس وقت تک دادا کا ذہن کس حد تک ترقی پسند ہوا ہے۔

''ہاں دادا جی یہی بات ہے۔یہی تو میں کہتی ہوں کہ آپ کو وہ باتیں اب انہیں دہرانا چاہئے جو آپ پہلے کہتے رہے ہیں۔ایک ماہ قبل اتامی تسوتو مو کا بوسیدہ اور پھٹا ہو کوٹ کھونٹی پر ٹانگ رہی تھی کہ اس کا پھٹا ہوا استر دیکھ کر کہا تھا

''ایسا نکما ہے یہ شخص بھلا دیکھو تو تیس سال کی عمر ہونے آئی ہے اس کی،عرصے سے ٹوکیو میں رہ رہا ہے۔اس کو شرم نہیں آتی اس پھٹے پرانے کوٹ میں ٹوکیو کی سڑکوں پر پھرتے۔''اس کی اس بات پر اتامی کو بے اختیار غصہ آ گیا اور وہ اس سے لڑ پڑی تھی۔آج اس وقت اسی واقعے کی طرف اس کا اشارہ تھا۔

دادا نے خاموشی سے اپنے گھٹنوں کو ہلایا۔آہستہ آہستہ پائپ کے کش لگائے دروازے

سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی۔

اتامی اس وقت کپڑے بدلنے کو جاتے جاتے بولی ''دادی ذرا اپنی پوی متسو کو کا خیال رکھیں۔ اور اپنے کیمونو کا اونی (تکمہ) لگاتے لگاتے اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے سامنے تسوتو مونپے تلے قدم اٹھاتا آن کھڑا ہوا ہے۔ اس نے اپنا منہ سختی سے بند کر رکھا ہے اور اس نے مضبوطی سے پکڑی ہوئی چھتری تلے اپنے مختصر اور نحیف جسم کو محفوظ کر لیا ہے۔

داگایائیکو

پونم کا چاند

اوئل فروری کا وہ دن غیر متوقع طور پر خوبصورت، شفاف اور خوش گوار حد تک نرم اور گرم تھا۔ ایسے میں میں نے اپنے ہیئر ڈریس اومائی یو سے جو آرائش گیسو کا بڑا سلیقہ رکھتی تھی، فرمائش کی کہ وہ دوسری منزل کے پورچ میں بیٹھ کر میرے بال بنادے۔ سچی بات ہے کہ اب جب میں نے اپنی عمر چھپانا چھوڑ دی ہے تو آپ سے کیا پردہ میں اس سے کہتی تھی کہ وہ میرے سر کے سفید بال چن چن کر توڑ دے۔ شروع شروع میں دس سال قبل تو مہینے میں ایک بار بال چنواتی تھی، پھر ایک سے دو، دو سے چار بس اسی طرح بڑھتے گئے۔ اور میں تو شکر کرتی ہوں کہ میں اس تمام کھکیڑ اور جنجال سے بچی رہی جو ادھیڑ عمر کی خواتین کو اپنے دکھاوے اور رکھ رکھاؤ کے لئے کرنا پڑتی ہے۔ اصل میں میری اماں نے ایک مرتبہ اپنی مخصوص کچی بولی (علاقائی) میں یہ بات سمجھائی تھی کہ دیکھو کبھی بالوں کو رنگنے کے چکر میں نہ پڑنا۔ ورنہ میرا جیسا حال ہوگا کہ تمام عمر اس جنجال سے نہیں نکل سکوگی۔ بس ایک بار بال رنگے نہیں کہ تمام زندگی کے لئے یہ روگ لگ جائے گا۔ بھئی میں تو اللہ کا شکر کرتی ہوں کہ اماں کی نصیحت پر عمل کر کے اس جھنجھٹ سے بچی رہی۔

اومائی یو نے اپنے سنگھار مرکز پر آرائش کیسو کا جو اشتہار لگا رکھا تھا، اس میں ایک نوخیز دلہن تھی جس کے بال تاکاشی مادا ہیئر اسٹائل سے سجے تھے۔ کمونو کی کمر سے نیچے کولہوں والے حصہ پر بڑے بڑے پھولوں والے خوش رنگ پھولدار پیٹرن بنا ہوا تھا۔ اومائی یو آرائش کیسو کے فن میں طاق تھی۔ لیکن وہ یہ کام بہت چھوٹے پیانے پر انجام دیتی تھی۔ اس نے نہ تو جدید آلات اور مشین

رکھی تھی نہ کوئی مددگار۔ تمام گھریلو عورتوں کی طرح اپنی ساس اور خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی ساس بہت عمدہ سلائی کرتی تھی۔ مذہباً تینیوں کیتھولک عیسائی تھے۔

ایک تو معقول اور شریف گھرانا پھر بھروسے کے لوگ۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہمارے محلے کے نکڑ والے گھر ہی میں تو رہتے تھے وہ لوگ۔ مجھے جب بھی ضرورت پڑتی اور کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہوتی تو میں اپنی مدد کے لئے گھر جا کر اس کو بلا سکتی تھی۔ مثلاً گھر کی رکھوالی کے لئے اسے بٹھانے یا کسی دوسرے کام سے خصوصاً بال بنوانے کے لئے میں خود اس کے گھر جا کر اس کو لے آتی۔

جب بھی ایسا کوئی کام آپڑتا تو وہ تمام دن ہمارے یہاں گذار دیتی تھی۔ خصوصاً سفید بال چننے کے کام میں بڑا وقت لگ جاتا۔ صبح سے شام تک وہ جتی رہتی، صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا بھی ہمارے ساتھ کھا لیتی۔ پھر کچھ دیر ستا کر سہ پہر کی چائے پی کر دوبارہ جت جاتی اور شام پڑے گھر واپس جایا کرتی۔

ایک دن میرے شوہر شونی چی نے اکتا کر کہا کہ جہاں اپنے دکھاوے اور رکھ رکھاؤ کی بات ہو تو یہ عورتیں کیسے پتہ مار کر بیٹھتی ہیں۔

اور جواب میں میں نے بھی کہہ دیا کہ ''بھئی وہ جو مثل مشہور ہے نا تین ہزار فٹ سفید بالوں والی، تو اب میں بھی اپنے تین ہزار سفید بالوں کی گنتی پوری کر کے ہی رہوں گی اور اس کے لئے پتہ مار کر ہی تو بیٹھنا پڑے گا۔ یہ کام پلک جھپکاتے تو ہونے سے رہا۔ صاف بات ہے کہ میں کھچڑی بالوں والا دہشتناک سر لے کر تو گھومنے سے رہی۔ کیوں بھئی او مایوں میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں؟''

دراصل کالے اور اب سفید بالوں بھرا سر میری برداشت سے باہر تھا۔ اور میں تو ایک سفید بال بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ میں تو ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ اگر بالوں کو سفید ہونا ہی ہے تو اکٹھے اک دم ہی سفید ہو جائیں۔ بالکل اس طرح جیسے راتوں رات برف گر گئی ہو۔ قصہ یہ کہ ایک مرتبہ بیرون ملک سفر کے دوران میں بالوں میں کتنی شاندار اور دلکش نظر آتی تھیں۔ وہ نوخیز اور نوعمر لڑکیوں سے بڑھ کر۔

اومائی یو میرے بالوں میں کنگھے کے باریک حصے سے مانگ کھول کھول کر ایک ایک سفید بال توڑتی جاتی۔ ہر بال تقریباً ایک انچ لمبا ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے بال چنتی چنتی وہ عین چندیا

کے بالوں تک پہنچ جاتی۔

اس دن بھی ہم نرم دھوپ میں بیٹھے تھے۔ وہ بال چن رہی تھی اور میں باتیں کر رہی تھی۔ میں اس کو یورپی عورتوں کے بارے میں اپنے تاثرات اور خیالات سے آگاہ کر رہی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ گھنٹوں کے حساب سے بیٹھ کر بال چننے اور چنوانے کا عمل خاموش بیٹھ کر تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سو گفتگو بھی ایک ضرورت تھی۔ اور کچھ نہ کچھ بولنا بھی ضروری تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم دونوں ہی کو اس کام میں خاص حظ حاصل ہوتا تھا۔ خصوصاً جب چندیا پر سے بال اکھیڑے جاتے تو یوں لگتا جیسے کھوپڑی کے اندر اور باہر طاری جمود ٹوٹ رہا ہے۔ اداس کا سن پن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک عجیب سے لہر مہر اور توانائی کا حساس ہونے لگتا۔ اور اومائی یو بھی بڑی سہولت اور مشاقی سے خود کار انداز میں یہ کام انجام دیتی اور عجیب سی راحت اور فراغت کا احساس اس پر طاری ہونے لگتا۔ اور ہم دونوں پر نیند کی سی کیفیت چھا جاتی۔ یوں اس طرح کہ میں سر جھکائے اس کے آگے بیٹھی ہوں۔ اور وہ کنگھے سے بال ہٹا ہٹا کر سفید بال ڈھونڈ ڈھونڈ کر چنتی جاتی ہے۔ گھنٹوں گھنٹوں گذر جاتے۔

اور اس روز تو فراغت اور راحت کا احساس یوں بھی زیادہ تھا کہ آج ہی میں اپنا ایک افسانہ مکمل کیا تھا۔ جس کو مکمل کرنے کی دھن میں اپنے بالوں کی فکر سے بے نیاز رہی تھی۔ اور اب جو یہ کام ہو رہا تھا تو ایک طرف تو اس کی راحت اوپر سے نرم اور گرم دھوپ میں بیٹھ کر طاری ہو جانے والی سستی، کاہلی اور نندا سا پن۔

''کیسی کائیں کائیں کرتی ہیں۔'' میں نندا سی آواز میں بڑی کاہلی سے کہا

''یقیناً اب یہ غول کے غول جا کر الواسا کی بنوں میں ڈیرے ڈالیں گے۔'' اومائی یو نے بھی کھوئی کھوئی خالی آواز میں جواب دیا۔

میں تو ان کووں کی بات کر رہی تھی جو ابھی کچھ دیر قبل دوسری جانب والے شیشے کے دروازے کے پاس بول رہے تھے۔

''اب یہاں اتنے کوے نہیں نظر آتے جتنے پہلے ہوا کرتے تھے۔''

ہاں بھئی وہ کوے ہوں یا عامے گوریا چڑیاں۔ ان سبھوں کو پتہ ہوتا ہے کہ اگر وہ یہاں سے بسیرا چھوڑ کر دور آگے کو نہیں جائیں تو فاقوں مریں گی۔ ہم دونوں ہی اس بات پر مسکرائی تھیں۔
لیکن کوے اس زور سے شور مچا رہے تھے کہ لگتا کہ درجنوں کوے جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو کر

یہیں آس پاس بسیرا لینے کی فکر میں ہیں۔ ان کے بولنے اور جمع ہونے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سڑی گلی شے پر ٹوٹ کر گر رہے ہوں اور ٹھونگیں مار رہے ہیں۔ تاہم بیچ بیچ میں ان پر خاموشی بھی طاری ہو جاتی تھی۔ یا پھر ایک آدھا کوا رک رک کر کائیں کائیں کرتا رہتا۔ عجیب مریل سی کرکری کرکری آواز میں بولے چلا جاتا۔ کوے کا ایسی آواز میں بولنا بدشگونی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

''خیر کچھ بھی ہو کوے کی آواز تو ہوتی ہی مکروہ ہے۔''

ہاں لوگ کہتے تھے کہ ایواساکی کے بن میں بولنے والے کوے کی آواز ہی بتا دیتی ہے کہ ہسپتال میں داخل مریض بچ سکے گا کہ نہیں۔ اچھا ایک بات یہ بھی ہے کہ مریض کا خاندان کبھی کوے کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ البتہ دوسرے فوراً سن لیتے ہیں۔

''اچھا تو اس بات کے برعکس شگون بھی تو لیا جا سکتا ہے؟''

اس بات پر مجھے ایک قدیم کابوکی (جاپانی ڈرامہ کی قسم) یاد آ رہا تھا۔ اب کچھ یاد نہیں کہ وہ ڈرامہ میں نے کب دیکھا تھا۔ اس میں یہ تھا کہ ایک عورت کوے کی ایسی منحوس کرکرن کرانتہائی پریشانی کے عالم میں گرتی پڑتی گھر پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کا بیمار خاوند ایک ایسے شخص کے ہاتھوں مارا گیا ہے جس کو وہ خود قتل کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اب اس بات سے میرے اس سوال کا یہ جواب تو نہیں ملتا۔''

''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میرے گھر میں بھی اور آپ کے گھر بھی صلا ہی رہے گی۔ اس لئے کہ ہم دونوں ہی نے کوؤں کی کاں کاں ایک ہی ساتھ سنی ہے۔''

ایمان کی بات یہ ہے کہ میں شگون اور بدگونی کے بارے میں ایسی تاویلیں اس لئے دیئے جا رہی تھی کہ کوؤں کی منحوس کاں کاں کے تسلسل سے میرا اپنا دل ڈرا ہوا تھا اور بڑی وحشت سی ہو رہی تھی۔ اور جیسی میں صبح سے مطمئن اور آسودہ سی ہو رہی تھی اب اس وقت اس آواز کو سن کر یوں لگ رہا تھا کہ دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ وہاں وطن میں میری اماں جواب اسی سے اوپر ہو گئی تھیں، بارے میں برے برے خیال آنے لگے جو وطن سے دور ایک دور دراز بیرونی ملک میں رہتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت ان ہی کے لئے دل میں ہولیں سی اٹھی رہی تھیں۔ ان ہی میں دل پڑا رہتا تھا۔

اس رات ہم اپنے تیسرے بیٹے ہیکارو کو کھانے پر باہر لے گئے۔ ایسے موقعے کم ہی آتے

تھے۔ایک تو کھانا بہت اچھا اور لذیذ تھا۔اور یہ کہ شام بھی اتنی سرد نہیں تھی بلکہ دن ہی کی طرح نرم نرم سا گرم احساس دلاتی تھی۔ چنانچہ ہم بے حد خوش خوش گھر واپس آئے۔''کوئی، خط کوئی فون یا پیغام؟''

میں ہمیشہ گھر کے دروازے پر پہنچتے ہی پہلا سوال یہی کرتی تھی۔ہاں جی ایک تار آیا ہے۔ خادمہ نے جواب دیا۔ میں سوینچی کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے جلدی سے آگے کو لپکی اور میں نے جلدی سے ڈرائنگ روم کا سرکنے والا دروازہ زور سے سرکا کر کھولا۔شام کے اخبار کے قریب ہی میز پر تار پڑا تھا

''اماں کو دل کا دورہ پھر پڑ گیا۔''

پتا نہیں مجھے کل کی ایکسپریس کا ٹکٹ مل بھی سکے گا۔ میں نے مڑ کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا وہ ابھی تک تار ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ میں نے پرسکون اور ہموار آواز میں ان سے کہا میں صبح سے ایسی خبر سننے کی توقع کر رہی تھی جب سے میں نے کوے کی منحوس کرکر سنی تھی۔ اچھا ٹھیک ہے اماں بس میں سیدھی آپ کے پاس آ رہی ہوں۔ ہرصورت میں آپ تک پہنچ جاؤں گی۔ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل میں یہ خیال نہ آیا کہ اگر خدانخواستہ اس سے پہلے کچھ ہو گیا تو؟ لیکن یہ ناممکن تھا ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اس حادثے کو روک لوں گی مقابلہ کر کے۔ پچھلے کمرے میں کپڑے بدلتے ہوئے میں نے دانت بھینچ رکھے تھے تاکہ رونے پیٹنے پر قابو پاسکوں۔تاہم میں آنسوؤں کو نہ روک سکی اور وہ پھسل پھسل کر میری ناک سے ٹپک رہے تھے۔

دوسرا تار آدھی رات کو ملا۔لکھا تھا اگر میں آنا چاہتی ہوں تو پھر جتنی جلدی آسکوں بہتر ہوگا۔تاہم ابھی اماں کی حالت ابھی نازک نہیں ہے۔سوتے سے اٹھ کر میں نے آنکھیں پھاڑ کر راستے کا تصور کیا۔ ہمارے درمیان پانچ سو میل کا فاصلہ تھا۔جس کے درمیان بے شمار پہاڑ اور دریا پھیلے ہوئے تھے۔ کیوشو واقعی یہاں سے بہت دور ہے۔اس خیال سے اپنے اوپر بے حد بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے وہ دن تو یوں ہی گذار دیا۔اور اس سے اگلے دن میں ٹوکیو سے فیوجی کے راستے روانہ ہوگئی۔ مجھے الوداع کہنے میرے شوہر اور تیسرا بیٹا آئے تھے اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کریں گے۔اس کا انحصار اماں کی حالت پر تھا۔ بوکھلاہٹ اور پریشانی کے پیش نظر خوش قسمتی سے مجھے ایکسپریس کا ٹکٹ ایک دن پہلے ہی مل گیا تھا۔ورنہ تو خواہ

میں روانگی میں کتنی ہی جلدی کرتی لیکن عام گاڑی سے جلدی پہنچ نہیں سکتی تھی اور رات کو کسی جگہ ٹھہرنا بھی پڑ جاتا۔شی مونوسیکی کے اسٹیشن پر مجھے میوراؤ میرے چھوٹے بھائی کا برانچ اسٹور منیجر ملا۔جو کوکارا سے میرے استقبال کے لئے آیا تھا۔

''میں جانتا ہوں آپ کتنی پریشان ہوں گی۔''

وہ مجھے ان نوجوان تربیت یافتہ لوگوں کی مخصوص شائستگی اور دردمندانہ انداز میں ملا، جو ایسے نوجوانوں کو شروع ہی سے سکھائی جاتی ہے۔ جیسے ہی اس نے مجھے پہچانا اور آگے بڑھ کر انتہائی مودب شائستگی سے ہمدردی کے الفاظ کہے تو میں نے فوراً سوال کیا''کوئی فون، کوئی نئی اطلاع، تازہ ترین حالت کے بارے میں۔''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں۔''

یہ سن کر میں نے سوچا کہ اگر اماں کی حالت ایک حال پر قائم ہوجائے تو پھر میں دوسری ہی گاڑی سے واپس آجاؤں گی۔ یہ بات تو میں نے گھر سے قدم نکالتے ہی سوچ لی تھی۔ میوراؤ میرا سوٹ کیس اٹھا کر میرے پیچھے آرہا تھا اور میں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گھاٹ کی لہروں پر ڈولتی کشتی کی طرح ہل رہی تھی۔ یہاں سے ہمیں ایک بھیڑ میں دھکیل دیا گیا جہاں رنگ رنگ اور قسم قسم کے مسافروں کی ایک بھیڑ تھی۔ مثلاً ایک کورین خاتون سفید چکوری میں ملبوس رضائی میں لپٹے بچے کو اپنی پیٹھ پر باندھے سفر کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ میں بھی اماں کے پاس آتی۔ میوراؤ میری پزیرائی کو موجود ہوتا۔ کیونکہ میرا چھوٹا بھائی مجھے ہیویا اس سے اگلے پڑاؤ پر ملا کرتا تھا۔ اور یہاں سے پسنجر گاڑی چھک چھک کرتی رنسان چلتی ہر ہر اسٹیشن پر ٹھہرتی۔ دھیرے دھیرے قصبے میں داخل ہوتی۔ ان مسافروں کو لئے، ان کے ٹھکانوں تک اتارتی، جنہیں شاید گرم موسم ہی میں ملاقاتوں کا خیال آتا ہوگا۔ میں نے دل ہی دل میں یہ طے کرلیا تھا کہ اگر میرا بھائی مجھے لینے اسٹیشن پر آیا ہوا ہوگا تو یقیناً اماں کی حالت بہتر ہوگئی۔ ورنہ تو وہ ان کی پلنگ کی پٹی چھوڑ کر آنے والا نہیں۔ ٹرین اسٹیشن میں داخل ہوئی تو یوں لگ رہا تھا کہ گویا گہری نیلی خلیج جس میں ارغوانی رنگ نمایاں ہورہا تھا۔ پلیٹ فارم کے ساتھ ساتھ گھومتی ہوئی بائیں طرف کو مڑ گئی ہے۔ ساتھ سفید سفید بھاپ کے مرغولوں میں دھندلائے ہوئے دامن کوہ اور ڈھلانوں کا منظر۔ کھڑکی کے شیشے کے پیچھے سے ہی میری نظر اس کی نظروں سے چار ہوئیں۔ وہ میری کھڑکی کے عین مقابل کھڑا تھا اور گاڑی رکتے ہی ڈبے میں چڑھ آیا۔ اب وہ میری سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھا تفصیل سے اماں

کی حالت بتا رہا تھا۔

اس نے کہا: مجھے اس وقت محسوس ہو رہا کہ میں بلاضرورت یہاں آیا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ کچھ باتیں آپ کو سمجھا دوں۔ میرا خیال ہے آپ جلد واپسی کا کیجئے گا۔''

''ہاں میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اس سفر کو آنے اور جانے ہی تک محدود رکھوں۔''

''اچھا ہاں باجی۔ ہم نے یہ طے کیا ہے کہ آپ کی آمد کا یہ سبب اماں پر ظاہر نہ ہو کہ آپ ان کی تشویش ناک حالت کا سن کر آئی ہیں۔ اس سے ان کو یہ محسوس ہوگا کہ شاید ان کی حالت بہت ہی نازک ہے۔ بلکہ ان پر یہ ظاہر کیا جائے کہ آپ کو ان کی بیماری کا علم ہی نہیں۔ اور آپ تو اپنے بیٹے سے ملنے فیوکوکا ویسے ہی آ گئی ہیں۔ اور معلوم ہے میں نے ان سے کیا بات بنائی ہے۔ میں نے ان دنوں یہاں اچانک ہی پہنچا ہوں۔ اور شکر ہے کہ انہوں نے اس بہانے پر یقین کر لیا ہے۔''

اس کی بات سن کر میں نے شال سے ڈھکا ہوا اپنا سر ہلا دیا۔

اماں چھوٹے بھائی کی سویا سوس والی دکان کے ایک حصہ ہی میں بیمار پڑی تھی۔ وہیں ان کا بستر لگا ہوا تھا۔ دکان کے مقابل جو تنگ گلی تھی، مکان کا اصل اور مرکزی حصہ وہاں ہی تھا۔ مکان کیا تھا۔ اس علاقہ کا ایک قلعہ تھا۔ مقامی لوگوں میں یہ اماں کی حویلی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے ساتھ ہی شراب والی دکان تھی۔ حویلی کے مرکزی حصہ میں بڑے بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم تھے۔ اور جن دنوں چھوٹے بھائی نے حویلی کی رہائش ترک کر کے سامنے والی سویا سوس کی دکان میں سکونت اختیار کی ان ہی دنوں میرے تایا کے سب سے بڑے بیٹے بھی سامنے والی دکان کی رہائش ترک کر کے آ گئے تھے۔ اب تو دونوں میاں بیوی کو مرے بھی عرصہ ہو گیا۔ ان کا وارث جو دراصل ان کی اولاد نہ تھا سینے کے مرض میں مبتلا ہو کر ایک مختصر سے ولا میں رہنے لگا۔ اپنا سارا کاروبار یعنی اسٹور اور شراب خانے کی بھٹی کچھ ملازموں پر چھوڑ رکھی تھی۔ اور اب اماں اپنی ضعیفی کے باوجود اس دکان کو اپنی حد بھر چلا رہی تھیں۔ اور اسی پر ان کی گذر اوقات ہو رہی تھی۔ ہم سب نے لاکھ سر مارے اور ان کو چھوٹے بھائی کے ساتھ رہنے پر راضی کرنے کی کوششیں کیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ ہاں البتہ رات کا کھانا وہ بھائی کے ساتھ ہی کھایا کرتی تھیں۔ شام کے وقت وہ خوشی خوشی اپنے پوتے پوتیوں کے درمیان بیٹھ کر کھانا کھاتیں۔ اور جیسے ہی کھانا ختم کر کے وہ اپنی چاپس اسٹک ہاتھ سے رکھتیں اپنا پائپ نکال لیتیں جس کی منہال پر چاندی چڑھی تھی۔

دو چار کش لگانے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوتیں اور کہتیں ''اچھا بھئی اب ہم چلے؟'' وہ اٹھنے لگتیں تو میری بھابی سوکو کہتی ''کیوں اماں نہانے کے بارے میں کیا خیال ہے یا پھر کچھ اور خدمت؟ حمام تیار کر دوں؟''

''ارے نہیں حمام تو حویلی میں بھی گرم ہے، بالکل تیار۔''

یہ کہتے کہتے وہ اٹھ کر چل دیتیں۔ اماں اگر شروع ہی سے تیز طرار اور بدزبان ہوتیں تو بات بہت مختلف ہوتی۔ لیکن ان کا تو یہ تھا کہ جب سے انہوں نے اپنے کاروباری معاملات اپنے شوہر اور مینجر کو سونپے تھے۔ اس دن سے بے انتہا فراغت اور فرصت سے زندگی گذار رہی تھیں۔ اور ان کا ایمان یہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کے کاموں میں دخل نہیں دینا چاہئے۔

جہاں تک شراب کی دکان چلانے اور وہاں رہنے کا تعلق ہے۔ اس کا کوئی خاص مقصد نہیں بلکہ وہ اپنے خاندان کی پرستار اور عاشق تھیں اور یہ کہ وہ اس زندگی کے مخصوص ڈھرے کو قائم رکھنے پر مصر تھیں جس کو بدلنا کسی کے بس کی بات نہ تھی چنانچہ اگر وہ اپنی نجی زندگی میں اولاد کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھیں تو ہم نے بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن وہ ان کی خیر خبر رکھتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ اگر رات برات خدا نہ کرے کچھ ہو جائے تو رات گذر جائے اور صبح پتہ چلے۔ اماں کو بالکل ہی تنہا نہیں چھوڑا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھی عورت جس کا نام اوتانے تھا، ہمہ وقت رہتی تھی۔ اس کی عمر ستر سال تھی۔ اس کے کوئی اولاد ہوئی نہ تھی۔ اپنی شادی کے وقت وہ شہر کے اندرونی حصہ میں رہتی تھی۔ پھر اس کو طلاق ملی تو اس نے ایک اونچے گھرانے کی حویلی میں ملازمت کر لی تھی اور اب وہ ہماری والدہ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اگر یہ بھی کہا جائے کہ وہ تو اب سائے کی طرح ان کے دم کے ساتھ لگی رہتی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اوتانے کے علاوہ ہماری بڑی بھابی سوتیلے بھائی جو اماں کے مینجر کے فرائض انجام دیتے تھے، وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے یہ دونوں بھی لاولد تھے۔ بہر حال یہ سب کے سب اماں کے گھر کے مکین تھے۔

موسم سرما میں اماں زیادہ سے زیادہ وقت سامنے والی دکان میں گذارا کرتی تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں یہاں بیئر کشید کی جاتی تھی۔ اور شراب کشید کرنے کا کام شدید سردی میں شروع ہوتا اور پورے تین مہینوں میں جاری رہتا۔ اماں اس تقریب کو بڑی اہمیت دیتی تھیں۔ بالکل مذہبی رسوم کی طرح اس کو تقریب کے طور پر منانے پر عادی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود اکثر ان کو دکان چھوڑ کر بڑی حویلی میں جا کر بیٹھنا پڑتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شراب کی بھٹی والے کمرے بڑی

حویلی کے کشادہ کمروں کے مقابلے میں تنگ تھے اور شراب کی کشید کے زمانے میں قدرے گرم ہوجاتے تھے۔ اور گرمی اور گھٹن سے نجات پانے کے خیال سے اٹھ کر وہ بڑی حویلی میں جا بیٹھتی تھیں۔ بڑی حویلی اپنے چمکتے ہوئے سیاہ ستونوں کی وجہ سے دیکھنے میں کسی مقبرے کی طرح لگتی تھی۔

جب اماں کو دل کے عضلات سکڑنے کی وجہ سے پہلا دورہ پڑا تو میرے بھائی بھاوج ان کو اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے مجھے یہی بتایا۔ اور پھر حالیہ دورہ اچانک ہی پڑ گیا۔ اس وقت وہ بالائی منزل کے آفتابی کمرے میں تھیں۔ مغربی طرز پر بنا ہوا یہ دھوپ کمرہ خوب روشن اور کشادہ تھا۔ اس کے تین جانب کشادہ دریچے تھے اور داخلی دروازہ احاطے کی جانب کھلتا تھا۔ کمرے کے کاغذی دروازے کو سرکا کر اندر داخل ہوتے ہوئے میں نے مصنوعی تعجب سے کہا ''ارے اماں یہ کیا؟ سنا ہے آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں کیا بات ہوگئی؟''

جاپانی طرز پر دس چٹائیوں کے فرش سے آراستہ کمرا دروازہ کھلتے ہی روشن اور چمکیلی دھوپ سے بھر گیا۔ چٹائیوں کے ابھرے ہوئے بستر پر وہ چت لیٹی تھیں۔ بھوری اور زرد دھاریوں والے مخملی لحاف کا حاشیہ ان کی ٹھوڑی تک آیا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اماں خوش ہوگئیں اور مسکراتے ہوئے پوچھا

''فیوکو کا میں وہ دونوں خیریت سے تو ہیں؟''

بجائے اپنی بیماری کے بارے میں کچھ کہنے کے وہ ان کی خیر خبر پوچھ رہی تھیں۔ اس خیال سے کہ وہ اپنے نواسے اور نواسی بہو سے حد درجے محبت کرتی ہیں، میرا دل دکھ گیا اور یہ جی نہ چاہا کہ ان کو اسی مغالطے میں رکھوں کہ میں ان کی علالت کے بارے میں قطعی انجان ہوں ان کے سوال کا جواب سرسری طور پر دے کر میں براہ راست ان کی بیماری کی طرف آ گئی۔ اور میں نے ان کو بتایا کہ مجھے تو آپ بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی ہیں۔ ذرا بھی فرق نہیں محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ ان کے چہرے کا گورا چٹا رنگ تھا جس میں میں نے بچپن سے لے کر اب تک کبھی سرخی کی جھلک دیکھی نہ ہی کبھی ان کا بھرا بھرا چہرہ میری یاد میں موجود تھا، ہاں عمر کے ساتھ ساتھ گورے رنگ میں ہاتھی دانت کی سفیدی آتی گئی، نہ ہی ان کے رخساروں پر بڑھاپے کا اثر ہوا بلکہ عمر آنے کے ساتھ چہرے کی توانائی اور تازگی میں اضافہ ہی محسوس ہوا۔ چنانچہ اس شدید دورے کی حالت میں بھی بیماری کے آثار چہرے پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا اس

مغربی طرز کے کمرے میں سردی کا موسم گذارنے کا یہ فائدہ ہوا کہ اس دوران ایک بار بھی انہیں زکام نہ ہوا۔ البتہ صبح سے شام تک دھوپ میں بیٹھ کر چہرے پر جھائیاں پڑگئی ہیں۔ انہوں نے اپنی پیشانی کو تھپتھپاتے ہوئے جھینپ کر کہا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دی۔ اس عمر میں بھی ان کو اپنے دکھاوے اور رکھ رکھاؤ کا اتنا خیال ہے۔ وہ تو اپنی جوانی کے زمانے میں اس معاملے میں بڑی محتاط اور حساس تھیں۔

''ارے اماں اوتانے نہیں نظر آرہی ہے؟''

''بھئی ویسے تو وہ بالکل ہٹی کٹی ہے لیکن بہری پٹ ہوگئی ہے اور میرے لئے چلائے اور گلا پھاڑے بغیر اس سے بات کرنا ممکن نہیں رہا۔''

''کیا بالکل ہی چوپٹ ہوگئی ہے۔''

تو اور کیا بالکل ہی بہری ہوگئی ہے۔ اماں گلا پھاڑ کر بولنے کے لئے مخصوص جاپانی لفظ ادا کرتی تھیں جو ابھی تک کائی یوشو کے علاقے میں رائج تھا............ میں نے تصور ہی تصور میں دو بوڑھی خواتین کو باتیں کرتے دیکھا کہ اماں گلا پھاڑ کر چلا چلا کر اس سے کچھ کہہ رہی ہیں اور اوتانے اپنا کان ان کے منہ سے لگا کر سننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس تصور میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اور پھر مجھے یاد آیا کہ اگرچہ عمر میں اماں اوتین سے بڑی تھیں لیکن نہ تو ان کا کوئی دانت ٹوٹا نہ ہی ان کی سماعت میں فرق آیا تھا۔ اور نظر تو ایسی تھی کہ وہ اپنے پوتا پوتی کی جرابیں خود ہی رفو کرتی تھیں۔ ویسے ان کی عام صحت بھی نارمل ہی تھی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو اب تک یقین ہی نہیں آرہا تھا، کہ اچانک ہی ان کا یہ حال ہو جائے گا۔ اور اس وقت ان کے بستر کے قریب بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے ہوئے یہی احساس ہو رہا تھا جیسے کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں اپنے معمول کے مطابق میکے آئی ہوئی ہوں۔

لیکن اسی سہ پہر کو ان پر ایک اور حملہ ہوا۔ ان کے چاروں طرف ہم سب موجود تھے۔ کوئی ان کی پیٹھ سہلا رہا تھا، کوئی پیر مل رہا تھا۔ درد سے بے تاب ہو کر وہ کراہ رہی تھیں۔ شدت کرب سے انہوں نے دانت بھینچ لئے تھے۔ اور ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے کی بوندیں ماتھے سے ٹپک رہی تھی۔ ان کی ستواں ناک سوج رہی تھی۔ اس دوران نرس نے ان کے دائیں بازو میں انجکشن لگایا۔ تقریباً چوتھائی گھنٹہ بعد ان کی تکلیف رفتہ رفتہ رفع ہوگئی۔ مجھے تو سہلانے اور دبانے کا ذرا بھی ڈھب نہ تھا۔ اور مجھے یہ خبر بھی نہ تھی کہ میں ان کو دباتی رہی تھی یا تھپتھپاتی رہی۔ سب ہی اپنی

جیسی کر رہے تھے۔لیکن میری بھابی بسو کو اس کام میں طاق تھیں اور اماں کو تکلیف کے وقت وہی سنبھالتی تھیں۔جیسے ہی ان پر دورے کا حملہ ہوتا، وہ ان کی پیٹھ پکڑ کر بیٹھ جاتیں۔گرم کپڑے مثلاً لحاف وغیرہ ہٹا کر دبانا شروع کرتیں۔وہ ان کی پیٹھ کے کھم کو پکڑ کر دونوں ہاتھوں سے دباتی تھیں۔خیر مجھے تو یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ کھم ہے کس طرف کو۔لیکن نرس تک اس طرح نہیں دبا سکتی تھی۔اماں جھنجھلا جھنجھلا کر اس کو جھڑکتیں ''زور سے ارے اور زور سے دباؤ۔'' عام طور پر وہ کبھی اونچی آواز سے بات نہ کرتی تھیں اور اس وقت یہی دکھ ہو رہا تھا کہ نہ معلوم کتنی شدید تکلیف ہے جو اس طرح چیخ پڑی ہیں۔

دورے کی حالت ختم ہوتے ہی وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئیں۔وہ نہ صرف مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں بلکہ ان کی بھوک بھی چمک گئی۔انہوں نے تین پیالے چاول ہلکی پھلکی غذا کے ساتھ کھائے جن میں کچی مچھلی، سیخ پر سینکی ہوئی مچھلی اور سویا ساس کے ساتھ پکی ہوئی دوسری چیزیں بھی بڑی خواہش سے کھائیں۔

ان کی تازہ کیفیت دیکھتے ہوئے میں نے کہا کہ ''ایسا لگتا ہے اب اگر مزید دورہ نہ پڑے تو وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔''

''ہاں باجی یہی بات ہے اور خدا سے دعا ہے کہ ہم ان کے دورے پر قابو پالیں۔تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''بسو کو تم اتنا اچھا دباتی ہو۔لیکن تم پر بہت بوجھ پڑ جائے گا۔اکیلی کہاں تک کرو گی اور آدھی آدھی رات کو اٹھ کر دباؤ گی۔''

''آج رات کے لئے ایک اور نرس کا انتظام کیا ہے۔اس طرح دو تین لوگ مل کر دیکھ بھال کر لیں گے۔''

ان کی شدید تکلیف کے دو تین دن کے بعد میری اور بھابی کی بات چیت ہوئی۔اب مجھے بھی ان کی حالت کی عادت ہو چلی تھی۔دن کو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آتی تھیں۔رات کو رہ رہ کر درد اٹھتا تھا۔شدید درد کی لہریں سی اٹھتی تھیں............درد کی شدت میں صبح ہوتے کمی ہوتی تو ان کی آنکھ لگ جاتی۔ایسی راتوں کے بعد صبح ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے ان کا خون نچوڑ لیا۔اور اب تو وہ رفع حاجت کے لئے بیڈ پین استعمال کرنے لگتی تھیں۔اور اس سے انہوں نے حتیٰ الامکان گریز کیا تھا۔ان کے تین معالجوں میں سے ایک کا یہ خیال تھا کہ عضلات کے سکڑنے کا سبب

شریانوں کا پھیلاؤ ہے۔ دوسرا بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔لیکن ان کے اصل ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ گردے سکڑ کرنا کارہ ہوگئے ہیں۔ اس لئے پیشاب میں رکاوٹ ہوتی ہے اور یہی اس عضلاتی تکلیف کا اصل سبب ہے۔ چونکہ ان کے اندر کافی غذائیت جاتی رہتی ہے۔ اس لئے موجودہ حالت میں کسی فوری زیادتی یا تغیر کا امکان متوقع نہیں۔ البتہ اگر یہ سردی کھا گئیں یا زکام ہوگیا تو بے شک خطرناک ہوسکتا ہے۔ بہر کیف چونکہ ان کی عمر اسی برس سے تجاوز کر چکی ہے اس لئے مکمل صحت یابی کا تو امکان ہی نہیں۔ ان کی رائے پر بھی وہ دونوں ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

جیسا کہ اماں کو توقع تھی اب لوگ جوق در جوق عیادت کے لئے آنے لگے تھے۔ مزاج پرسی کرنے والے باری باری آتے رہے۔ سب سے پہلے تو اپنے گاؤں سے اوتانے بھاگی بھاگی آئی

''ارے میری اوتسو تو تم بھی آئی ہو۔ ہم دونوں نے کتنی مدت کے بعد ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔'' وہ ہمیشہ میرے بچپن کے پیار کے نام اوتسو سے ہی پیا کرتی تھی۔ پھر اماں کے بستر کے قریب بیٹھ کر ان سے مخاطب ہوئی۔ ''ارے بی بی! میں تو سن کر حیران رہ گئی کہ آپ بیمار ہوگئیں مگر خیر، بیٹی کے آجانے کی خوشی بھی تو ہوئی ہوگی۔ اوتسو کتنے دن بعد گھر آئی ہے۔''

''بھئی اوتسو اتنی دور رہتی ہے کہ روز روز تو آ ہی نہیں سکتی۔ بس ایسے ہی موقعوں پر آنا ہوتا ہے۔''

قریبی عزیزی اور احباب کو بھی ان کے کمرے ہی میں ان کے پاس لے جاتے تھے۔ اماں ان کے قرب اور رفاقت سے بہت لطف اندوز ہوا کرتی تھیں مگر اس وقت تک جب تک درد کا دورہ نہ پڑتا۔ ایک اور بات یہ تھی کہ ہر آنے جانے والا اوتین کو دیکھ کر خوش ہوتا تو ان سے بات کرنے کے لئے سب ہی کو اونچی آواز میں چلا چلا کر بولنا پڑتا۔ اس طرح کمرے میں بڑی گھما گھمی اور رونق سی ہوجاتی۔ ایسے موقعوں پر اوتین کی عمر کا مسئلہ ایک ایسا مزاحیہ موضوع تھا جو مستقل مذاق کا موضوع بنا ہوا تھا۔

وہ اپنی عمر کچھ اس طرح بتاتی تھیں۔ ''میں جب اٹھارہ سال کی تھی تو یہ ستائیس سال کی تھی۔''

اپنی عمر کا حساب وہ اس طرح کرتیں کہ ہمیشہ اپنی اور اماں کی پچھلی عمر کے سالوں کو جوڑتیں اور موجودہ عمر کو گول ہی کر جاتی۔ چنانچہ اب وہ اماں سے یہی بولیں ''اے بی بی! آپ کی عمر تو ایک

جگہ ٹھٹک کر رہ گئی آگے بڑھنا ہی بھول گی۔ کیوں میں نے جھوٹ نہیں کہا؟''

ہتسو کو کی اور اوتانے کی چھیڑ خانی چلتی تھی بڑی بے تکلفی تھی۔ دونوں میں ہتسو کو جھٹ فقرہ کستیں'' اور ہاں تمہاری عمر بھی کہ آگے آگے بھاگی ہی چلی گئی اور اوتین تو اس کو روک بھی نہ سکیں۔''

''اے کیا کہہ رہی ہو۔'' اوتین جھٹ اپنا کان ہتسو کو کے منہ سے بھڑا کر بیٹھ جاتیں اور دانت نکالنا شروع کر دیتیں۔ ہنستیں تو منہ کے آس پاس کی جھریاں سکڑ کر تہہ در تہہ نظر آنے لگتیں۔ اپنی جوانی میں اوتین بڑی خوبصورت رہی تھی۔ اس کے علاوہ اولاد ان کے ہوئی نہیں۔ جس کی وجہ سے بالکل ٹانٹھی تھیں۔ ایک دو سال کیا اپنی عمر سے چھ سات سال کم لگتی تھیں۔ جتنی چاہے اپنی عمر بتائیں وہ ان پر کھپ جاتی تھی اور اماں کا یہ تھا کہ اس حوالے سے اماں کی عمر کا بھی پتہ نہ چلتا تھا۔

''اماں تو میرا خیال ہے چوراسی سال کی ہوگئیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں باجی کہاں، ابھی تو تراسی (83) ہی سال کی ہیں۔'' بھائی کی بات پر میں مڑ کر دیکھنے لگی۔

ہتسو کو کا کہنا تھا کہ اماں ان کے ابا سے چھ سال چھوٹی ہیں۔ ہتسو کو کے ابا کا انتقال ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی تو ہوا تھا۔ اور اٹھاسی سال کے تھے۔

''اس حساب سے تو اماں ابھی بیاسی برس کی ہیں۔'' میں نے کہا۔

ارے بھئی بہر حال اوتین جب اٹھارہ سال کی تھیں تو اماں ستائیس برس کی تھیں۔ لہٰذا......

''اوفوہ! پھر وہی ریاضی چل پڑی عمروں کا حساب کتاب۔'' میرا منجھلا بیٹا اتسوشی اور اس کی بیوی بھی ایک سہ پہر کو آ پہنچے۔ عیادت کے لئے آنے جانے والوں کی گہما گہمی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اماں کو یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اماں اپنے نواسے کی دلہن کی چھب اور زیبائش کو دیکھ کر کتنی خوش نظر آ رہی تھیں۔ اپنے علاقے کی بولی کا وہ خاص لفظ ''موزوراشی ای نا'' ان کے منہ سے بے ساختہ طور پر نکلا جس کا مطلب کومل اور پیاری ہوتا ہے۔ ارے یہ تو مورت ہے مورت کسی تصوری سے زیادہ پیارے نین نقش ہیں اس کے تو۔ انہوں نے اسی موسم بہار میں شادی کی تھی اور یہاں پہلی مرتبہ آئے تھے۔ شادی کے بعد یہ پہلی عیادت بھی تھی جو انہوں نے کسی بیمار کے پاس بیٹھ کر کی تھی۔ اوتین کی اس موقع پر خوشی دیکھنے والی تھی۔ خوشی سے پھولی نہ سما رہی

تھی۔ اپنے مخصوص خاد ماؤں والے انداز اور دیہاتی لفظوں اور ٹو کیو والوں کی ملی جلی زبان میں وہ نئی دلہن کو سراہ رہی تھی۔ پھر انہوں نے خالص اپنے گاؤں کی بولی میں مجھ سے سرگوشیوں میں کہنا شروع کیا۔

''او تسو بیگم سچ ہی تو کہتی ہیں یہ تو کومل سی نازک سی مورت ہے مورت۔ سچی بات یہ ہے وہ شادی والی تصویر میں مغربی طرز کے سفید گاؤن میں خوبصورت تو لگ رہی تھی مگر ایسی نہیں۔ جیسی آج لگ رہی ہے۔ اس مغربی لباس میں اچھی تو لگ رہی تھی مگر ہمیں تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ ہم سے بھی بلند اور اونچی ہے۔ اور اس کے تو قریب جانے کی بھی ہمت نہ ہو ہم جیسوں کی تو، اور اب جب سامنے آ کر پاس بیٹھی ہے تو بالکل ہی مختلف لگ رہی ہے واقعی دلکش اور بہت پیاری اور دیکھو تو مسکراتی کتنی پیاری طرح ہے۔ بڑی ہنس مکھ ہے۔ اپنی پہلی پہلی بہو کو دیکھ کر تمہارا ابھی جی کتنا خوش ہوتا ہوگا۔''

خیر اس شام اور اس سے اگلے دن تک درد کا شدید دورہ پڑا۔ سب پریشان ہو گئے۔ خصوصاً نو بیاہتا جوڑا تو سراسیمہ ہو گیا۔ وہ کل والا ماحول ہی آج بدل گیا۔ تھا۔ کل وہ مزے مزے سے بیٹھے نانی جان کو اپنی سیر وتفریح کے بارے میں بتاتے رہے تھے انہوں نے ان کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ خاندانی قبرستان گئے تھے۔ بڑی حویلی اور شراب کی دکان ابھی جا کر نہ دیکھی اور ہاں سمندر کے دہانے پر بندرگاہ کے قریب والے جزیرے پر سویا ساس تیار کرنے والی جو فیکٹری ہے، وہ بھی دیکھی، اتنا مزا آیا اور اب وہیں سے سیدھے آج دوپہر ہی کی گاڑی سے آئے ہیں۔

''اچھا جا رہے ہو اس وقت اتنی جلدی؟''

اماں نے جو اس وقت بے حد کمزور اور درماندہ نظر آ رہی تھیں، دونوں میاں بیوی سے تعجب سے پوچھا جو ان سے رخصت ہونے آیا تھا۔ وہ دونوں ان کے قریب دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک سوٹ میں تھا اور دوسری گہرے براؤن رنگ والے شام کے جوڑے میں تھی۔ میں نے جلدی سے مداخلت کی ''اماں کل اس کا لیکچر ہے۔''

''ہاں بالکل۔ لیکچر نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ارے یہ تو تمہاری محبت جو اتنی دور سے ملنے آ گئے۔''

اماں کی آنکھیں بھیگ گئیں اور ان سے پانی کے دو شفاف قطرے ڈھلک آئے۔ میں نے ان کی آنکھ سے آنسو گرتے کبھی نہ دیکھا یہ پہلی مرتبہ تھا کہ میں نے ان کی آنکھ سے آنسو نکلتے

دیکھے۔ نہیں یہ معلوم یہ آنسو سکون اور آسودگی کے جذبے کے تحت نکلے تھے یا ان کے رخصت ہونے کے رنج کا نتیجہ تھے۔ یا پھر کس خیال کے تحت۔ یہ سوچ کر میری آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اپنے آنسو چھپانے کے خیال سے میں ان کو رخصت کرنے اور خدا حافظ کہنے کے بہانے ان کیساتھ ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اماں کو دورے کے حملے سے پہلے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اب دورہ پڑنے والا ہے۔ پہلے پہل وہ انجکشن کے خیال سے ہی گھبرا جاتی تھیں اور اسی ڈر سے تکلیف کو جس قدر ضبط کر سکتی تھیں، چھپائے رکھتی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ انہوں نے پہلے ہی خود فرمائش کر دی کہ ان کو انجکشن دے دیا جائے۔ پہلے وہ اپنی پیٹھ اور کمر دبواتی تھیں، مگر اس بار انہوں نے سینے میں درد کی شکایت کی۔ میں ان کے کمزور سینے اور پسلیوں کو سونتتی رہی۔ اور طرح طرح کے جذبے اور خیال ذہن میں امنڈتے رہے۔ ایک مرتبہ درد کی شدت ختم ہو جاتی تو وہ ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگتیں۔ بخار بھی نہ رہتا۔ اور تھوڑے وقفے سے کچھ کھا پی بھی لیتی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ ان کے رخساروں کے گڑھے نمایاں تھے۔ جس پر موت کے سائے اشارہ سا کرتے معلوم ہوتے۔

کوئی کوئی موسم بھی بیمار پر بہت بھاری پڑتا ہے۔ ان دنوں بھی موسم کا یہی حال تھا کہ گھڑی گھڑی بدلتا تھا۔ جب میں ٹوکیو سے روانہ ہوئی تو موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکا سا پتلا کوٹ بھی بہت ناگوار لگ رہا تھا۔ مجھے کیوشو کے موسم پر حیرت تھی کہ جاڑے کے بھرے موسم کی گرمی تھی۔ پھر موسم پلٹا کچھ سردی چمکی۔ چند ہی دنوں بعد موسم گرم ہونے لگا اور گھر کا احاطہ جو کچھ عرصے پہلے خشک قطعہ زمین کی طرح نظر آتا تھا اور قصباتی گھروں کی طرح سیاہ لکڑی کی چار دیواری سے گھرا ہوا تھا اس میں کھڑا ہوا مگنولیا کا جو بلند و بالا اور تندور درخت احاطے کے ایک گوشہ میں کھڑا تھا، اب سفید سفید شگوفوں سے لد گیا تھا، اس کو دیکھ کر عجیب خیال آتا۔ لگتا تھا کہ سانگ خاندان کے زمانے کی چینی کی سفید سفید پیالیاں ڈال ڈال پر لٹکی ہوئی ہیں۔

ان ہی دنوں کی بات ہے کہ نچلی منزل میں میرا چھوٹا بھائی، بھاوج اور میں ڈرائنگ روم میں جس کی کھڑکی سے مگنولیا کے شگوفے بالکل صاف طور پر دیکھ جا سکتے تھے، بیٹھے ہوئے ایک خاندانی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ بات یہ تھی کہ بھائی کی سب سے بڑی بیٹی ایکیکو کی شادی طے ہو چکی تھی۔ شادی کی تاریخ اگلے مہینے کی اکتیس مقرر ہوئی تھی۔ اور ایکیکو اور اس کے والدین کو شادی کے لئے ٹوکیو جانا تھا۔ اب اگر خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو پھر شادی کا سوال ہی نہیں پیدا

ہوتا۔لیکن اگر اماں کی ایسی ہی نازک حالت چلتی رہی تو پھر تو ان کو اکیکو کو شادی کے لئے ٹوکیو بھیجنا ہی پڑے گا۔اور اس کے والدین کے بجائے کسی کو تو شادی کے انتظامات کے لئے اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔اب یہ کام تو مجھ ہی کو کرنا ہوگا اور اس صورت میں مجھے جلد ہی ٹوکیو پہنچنا تھا۔ ایک بھی دن کی تاخیر کئے بغیر۔ جہاں تک مریضہ کا تعلق تھا وہ ظاہر تھا کہ پوتی کی شادی پر ان سے زیادہ خوش ہونے والا کون ہوسکتا تھا۔ وہ یہ سن کر مجھے بالکل رکنے پر مجبور نہ کریں گے۔لیکن اس خیال سے کہ مبادا یہ میری ان سے آخری ملاقات ہو میں جاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی اور کئی دن بغیر دورے کے گذرنے لگے۔ موسم ابھی تک خوشگوار ہی تھا۔ اماں اسکرین والے دروازے کی طرف کروٹ سے لیٹتی رہی تھیں۔ جس کے آر پار دھوپ چمکتی تھی اور بعض اوقات دھوپ کے تمازت بڑھ جاتی۔ سورج کی یہ رخشندہ تمازت زندگی کے لئے ایک خوشگوار اور حیات بخش بن جاتی تھی۔ خصوصاً بیماروں اور بوڑھے لوگوں کے لئے بہار کا نرم اور گرم حیات آفریں موسم شفا کی نوید بن کر آتا ہے۔ حالیہ چیک اپ کے بعد اس بار بھی ڈاکٹروں کی یہی رائے تھی کہ اگر نمونیہ یا بدہضمی کا حملہ نہ ہو گیا، تو ان کی موجودہ حالت میں فوری تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

میں جانے پر تیار تو ہو گئی لیکن اس کے باوجود یہ حوصلہ نہ تھا کہ ان سے اپنے جانے کا سبب بیان کروں۔ چنانچہ ایک بار پھر غیوکو کا والا بہانہ بنانا پڑا۔اب ایک نیا قصہ گھڑا کہ یونیورسٹی سے متعلق ایک مسئلہ آن پڑا ہے اور وہاں میری موجودگی ضروری ہے............ میں چند دن کے لئے فیوکوکا جا رہی ہوں۔اور جلد ہی واپس آجاؤں گی۔اماں کا یہ تھا کہ وہ تندرستی کی حالت میں کسی پر بھی شک وشبہ نہ کرتیں تو پھر میری بات پر کیوں نہ اعتبار کرتیں۔ چنانچہ جب میں سفر کے لئے لباس تبدیل کر کے ان سے رخصت کی اجازت طلب کرنے گئی تو بالکل یہی ظاہر کرتی تھی کہ میں نے وہاں جانے کا یہ فیصلہ فوری اور اچانک طور پر کیا ہے۔انہوں نے کہا کہ ''وہاں جاؤ تو دونوں بچوں کو دعا پیار کہنا اور میرے پاس آنے کا شکریہ بھی کہنا......اور ہاں دیکھو جلدی لوٹ آنا اپنا کام ختم کرتے ہی۔''

ہاں............ہاں اماں میں جلدی ہی واپس آؤں گی۔

کسی نے آکر اطلاع دی کہ گاڑی آگئی۔ میں نے اپنے دستانے پہنے اور جب ان کے آگے جھکی تو ظاہر ہے میری نگاہ ان کے لمبوترے چہرے پر تھی۔ زردی مائل سفید چہرہ اور ان کی

خوبصورت ستواں کھڑی ناک، اب تو ان کی بھنویں شادی کے دوسرے ہی دن مونڈ لی تھیں، ہوا یوں تھا کہ سنگھار میز کی ایک دراز میں بلیڈ پڑا مل گیا تھا۔ بس چپکے سے اسی بلیڈ سے بھنویں مونڈ لیں اور وہ جو دانت کالے کرنے کا رواج تھا۔ وہ بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دیا۔ جب میری عمر چودہ یا پندرہ سال کی تھی اس وقت انہوں نے مسی لگانا بالکل چھوڑ دی تھی۔ البتہ بھنویں مونڈتی رہیں۔ بہت باریکی اور احتیاط سے۔ اب اس وقت ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو ان کی کھنچی کھنچی کمانی جیسی خوبصورت بھنوؤں کو دیکھ کر ان کے لڑکپن کا خیال آ گیا۔ ساتھ ہی ایک شدید دکھ کا احساس بھی تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان خوبصورت کمان جیسی بھنوؤں پر میری آخری نظر ہو۔ اس خیال سے ہی میں لرز گئی کہ شاید یہی میں اپنی ماں کو آخری بار دیکھ رہی ہوں اور یہ کہ میں دھوکے پر دھوکہ دے رہی ہوں۔ جب آئی تھی تو اپنے آنے کا اصل سبب چھپا کر ایک بہانہ گھڑ لیا اور ان کو اس حال میں چھوڑ کر جا رہی ہوں تو بھی دھوکہ دے کر۔ خیر کم از کم یہ تو ہے کہ فیوکو جانے کی بات بالکل ہی جھوٹ نہ تھی......اگلی صبح اتسوشی اور یاسوکو کے ساتھ بڑی فراغت اور بے فکری سے سرخ چائے اور ٹوسٹ کا ناشتہ کر رہی تھی۔ تو میری نظریں ان کے روشن اور خوبصورت گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں رات دیر سے پہنچی تھی اور اب اس وقت اچھی طرح گھر کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے گھر کی تعریف کرتے ہوئے کہا میں نے جیسا سنا تھا ویسا ہی خوبصورت ہے۔ بات یہ ہے کہ شن آئی چی سال میں دو مرتبہ بیٹے کی یونیورسٹی میں لیکچر دینے آیا کرتے تھے اور وہ اس مرتبہ آئے تو ان کا نیا گھر دیکھ گئے تھے۔ انہوں نے ان کے گھر کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ مجھے بھی اشتیاق تھا اسے دیکھنے کا اور واپسی کے اس سفر کو براستہ فیوکو کاٹے کرنے کا سبب یہی اشتیاق تھا کہ میں ٹوکیو جاتے ہوئے فیوکو میں ٹھہر سکوں۔ گھر اگرچہ مختصر تھا۔ صرف پانچ کمروں پر مشتمل لیکن بے حد خوبصورت اور پر فضا تھا۔ مکان کے چاروں طرف احاطہ تھا جو سنگین جالی دار جنگلے سے گھرا ہوا تھا۔ جنگلے سے لپٹی ہوئی گلاب کی نورستہ بیلیں تھیں جس میں اب پھول آنے ہی والے تھے۔ جلد ہی ان کے گچھے اب جنگلے سے باہر کی طرف لٹک رہے ہوں گے۔ احاطے کے عقبی حصہ میں کہ وہ گلابی شگوفوں سے لد جائیں گے کہ اب ان کی ڈالوں میں لگی ننھی ننھی کلیوں میں گلابی پن نمایاں ہو رہا تھا اور چٹکنے ہی کو تھیں۔ اور سوائٹ پیز کے پھول تو کھل ہی رہے تھے۔ یاسوکو نے بتایا کہ یہ پھول اور اس کے پودے اس نے خود لگائے ہیں۔ میں سمجھ رہی تھی کہ کھانے کی میز پر رکھے شیشے کے گلدان میں جو پھول آراستہ ہیں وہ سرسوں کے پھول ہیں، لیکن پتہ چلا کہ یہ تو شلجم کے پھول ہیں جو باغ

کی پچھلی طرف کاشت کیئے گئے تھے۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ تو مفت برابر ہے تمہارے لئے۔ میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ چرا کر ٹوکیو لے جاؤں اسے۔''

میں نے از راہ تفنن کہا دونوں میاں بیوی میری بات پر ہنس پڑے۔

واقعی اس کا کرایہ بہت کم، نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ کہنے لگے۔

اور ہاں یہ پھول جو آپ دیکھ رہی ہیں یہ ہمیں تحفے میں ملے ہیں۔ پچھلا کرائے دار یہ ہمارے لئے چھوڑ گیا۔ یہ انہی کے لگائے ہوئے پھول ہیں۔ اگر آپ اس وقت دیکھتیں جب گل لالہ کھل رہا تھا............واقعی دیکھنے کے قابل تھا۔

''امی یہ دیکھیں یہ اس طرف سارا گل لالہ ہی ہے۔''

یاسو کو نے سرکنے والا اسکرین دروازہ سرکاتے ہوئے روشن اور خوبصورت ڈرائنگ روم کے باہر کی جانب اشارہ کیا۔ اس جانب کوئی جنگلہ نہیں تھا۔ ایک تنگ گلی سی تھی جو پچھلی طرف کو مڑ گئی تھی۔

گلی کے دوسری جانب گہرے سبز چناروں کی قطار گلی سے آگے بہتے ہوئے چشمہ کے ساتھ چلی گئی تھی اور نالہ بالکل دل میں کھب جانے والا اور مرغزاروں میں بہتے نالوں کی یاد دلاتا تھا......میں نے چناروں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا یہ سارے کے سارے چنار کسی ایک کے تخم ہی کی پیداوار تو ہیں جو ہواؤں کے تند جھونکوں نے لا کر یہاں بکھیر دیئے ہوں گے......اور جب یہ سارے کے سارے سرخ ہوتے ہوں گے میں اندازہ کر سکتی ہوں اس نظارے کا۔

اور ہاں دیکھو اس طرف بھی تو کچھ ہے۔

اس طرف پتلا سا کھلا برآمدہ تھا۔ جس کی چھت کی اولتی تلے پورا راستہ بجری سے ڈھکا ہوا تھا، برآمدے کے کنارے کنارے پنیری پھول رہی تھی۔ للّی کے شاداب غنچے چٹک رہے تھے۔

اتسوتوشی نے کہا

''اے کاش چشمہ کا پانی صاف شفاف ہوتا۔''

اتسوتوشی اب اتنے بھی نہ پھیل جاؤ کہ ہر ایک شے تم کو میسر ہو جائے ذرا یہ بھی تو سوچو کہ تم اس گھر کا کرایہ صرف ایٹس ین دے رہے ہو۔''

اس بات پر ہم سب ہنسنے لگے۔ میں نے کہا بات یہ ہے اگر چہ چھوٹے اور مختصر گھر عام طور

پر اچھے علاقوں میں نہیں ہوا کرتے ہیں۔لیکن میں نے ایسا بھی گھر دیکھا ہے کہ یہ بڑا محل کا محل جس کے ساتھ یہ بڑا پارک بھی ہے، ساتھ ہی چند قدم کے فاصلے پر یہ بڑی کھائی ہے۔ واقعی گھر چھوٹا ہو یا بڑا بات تو گرد و پیش اور ماحول کی ہوتی ہے۔ ہائے، میرا دل چاہتا ہے کہ اگر یہ جگہ اتنی دور نہ ہوتی تو کچھ دن یہاں آ کر پڑھنے کا کام کرتی۔''

آسوتوشی جھٹ بولا

دور ہے تو کیا ہوا۔ آپ ضرور آ کر کچھ دن یہاں رہیں۔ میں تو تمام دن کیمپس ہی میں ہوتی ہوں میرا کمرہ خالی پڑا رہتا ہے، کسی قسم کا ہنگامہ نہیں ہوگا۔ اور ٹوکیو میں تو لکھتے وقت اتنا خلل اور مداخلت ہوتی ہوگی۔ اب یہاں بیٹھ کر اطمینان سے لکھتی رہا کریں گی۔

کاسویو کا تعلق بھی تعلیم یافتہ اور اچھے خاندان سے تھا جس کی پرورش اور پرداخت اسی طرز پر ہوئی تھی جس طرز پر اس کا شوہر پلا بڑھا تھا......اگر چہ وہ بڑی سادگی سے رہ رہے تھے، گھر میں ایک ملازمہ تک تو تھی نہیں، لیکن وہ بڑی آسودگی اور لطف سے بسر کر رہے تھے اور ہر شے کی کمی اور خلا کو پودوں اور پھولوں سے پر کر لیتے۔ وہ ایک نئی زندگی کا آغاز بڑی خاموشی اور عزم سے کر رہے تھے۔ ان کے درمیان بیٹھ کر ان کی زندگی کے طور طریقے کو دیکھ کر مجھے اپنے پرانے گھر کی زندگی کا خیال آ رہا تھا جس میں مرکز اور محور کا مقام اماں کو حاصل تھا۔

میرے والدین اپنے لئے نہیں اپنے خاندان کے لئے زندہ تھے۔ ان کی زندگی کا ڈھرا ایک مشینری کے اہم پرزوں کا سا تھا کہ کنبے کے نظام کا سارا دارومدار انہی پر تھا۔ اسی طرح خاندان کا سارا کاروبار ان ہی کے دموں سے چل رہا تھا۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا یعنی آج سے پچیس سال پہلے تو اتسوشی میری گود میں تھا، دو سال کا ابھی گھٹنیوں پر چلنا شروع کیا تھا، اور میں جنازے میں شرکت کی غرض سے میکے آئی ہوئی تھی۔ اور آج اسی دو سال کے بچے نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کر کے ایک نئے کنبے کی بنا ڈالی تھی۔ ان کی ایک اور پوتی اور میرے بھائی کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی جس کی وجہ سے مجھے اپنی بیمار ماں کو چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ مجھے ان لوگوں کو دیکھا کر درخت کی نچلی ڈالوں اور نئی کونپلوں کا خیال آ رہا تھا، جو پیڑ کی اونچی پھننگوں پر پھوٹتی ہیں اور درخت کی جڑ سے پھوٹ کر نکلنے والے نئے کلّوں کے خیال کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آ رہا کہ کسی طرح رفتہ رفتہ بوڑھے اور فنا ہوتے ہوئے درخت کی کوکھ سے ابھرتے اور اس کی جگہ لیتے ہیں جو در حقیقت سوکھ رہا ہوتا ہے۔

فیوکوکا میں ایک دن مزید ٹھہرنا پڑ گیا۔اس لئے کہ مجھے سلیپنگ کار کے ٹکٹ کا انتظار تھا کہ مجھے اپنے بھائی کا تار ملا۔انہوں نے اطلاع دی تھی کہ مریضہ کی حالت سنبھل رہی ہے اور بہتر ہوتی جارہی ہے۔

''میرا خیال ہے نانی جان بالکل ٹھیک ہوجائیں گی۔'' میں نے اپنے بیٹے بہو سے کہا تھا اوراس طرح ہم کو فرصت اور فراغت سے باتیں کرنے کا ایک دن اور مل گیا۔میں نے اپنے شوہر اور بیٹے ہیکارو سے بھی اسی امید افزا لہجے میں یہی بات کہی تھی۔

''کہ مجھے یقین ہے کہ اماں اب بالکل ٹھیک ہوجائیں گی۔''

وہ دونوں مجھے ٹوکیو کے اسٹیشن پر لینے کے لئے موجود تھے۔

''لیکن تم تو بری طرح تھک گئی ہوگی۔''انہوں نے کہا تھا۔

''ہاں لیکن ابھی مجھے تھکن محسوس کرنا اور اتارنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے ساتھ لے کر آئی ہوں۔ جسے مجھے ادا کرنا ہے۔''

دراصل اپنے گھر میں تو میں ہر کام سے بری الذمہ رہتی تھی۔اوراس قسم کی بھاگ دوڑ کی بالکل ہی عادی نہ تھی کہ ہر روز صبح اٹھ کر دکان دکان پھرنا شروع کردوں۔پھر خریداروں کا ہجوم۔ دھکم پیل میرے لئے بہت تھکا دینے والا تھا۔بیٹی کی شادی اور تیاری کوئی آسان کام تو نہیں ایک لا متناہی سلسلہ ہے۔جتنے کام کرلو۔اتنے ہی ایک کے بعد ایک نکلتے آتے تھے۔اوپر سے یہ بات کہ خود اپنی تو کوئی بیٹی تھی نہیں۔ایسے کاموں کا کوئی تجربہ بھی نہ تھا۔پھر یہ کہ دولہا میاں، کاسی ہمارے ہی علاقے کے باسی تھے اور اسی موسم بہار میں کالج گریجویشن کرکے فارغ التحصیل رہے تھے۔اوراب وہ اپنے لئے گھر کی تلاش میں سرگرداں تھے اس طرح کام اور بڑھ گیا تھا۔اب حالت یہ تھی کہ تہہ خانے سے لے کر آٹھ منزلہ ڈیپارٹمنٹ اسٹور کے پھیرے کرتے کرتے اور لوبیۓ کے گندھے ہوئے آٹے سے لے کر نمک کے مرتبانوں تک کی خریداری نے مجھے اتنا پست کردیا تھا جتنا جاپان میں الپس کی چوٹی کو سر کرنے کے بعد ہی کوئی ہوسکتا ہے...... چنانچہ میں نے اپنی خادمہ اوسیائی سے اپنی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے التجا کی کہ خدا کے واسطے اب باقی ماندہ کام انجام دینے کی ذمہ داری وہ اپنے سر لے لے۔یا اللہ ایک دلہن کی تیاری جوئے شیر لانے سے کم تو نہیں ہوتی۔

چنانچہ اوسیائی نے بے شمار ہاتھوں الی دیوی بدھستیاوا کی سی مہارت سے چابکدستی

دکھائی۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ کیا کیا کہ کاسی نے جو گھر کرائے پر لیا تھا، وہاں جا کر اس کو نک سک سے سجا کر اس قابل کر دیا کہ دولا دلہن وہاں آرام سے رہ سکیں۔ اب اکیکو بھی ٹوکیو پہنچ گئی تھی اور جیسا کہ میرے بھائی نے پہلے بھی کہلایا تھا کہ اگر اماں کی احلات بہتر ہوگئی تو پھر شادی کے دن ضرور پہنچ جاؤں گا تا کہ کم از کم رسم کی ادائیگی کے وقت باپ تو موجود ہو وہ بھی پہنچ گئے کیونکہ اماں کی طبیعت خاصی بہتر ہوگئی تھی اور بھائی نے بتایا تھا۔

''باجی آپ جیسا چھوڑ کر آئی تھیں اس وقت سے اب وہ بہت بہتر ہوگئی ہیں۔''

''شکر ہے مجھے یقین ہے کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' میں نے ایک بار پھر وہی فقرہ دہرایا۔

اگلے روز میں بھائی کے ساتھ شہر کے بازار کی طرف پیدل گئی تا کہ وہ ان میاں بیوی کے لئے تحائف کی خریداری کریں جن کی وساطت سے یہ شادی طے ہوئی تھی۔ ہم لاکھ کے روغنی کام کی چیزوں کی تلاش میں تھے۔ لیکن اتفاق یہ تھا کہ کوئی بھی چیز ایسی موجود نہ تھی کہ جس کی جوڑ کی چیز بھی مل جائے اور پھر دکاندار نے یہی کہا کہ ہمارے پاس ایک ہی نمونہ ہے اور اس کے جوڑ کی چیز بنانے میں کافی وقت لگے گا ہم کہہ نہیں سکتے البتہ اگر آپ آڈر دے دیں تو ہمارے کاریگر جو اگلے حصہ میں کام کر رہے ہیں، تیار کر دیں گے۔ دکاندار دھڈ ھارسی دکان میں اکیلا ہی تھا اور الماریوں میں بہت کم سامان سجا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہم نے اس سے کہا

'' لگتا ہے آپ لوگ اپنی موروثی دستکاری کے روایتی تسلسل کو برقرار رکھنے کے پھیلانے کے حق میں نہیں۔''

''ارے صاحب ہمارا یہ کام کبھی چمکا نہیں بس مندا ہی مندا چلتا ہے۔ قدیم زمانے میں بھی کبھی بافراط نہیں بنا۔ نوادرات کے طور پر چلتا رہا ہے۔ ہاں اب سنتے ہیں کہ بعض لوگ بڑا پیسہ بنا رہے ہیں اس میں، لیکن خیر ایک دن آئے گا کہ ایسے لوگ بہت پچھتائیں گے۔''

پھر وہ کہنے لگا کہ اب تو اس بید مجنوں کے سائے تلے فٹ پاتھ کی یہ دکان ہی غنیمت لگتی ہے۔ ارے، ہم تو جنگ کے زخم خوردہ لوگ ہیں۔ ہم گنزا سے یہاں آئے ہیں۔

اگلے دن میرا بھائی ابابیل ایکسپریس سے روانہ ہوگیا۔ ہمارے حساب سے رات بھر کے سفر کے بعد جب ٹرین آبنائے سے گذر گئی ہوگی تو عین اسی وقت ایک تار ملا جس میں اماں کی حالت یکا یک بگڑنے کی اطلاع کے ساتھ پوچھا تھا کہ بھائی کس گاڑی میں روانہ ہوئے ہیں۔

ہماری جوابی تار کے ساتھ ہی دوسرا تار موصول ہوا تھا جس میں اس کے گھر پہنچنے اور مریضہ کی نازک حالت سے مطلع کیا گیا تھا۔ اگلے دن میں اکیلی ہی میکے جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ اپنے ضروری کام کے سلسلے میں میرے شوہر کو ایک دن کی تاخیر سے پہنچنا تھا۔ بھاگی بھاگی ٹوکیو اسٹیشن پہنچی تو ٹیکسی سے اتر کر پتہ چلا کہ گھبراہٹ میں اپنا بٹوہ جس میں میرا ٹکٹ اور پیسے تھے ان کو اسٹیشن پر کھڑا چھوڑ کر اسی ٹیکسی میں اپنے گھر واپس آئی جو نیویر میں تھا اور جیسے ہی میں اپنے پھاٹک کے اندر داخل ہورہی تھی، تار والا ڈاکیہ باہر سے اندر جارہا تھا۔ اس کی سرخ بائیسکل دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ اور یوں بٹوہ بھول جانے اور اس کو دوبارہ لانے کے لئے گھر پہنچنے کی وجہ سے مجھے روانہ ہونے سے قبل ہی اماں کی وفات کی اطلاع ملی۔

اماں واپس اپنی حویلی میں آگئی تھیں اور یک اندرونی مہمان خانے میں لیٹی تھیں۔ سفید چادر کے نیچے اپنے اسی لحاف کو اوڑھے ابدی نیند سوئی ہوئی تھیں۔ اور سوگ کی علامت ایک سیاہ کمونوان کے اوپر ڈال دیا گیا تھا۔ میری آمد کے انتظار میں ان کی کسی چیز کو بھی چھیڑا نہیں گیا تھا۔

''اماں میں آگئی ہوں۔''

میں نے اس طرح کہا جیسے وہ زندہ ہوں اور میں ان سے مخاطب ہوں۔ میرے ہونٹ لرز رہے تھے۔ چہرہ گرم گرم آنسوؤں سے تر تھا۔ اور آنسو ان کے بستر پر ٹپک رہے تھے۔ چادر ہٹا کر میں نے ان کا چہرہ دیکھا ویسا کا ویسا ہی تھا جیسے ان سے رخصت ہوتے اور خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے دیکھا تھا۔'' ایسا لگتا تھا کہ ابھی آنکھیں کھول کر کہیں گی، اپنے مخصوص علاقائی لہجہ میں

''آئی اچھا تو تم واپس آگئیں۔''

سب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے فیوکوکا کے بارے میں میرے بہانے پر ذرا بھی شک نہ کیا تھا۔ بار ابر پوچھتی رہتی تھیں۔

''آئی نہیں ابھی تک۔''

یہ سن کر آنسوؤں کی تازہ رو میری آنکھوں میں ابل آئی...... ہائے، میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر گئی ہی کیوں؟ خواہ کوئی وجہ بھی تھی۔ مجھے اس طرح جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ میں نے بستر مرگ پر پڑی ہوئی اپنی اماں کو دھوکا دیا اور جھوٹ بول کر ایک وقتی بہلا وا دیا اور مجھے اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اتنی بیماری کی حالت میں طبیعت کا اچانک سنبھل جانا بیمار کا سنبھالا ہوتا ہے بلکہ میں نے

خود اپنے آپ کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کی اور اس سنبھالے کا غلط مطلب لیتی رہی۔

خاندان کے روایتی رواج اور طریق کے مطابق ہمارے یہاں اندوہناک سے اندوہناک موت بھی ایک ہنگامہ ساتھ لاتی ہے۔ وہی گہما گہمی اور رونق کہ نغمۂ غم بھی نغمۂ شادی کا رنگ پکڑ لیتا ہے۔ اماں کی وفات پر ابا کی فاتحہ اور میت والا کروفر تو نہ تھا کہ ان کی دفعہ تو فرد فرد کے لئے سیکڑوں کی تعداد میں نیچے پایوں والی کشتیوں میں سجا ہوا فاتحہ کا کھانا ایصال ثواب کے لئے رکھا گیا تھا۔ تاہم ابا کی دفعہ والا اہتمام اور آن بان نہ ہونے کے باوجود قدیم خاندانی روایات کے مطابق ایک خاتون خانہ مرگ کی ساری رسومات ادا کی گئیں۔ دور ونزدیک کے عزیز اقربا اپنے اپنے علاقوں سے آکر شریک ہوئے۔ میں اتنی دور رہتی تھی کہ مدت سے کسی بھی عزیز سے رابطہ ہی نہ رہا تھا۔ خصوصاً یہ نئی بیاہی لڑکیاں لڑکے اپنے اپنے شوہروں اور بیویوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ ایک نوعمر لڑکا جو اپنے اسکول کی یونیفارم میں آیا ہوا تھا، اس نے بتایا کہ وہ اپنے والد کی نمائندگی کرنے کے لئے شریک ہوا ہے۔ میں اس کو قطعی نہ جانتی نہ ہی یہ اندازہ کر پا رہی تھی کہ یہ کس کا بیٹا ہے۔ وہ تو یہ کہیے کہ اس کا نام سن کر کچھ اندازہ ہوا تھا کہ یہ کس گھرانے کا بچہ ہے۔ سب سے غیر معمولی بات یہ تھی کہ اماں کی پرانی خادمائیں اور نوکرانیاں جو کبھی کی جا چکی تھیں، ان سب کے پتے معلوم کر کے ان کی سابق مالکن کی وفات کی اطلاع کسی کو خط کے، کسی کو زبانی پیغام اور کسی کو تار کے ذریعہ غرض جس طرح بن پڑا، دے دی گئی تھی۔ غرض وہ گردونواح کے دیہات اور مچھیروں کی بستیوں سے سفر کر کے ان کی آخری رسومات کی شرکت کے لئے پہنچ گئی تھیں۔ غرض کہ بے شمار شمعوں کی روشنیوں اور بخورات سے اٹھتی ہوئی خوشبوؤں کے درمیان سرہانے رکھی جانے والی تلوار اس کے سرہانے کھڑی کی گئی۔ اماں چونکہ بدھ مت کی پیرو تھیں، اس لئے سر سے پیر تک سفید کفن پہنایا گیا۔ اس کے بعد خادماؤں نے ان کی پوجا کی۔ پوجا کے وقت ان کے ہاتھوں میں مالائیں تھیں جن پر وہ جاپ کرتے ہوئے اس کے دانوں کو انگلیوں سے پھسلا رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے سالہا سال کے بعد دیکھا تھا۔ سب کی سب مجھ سے ملیں۔ ایک دوسری سے کہہ رہی تھی، ارے دیکھو تو کون آیا ہوا ہے۔ ارے کتنی مدت بعد دیکھا ہے۔ پھر وہ کہتیں ”ارے وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔ مگر خیر۔ یہ دن تو دیکھنا ہی ہوتا ہے آخر کو ختم ہو گئیں۔ ہاں مجھے پتہ ہے نہ کیسے ہو گیا یہ سب کچھ......اچھا تم کو کچھ پتہ نہیں۔“

افسردہ اور غمگین وہ اپنے دھوپ سے سنولائے اور جھلسے ہوئے چہروں پر سے بہتے آنسوؤں کو پونچھتی رہی تھیں۔

اور تو اور چاچا جان بھی پہنچے ہوئے تھے۔ یہ ہماری انا کے شوہر تھے۔ آنا نے میری کزن کو جواب میری بھاوج ہیں، دودھ پلایا تھا۔ چاچا جن کے کشادہ کھلے کھلے ہاتھ سمندری ہوا نے کالے کرر کھے تھے۔ اپنی چھوٹی سی گول ناک کے تلے وہ یوں گھور گھور کر دیکھتے تھے گویا وہ ہم سے کچھ زیادہ ہی احترام اور تکریم کی توقع رکھتے ہیں۔ اپنے لئے بھی اور اپنی مرحومہ بیوی کے لئے بھی۔

چاچا جان کو دیکھ کر گئے دنوں کی یاد بے طرح ستانے لگی۔ میں نے تعجب سے ان کو دیکھتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا چچا تو ابھی بھی ٹانٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ چاچا جن سیاہ رنگ کی ماتمی جیکٹ پہن کر آئے تھے۔ جو بالکل اچکی اور چھوٹی تھی، آستین بھی اچک گئی تھیں پھر معلوم نہیں کب سے بید کی پرانی ٹوکری میں ٹھنسی ہوئی کہ بالکل ہی چرمرنظر آ رہی تھی...... وہ ایک دہقان ماہی گیر تھے اور ماہی گیروں کی قریبی بستی میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ہمارے لئے اپنی پکڑی ہوئی مچھلیاں لے کر آیا کرتے تھے۔ میں اور میری کزن چھ یا سات سال کی رہی ہوں گی جب ہم ایک بار اپنی انا کے گھر گئے......اور وہاں گہر نیلے سمندر کی موجوں کو غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ سمندر کی گہرائیوں سے موجیں اٹھ کر چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی تھیں اور ریتلے ساحل کی سفید ریت پر خشک کرنے کے لئے پھیلے ہوئے ماہی گیری کے جالوں سے بہت آگے جا گرتی تھیں۔ اس منظر کو دیکھتے دیکھتے میں اس خیال سے افسردہ ہو گئی تھی کہ میں اپنی اماں سے سینکڑوں میل دور آ گئی ہوں اور یہ خیال آتے ہی میں نے رونا شروع کر دیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں رٹ لگا دی کہ گھر جانا ہے اس وقت مجھے یاد ہے کہ میں نے چاچا جن کے سر پر بندھی بالوں کی چٹیا دیکھی تھی پس وہی میری اور ان کی آخری ملاقات تھی۔

اماں کی تعزیت کے لئے آنے والے ان سادہ لوح دیہاتیوں کی آمد نے دلی مسرت دی تھی جو سینکڑوں اعلیٰ مرتبت حکام اور افسروں کے آنے سے نہ ہوتی۔ ان کے سابق منشیوں اور مختاروں میں سے کسی کو بھی محفل سے اٹھنے یا جانے کی جلدی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ذکر اور فاتحہ کی شب والی رتجگے کی رسم اتنے سکون سے ادا ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک نے بڑی محبت اور سکون سے ان کے شخصی جمال اور خوبیوں کا ذکر کیا، اور کہا کہ اوپر آسمانوں کی جانب سے جو فرصت اور یہ

اسی سالہ مدت حیات ان کو عطا ہوئی تھی، اس کو انہوں نے بڑے ہی حسن وخوبی سے پورا کیا۔ وہ اپنی ذات میں ایک پورا عہد تھیں۔ سب سے بڑا خراج عقید تو اماں کے ایک سابق منیجر گوٹو نے پیش کیا۔ گوٹو اب خود ایک بڑی رائس مل کا مالک تھا۔ اس کا متبنی لڑکا شمالی چین کی انقلابی کاروائیوں میں بالکل جوان مارا گیا تھا وہ اتنا باشعور اور سنجیدہ نوجوان تھا کہ اس کی موت پر اپنے اور پرائے سب ہی کو غم ہوا تھا اور سب ہی کو ایسی موت پر فخر تھا چنانچہ گوٹو نے مخصوص جاپانی متانت اور صابرانہ انداز میں اماں کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''بات عمر پانے کی نہیں۔ سوال یہ نہیں کہ کس نے لمبی عمر پائی اور میری مالکہ کی طرح طویل مدت عمر پائی اور کون میرے جوان مرگ بیٹے کی طرح عین عالم جوانی میں، چوبیس سال کی عمر میں رخصت ہوا۔ بات مرنے والے کی شخصیت اور کردار کی ہوتی ہے اور یہ موت وحیات کے فیصلے تو قضاوقدر کے ہاتھ ہوتے ہیں۔''

اور یہ ذکر اذکار یعنی مرنے والوں کے قصے چل پڑے تو ایک کے بعد ایک نکلتا ہی گیا۔ کتنے مرنے والوں کے تذکرے پہلی مرتبہ سننے میں آئے جو ہمارے کنبے اور علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً ایک اور جوان معرکے کی نذر رہوا۔ وہ دور پرے کے ناطے ہمارے کنبے ہی کا تھا۔ اب اس وقت کے ذکر میں ہی پہلی مرتبہ ان کے خاندان اور اس کی شخصیت سے پوری طرح آگاہ ہونے، سارا خاندانی پس منظر بیان ہوا۔

ان کے والد اب شہر ہی میں مقیم ہیں اور وہ بنیادی طور پر ایکس گاؤں سے آئے تھے۔ یہ گاؤں اب بھی ریل کی کھڑکی سے نظر آتا تھا۔ اور سامنے والی پہاڑی کی چوٹی کے کنارے پر بنا ہوا سفید دیواروں والا مکان، نظر آتا تھا۔ وہ یہیں آکر مقیم ہوئے تھے۔ اور ان ہی کے وقت میں یہ خاندان چونے کی کانوں کے کام سے منسلک ہو گیا اور اپنا سارا اثاثہ ضائع کر دیا۔ لیکن اب بھی یہ لوگ صاحب حیثیت ہی ہیں اب بھی گاؤں کے مکھیا کی بیوی یقیناً ان ہی کے خاندان سے ہے۔

ہاں بالکل ایس ٹاؤن میں چینی کے سامان کے دکاندار کی بیٹی تھی اسی خاندان میں بیاہی ہوئی ہے۔ وہیں کہیں کیوٹیواوسا کا کے علاقے میں۔

ہاں ہاں۔ اس کا خاوند بینک میں ملازم ہے۔ وہاں کو بے۔ بات میں بات نکلتی گئی اور جیسا کہ خواتین کا قاعدہ ہے کہ کسی کی شادی بیاہ، جہیز یا بارت سے لے کر دولہا کی سات پشتوں کا احوال اور ان کے پیشے کے بیانات، اس مرہم تک کی بات چل پڑتی جس کی وہ تجارت کرتے

تھے۔عورتیں ہر ایک کا کچا چھٹا بیان کرتی چلی جائیں گی۔اچھا اس سے ان کا مطلب کسی کی کینہ توزی حسد یا انتقام نہیں۔بس ایک شغل اور سادہ لوحی ہی ہے۔ان کی گپ شپ سننے میں مجھے اتنا لطف آ رہا تھا کہ ان کی یہ ساری گفتگو کسی کتابی علم کا نہیں بلکہ ان کی سینہ بہ سینہ یادداشت کا نتیجہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ گپ شپ ہماری علاقائی تاریخ کا بڑا اہم سرمایہ اور ورثہ ہے۔میں ان کی باتیں سن کر سوچتی رہی کہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی قدامت اور تاریخ ان زبانوں پر اس طرح جاری ہے کہ وہ شعوری طور پر اس حقیقت سے آگاہ بھی نہیں کہ ہماری وہ تہذیب، فلسفہ اور تاریخ کے امین ہیں اور یہ امانت بڑی سادگی سے ان کی زبانوں پر جاری ہے۔ان کی باتوں کو سن کر مجھے یہی احساس ہوتا ہے کہ مقامی تاریخ ثقافت کو پڑھانے اور پھیلانے کا آسان اور بہترین طریقہ ان ہی مقامی لوگوں کی گفتگو اور بات چیت سے اخذ کرنا ہے جو باتوں باتوں میں ہمارے اندر اترتا چلا جاتا ہے۔اور زمانہ جنگ میں دیہی آبادیاں شہروں کو اسی طرح منتقل ہوتی رہیں تو اس طرح دیہاتی زندگی کی مرکزیت اتھل پتھل ہو کر رہ جائے گی۔شہروں میں وہ محلے داری اور پڑوس کے وہ رشتے اور رابطے ٹوٹ جائیں گے جو اس نوٹس بورڈ کا کام دیا کرتے ہیں جس کے ذریعہ عمومی اطلاعات ایک سے دوسرے تک پہنچائی جاتی ہیں۔یہ نوٹس بورڈ مجسم اور نظر آنے والی شکل میں نہیں بلکہ زبانی اور لفظی ہیں جو ان کی زبانوں پر لکھے ہوتے ہیں۔

ایک بات یہ ہوئی کہ اماں کی وفات پر اوتانے کی عمر کا گھپلا بھی دور ہو گیا۔اس لئے کہ اماں کی وفات کی رپورٹ لکھواتے وقت یہ بات صاف ہو گئی کہ اماں کی عمر پچاسی سال تھی اس لئے کہ ان کا سن پیدائش اٹھارہ سو ستاون تھا۔یعنی انسائی کے واقعے کے چار سال بعد۔اور چونکہ اماں جب ستائیس کی تھیں تو اوتانے کی عمر اٹھارہ برس تھی۔یعنی اماں سے نو سال چھوٹی تھیں اس طرح اب وہ چھہتر سال کی ہیں۔

میرے بھائی نے انگلیوں پر گن کر حساب لگانے کے بعد ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر اونچی آواز میں کہا

''سن لو اوتانے تم چھہتر سال کی ہو۔اب بھولنا مت۔یاد رکھنا اور جواب بھول لیں تو سمجھ لو کہ اب تم پر حکم چلانے اور یاد دلانے والی خاتون اس دنیا میں نہیں رہیں اور اب اگر تم بھٹک گئیں تو پھر تم کو راستے پر ڈالنے والا کوئی نہ ہو گا۔''

جملے کا آخری فقرہ سن کر سب ہی ہنس پڑے۔خود اوتانے کے زرد چہرے پر بھی مسکراہٹ

آ گئی اورانہوں نے دانت نکال دیئے۔اب یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اتنی اونچی آواز بھی اوتانے کے کانوں تک پہنچی ہوگی کہ نہیں۔اس لئے انہوں نے ایک مشین کے انداز میں ادھرادھر دیکھا اورایک ٹوٹے ہوئے والوو کے انداز میں بولنا شروع کیا۔

اوتسی سچی بات یہ ہے کہ تمہاری اماں بڑی خوش نصیب اور بھاگوان ہیں۔زندگی میں بھی سب نے ان کی ہرطرح خدمت اوردیکھ بھال کی اور مرنے کے بعد بھی ان کا حق ہرطرح ادا کیا جارہاہے۔دیکھو جب ہم مریں گے تو کوئی ہمیں رونے والا ملے گا بھی یا نہیں۔

اوتانے یہ الفاظ اس طرح بول رہی تھیں گویا کٹھ پتلی کا تماشہ ہورہا ہواور کٹھ پتلی کے اندر سے یہ آوازیں نکل رہی ہوں۔اماں کی وفات کے بعد اوتانے کی حیثیت کالعدم سی ہوکر رہ گئی تھی۔اور وہ بالکل خالی خالی سی نظر آتی تھیں۔ایسا لگتا تھا کہ ان کا ہر کام ختم ہوگیا۔البتہ ابھی اوتانے کا ایک کام باقی تھا جس کوانہوں نے پوری مہارت اوراعتماد سے سرانجام دیا۔یعنی جب میت کوکفنانے اورتابوت کوسجانے کا وقت آیا تو یہ کام اتنی مستعدی اورمہارت سے اوتانے کے سوا اورکون کرسکتا تھا۔اور جب آخری منتر اور ستر اکی جاپ کرنے پجاری آئے تو ان کو اٹھانے بٹھانے کا رکھ رکھاؤ سب اوتانے ہی کے ذمہ تھا۔اس کے علاوہ میت کوتابوت میں اٹھا کر رکھنے کے لئے تین یا پانچ مردوں کو یہ کام کرنا تھا۔میرے بھائی سمیت ان سبھوں کونئی عبائیں پہننا تھیں جس کا بہت پاک صاف ہونا بہت ضروری تھا۔اور یہ عبا ایسی ہوتی ہے کہ سج وبراہ راست پانی سے نہیں دھوتے۔وہ ایک رات قبل اوس میں ڈال دی جاتی ہیں اور شبنم کے قطروں کی برکھا میں دھل کر یہ پاک پوتر ہوجاتی ہیں۔اب یہ کام بھی اوتانے ہی کرسکتی تھیں۔پھر چاول کے آٹے کے کلچے جومہا تمابدھ کی موتی کے آگے پروسے جاتے ہیں۔وہ ایک خاص انداز سے ہی تھال میں سجائے جاتے ہیں۔

پتیل کے گلدان میں پھولوں کی آرائش اورمورتی کے آگے رکھنا یہ سب کچھ پورے آداب سے احترام سے کیا جاتا ہے۔اوراوتانے نے ہرکام پوری توجہ اوراحترام سرانجام دیا۔کہیں کوئی کسر نہ چھوڑی۔اگرچہ ہم نے میت پر ڈالنے کے لئے لائے جانے والے پھول کسی سے بھی قبول نہ کئے تھے۔پھر بھی اماں کی پوجاوالا کمرہ بڑی ترتیب اورسلیقے سے سجا ہوا تھا۔صاف ستھرا، اور بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔سب سے زیادہ دلکش اورخوبصورت تو تابوت ہی تھا۔شہروں میں تابوت کاروں میں رکھ کر قبرستان پہنچائے جاتے ہیں۔تابوت ایک لمبے سے بکس کی طرح

ہوتا ہے جس پر ایک سادہ سی، سفید چادر پڑی ہوتی ہے۔ بالکل ہی ٹھنڈی ٹھنڈی سونی سونی سی۔ لیکن چونکہ اس تابوت کو کندھوں پر جانا تھا، اس لئے یہ ایک لمبی سی ان گھڑ لکڑی کی گاڑی پر رکھا گیا۔ سنہری پتی اور نقلی دھات کو تابوت کی تزئین اور آرائش کے لئے استعمال کی گیا۔ یہ ساری آرائش علامتی انداز پر کی گئی تھی لیکن اس کے چاروں کونوں کے ساتھ جو تسبیحیں لٹک رہی تھیں، وہ خالص سونے ہی کی تھیں۔ اس کے علاوہ......ملمع کی ہوئی سنہری اور روپہلی جھالریں اور پھندنے لہرا رہے تھے۔ اس کے اوپر جو سفید ریشم کی چادر تھی۔ اس پر ہمارا خاندانی نشان سانپ کی بڑی سی آنکھ پینٹ کی ہوئی تھی۔ اور چادر ڈولی کے پردے کی چاروں طرف لا کر ایک آرائشی سفید ڈوری سے باندھ دی گئی تھیں......تابوت کو دیکھ کر میں نے سوچا واقعی اماں بڑی بھاگوان تھیں۔ پچاسی سال تک زندہ رہنے کے باوجود انہوں نے ہر دل میں اپنی محبت اور احترام کے سوا کوئی دوسرا جذبہ چھوڑا ہی نہیں اور آج وہ اپنا آخری سفر اس شان سے طے کر رہی ہیں۔

صبح سیاہ بادلوں اور دھواں دھار بارش کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اور ہم سوچنے لگے کہ جنازے کے شرکاء کے لئے یہ کیسی مصیبت کھڑی ہوگی۔ رات کے پچھلے پہر ذرا کی ذرا پلک جھپکی تھی کہ صبح آنکھ کھلی تو گھٹا ٹوپ بادل اور دھواں دار بارش تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ بارش میں کمی آتی گئی یہاں تک کہ سہ پہر تک صرف بوندا باندی رہ گئی۔ جنازہ اٹھنے سے بہت پہلے میرے شوہر بشو پنچی پہنچ گئے تھے۔ ان کی آمد پر گاڑی کی چھت ہٹائی گئی اور تابوت کا ڈھکنا کھول دیا گیا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے سو رہی ہوں۔'' وہ ان کا منہ دیکھ کر کہنے لگے اور تابوت کے قریب سے ہٹ کر آ گئے تو میں ایک بار پھر آخری مرتبہ اماں کا چہرہ دیکھنے کو لپکی۔ واقعی لگتا تھا کہ وہ سکھ کی نیند سوئی ہوئی ہیں۔

جب میں ان کے بالوں کی ایک سفید لٹ کو چہرے پر سے ہٹانے کو جھکی تو میرے بھائی نے جو تابوت کی دوسری طرف کھڑا تھا مجھ سے اس طرح کہا گویا وہ خود بھی کرنا چاہ رہا ہو۔

''باجی ذرا سا چہرے کو تو سہلا دیں۔''

اس سوگوار ادا پر ایک بار پھر میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ میں نے اس کی فرمائش کے مطابق ان کے چہرے کو دھیرے سے سہلا دیا۔ ماتھے سے گالوں تک اور گالوں سے ٹھوڑی تک ہاتھ پھیرتے ہوئے چہرے کے جمود اور سردی کا احساس ہوا۔ اور اب مجھے مکمل طور پر احساس ہو رہا تھا کہ بالآخر اماں چلی ہی گئیں۔ وہ اب جا چکی ہیں۔ ایک بات جو میں نے محسوس کی

جو میرے لئے حیرت انگیز بھی تھی یہ کہ ان کے بالوں کی سفید لٹ ویسی ہی نرم نرم اور باریک تھی جیسی ان کی زندگی میں تھی۔ اچھا ہاں، بالوں کی لٹ درست کرتے وقت مجھے ایسا لگا کہ دھلے ہوئے سوتی کپڑے کا چھوٹا سا بٹوہ جوان کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ وہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا یہ دیکھ کر میں اسے درست کرنے لگی تو مجھے کاغذ سے کاٹ کر بنائے ہوئے چھ سکے نظر آئے جن کے درمیان گول سوراخ بنے ہوئے تھے۔ یہ کاغذی سکے بھی اوتانے نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر تھیلی میں رکھے تھے۔ یہ رقم دراصل عدم کے سفر میں کشتی پار لے جانے کے کرائے کے طور پر رکھی جاتی ہے۔ مجھے اماں کی بات یاد آ گئی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ اس گھر کا ایک تنکا ایک چندی بھی اپنی ملکیت نہیں سمجھتی۔ یہ تو سب اس گھر اور کنبے کی ملکیت ہے۔ اماں نے بجز روٹی کپڑے کے اس گھر کا ایک پیسہ بھی اپنی جان پر خرچ نہیں کیا۔ البتہ جب وہ سفر پر نکلتی تھیں تو کرائے کی رقم ضرور خرچ کرتیں۔ مثلاً ٹوکیو یا کسی اور جگہ کا ٹکٹ ضرور اس گھر کے پیسے سے خریدتی تھیں۔ یہ ان کا نظریہ تھا جس پر وہ سختی سے پابند تھیں۔ یہاں تک کہ اگر قصبے کے کسی آدمی کی بیوی کے بارے میں سنتی تھیں کہ وہ گھر کے خرچے سے پیسے کاٹ کاٹ کر چوری چوری جمع کرتی ہے تو اس کو بلا کر اس کا فضیحتہ کرتی تھیں۔ کیا ضرورت ہے تجھے اپنے لئے چوری چوری رقم بچانے کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی ان کا کمرہ، درازیں، بستر تک الٹ پلٹ کر کھکوڑ کر بھی تلاش کرتا تو کچھ نہ ملتا۔ ہاں، اب جب وہ جہان فانی سے کوچ کر رہی تھیں یہ کاغذ ہی ان کی کل کائنات تھے جو زادِ راہ کے طور پر ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ بس یہ تھا ان کا طرز حیات۔

''چل رہی ہو تم بھی ہمارے ساتھ اس موسلا دھار بارش میں۔''

میرے بھائی نے رسمی اور روایتی لباس تبدیل کرنے کے بعد مجھ سے پوچھا تھا۔ جس دن ہمیں اماں کے پھول چننے یعنی بخورات کے جلنے کے بعد جلی ہوئی باقیات کی راکھ لینے جانا تھا، اس دن صبح ہی سے پٹیم پیٹ بارش ہو رہی تھی۔ ہمارے رواج کے مطابق میت کے ساتھ عورتیں مقبرے تک نہیں جاتیں۔ لیکن اگلے دن میت کے پھول چننے ضرور جاتیں اور تابوت کے سامنے جو بخورات جلائے جاتے ہیں، ان کی راکھ چن کر گھر واپس لاتی ہیں۔ لیکن میں اس موقع پر ضرور شرکت کرنا چاہتی تھی۔ اب چاہے کتنی ہی دھواں دھار بارش کیوں نہ ہوا۔ اور خواہ اس وقت گاڑی ملے نہ ملے۔ اب یوں ہوا کہ بارش کی پروا کئے بغیر ہم چھ لوگ اس کام کے لئے روانہ ہوئے۔ یعنی میں، میرا چھوٹا بھائی، اس کی دونوں لڑکیاں اور یوکو تا یعنی ہمارا سابق کلال (شراب

کشید کرنے والا) روانہ ہوئے۔ یوکوتا کے ہاتھ میں ایک سفید سوتی کپڑا اور ایک بڑا سا مرتبان تھا جو ہم سب نے تیار کیا تھا۔ بارش اگر چہ بہت تیز تھی اتنی کہ عموماً موسم بہار میں اتنی تیز بارش ہوا نہیں کرتی۔ لیکن بارش کا پانی ایک تو بالکل شفاف تھا۔ دوسرے سرد نہ تھا بلکہ اس کی نمی میں ایک گرمی سی تھی۔ قصبے کے وسط سے گزرتے ہوئے ہم اس سنسان اور خاموش گلی سے گذرے جہاں اب تک قدیم سمورائی عہد کے مکان قطار در قطار نظر آتے ہیں۔ اور ان گھروں کے احاطوں اور صحنوں میں چیری، شفتالو، خوبانی اور کیملیا پر شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے ایک پرانی فلم یاد آ گئی جس کا نام ڈاکٹر کیلیگری تھا۔ اس فلم کے مناظر اسی مضافات کے آس پاس کے لگتے تھے۔ یہ راستہ سڑک کے بجائے ایک کھلی ہوئی (بغیر چھت کی) سرنگ لگتا تھا جو ڈھلان کے پیچ وخم سے بل کھاتی ہوئی نیچی کو جا رہی تھی۔ یہ ڈھلانی راستہ چونے کی پکی پہاڑی کو کاٹ کر نکالا گیا تھا۔ راستے اور گھروں کی گلابی پتیاں اسی طرح مضبوط اور تر و تازہ نظر آ رہی تھیں۔ ایک پتی بھی پانی کی چوٹ سے ٹوٹ کر نہیں گری تھی۔ نہ کیملیا کے گہرے سرخ پھولوں پر کوئی اثر پڑا تھا۔ وہ شڑ شڑ بہتے پانی کے درمیان اسی طرح لہلہا رہے تھے، ایسے کہ میں ان کی شادابی اور تازگی پر عش عش کر رہی تھی۔ یہ تمام راستہ اور علاقہ ہی اتنا دلکش اور حسین تھا۔ گھروں کے وہ قدیم وضع کے گیٹ۔ ہرے بھرے بانسوں کے جھنڈوں کی سرسبز باڑھ قدم قدم پر ایک حسین منظر بن کر ابھر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہم پہاڑ کے قریب پہنچ گئے۔ ایک نو تعمیر پتلی سی سڑک پر آ گئے جو دامن کوہ میں بنے ہوئے شمشان گھاٹ کی جانب جاتی تھی۔ راستے کا حسن اسی طرح برقرار اور جاذب نظر تھا۔ بے شمار چیری کے پیڑ، سدا بہار اور سیاہی مائل سبزی لئے ہوئے جھاڑیاں بارش کے پانی میں نہا کر اور نکھرے نکھرے نظر آتے تھے۔ چیڑ پر کھلتے ہوئے پھول گویا ہم سے ہم کلام تھے۔ آج اس وقت دیس کے اس بہار میں موسم کے احساس سے مجھے اپنی نیل کی لکڑی سے بنی جنم چھتری کا خیال آیا جس پر سانپ کی آنکھ والا علامتی نشان نمایاں نظر آتا تھا۔ اور اب اس وقت اماں کے جنازے کا جلوس بڑی متانت اور شان سے روانہ تھا۔

....

اماں کا وجود سفید اور گوشت سے پاک ہلکی ہڈیوں کی صورت میں رہ گیا اور جب میں

چاپ اسٹکس کے ساتھ ہڈیوں کو یکجا کر رہی تھی وہ اس طرح کھن کھن بول رہی تھیں جیسے خشک سیپیاں۔ اگر چہ اماں کے چشمے کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کے وجود ہی کساتھ جل کر بھسم ہوگیا۔ البتہ ان کے پائپ کی چاندی کی منہال ایک سیاہ گولے کی شکل میں مل گئی۔ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ میں نے تمام ہڈیاں چن لیں جو جس قدر ہوسکتی تھیں، مرتبان میں جمادیں اور بقیہ کو اخبار کے کاغذ میں لپیٹ لیا وہ وہیں سے پڑامل گیا تھا لپیٹ کر جب وہ بنڈل سینے سے لگایا تو ہڈیاں جو ابھی تک گرم تھیں، مجھے یوں لگا تھا جیسے ان کے جسم کی حدت اور حرارت ابھی زندہ ہے اور ان کے وجود کی گرمی ابھی سرد بھی نہیں پڑی۔ پھر اچانک ہی عجیب سا احساس ہونے لگا۔ گویا میں اپنی ہڈیاں خود اٹھائے کھڑی ہوں۔

شمشان سے واپسی پر ہم سب مہمان خانے میں جمع تھے۔ میرے بھائی نے چائے بناتے ہوئے ایک بات کا ذکر کیا جس سے وہ بہت متاثر ہوا کہ دونوں اسٹوروں، یعنی مرکزی اور اس کے مقابل والے اسٹور کے اعلیٰ درجے کے تمام ملازمین نہ صرف شریک تھے بلکہ میت کی گاڑی اپنے ہاتھوں کھینچ کر لائے تھے اور انہوں نے بخورات کی انگیٹھیاں بھی اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھیں۔

''بات یہ ہے کہ ابا کے وقت جنازے میں شرکت کی بات دوسری تھی۔ اس وقت تو ان کی شرکت لازمی اور یقینی تھی۔ لیکن یہ تو آج کی بات ہے۔ جب کوئی کسی کو بھی کسی بات کے لئے مجبور نہیں کرسکتا۔ اب اگر آج وہ از خود جنازے میں شرکت کا فیصلہ نہ کرتے تو میں ان کو ہرگز مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بڑی بات ہے کہ یہ فیصلہ انہوں نے اپنی مرضی اور اپنے طور پر کیا ورنہ ہمیں بھی چتا کو آگ دینے والے پجاریوں اور بھکشوؤں کا سہارا لینا پڑتا۔''

''لیکن یادرکھو تمہاری باری آئے گی تو یہ بھی نہیں ہوگا۔''

میرے اور بھائی کے درمیان اس قسم کا مذاق چلتا تھا۔

وہ افسردگی سے ہنسا اور بولا

''ہاں صحیح بات ہے۔ ارے اب بھی اور جگہ تو عام طور پر یہ فرائض بھکشو ہی انجام دے رہے ہیں۔''

مجھے پتہ تھا کہ سماجی اور خاندانی روایات اور رسوم کے دباؤ سے اب متضاد خیالات اور رائیں جنم لی رہی تھیں۔ اور غیر محسوس اور نامعلوم طور پر اس قسم کی رویات میں تبدیلیاں آتی جا

رہی تھیں۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ آجر اور مزدور کے باہمی تعلقات میں بہت تبدیلیاں آگئی تھیں۔ جب سے ملازمین کو برابری کے مالکانہ حقوق دیئے گئے تھے تو باوجود اس کے کہ مالکان کا جاگیردارانہ طرزِ عمل عبوری دور کے مقابلے میں کچھ نرم ہو گیا تھا، تاہم ملازمین پر وہ پچھلا سا دباؤ نہیں رہا تھا نہ یہ کہ پہلے کی طرح ان کو بغیر کسی احترام یا اعزازی انداز کے مخاطب نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ صرف ان کے نام اب نہیں لئے جاتے تھے اور یہ کہ اس زمانے میں ملازمین میں اس طرح پکارے جانے پر برا بھی نہیں مانتے تھے اور پہلی آواز ہی پر دوڑ پڑتے۔ اب یہ رویے اور وطیرے تبدیل ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے بھائی سے پوچھا تم نے ان میت اٹھانے والوں کو کیا معاوضہ دیا۔

''ارے کچھ بھی نہیں۔''

یوکوتا نے جو اپنی چائے کی پیالی اٹھائے میز کے سرے پر بیٹھ رہا تھا جواب دیا ''اصل میں رواج تو یہ ہے کہ ان کو اس موقع پر پہننے کے لئے وردیاں اور خاندانی نشان والے تمغے دیئے جاتے ہیں جن کو پہن کر وہ میت کے جلوس میں شامل ہوتے ہیں اور پھر رات کو ان کو جی بھر کر شراب پلائی جاتی ہے۔''

اماں کے جنازہ برداروں کو گہری سرمئی رنگ کی سوتی وردیاں دی گئی تھیں جن کے سینے پر خاندانی نشان والا پلیٹ کے برابر بیج سی دیا گیا تھا۔ یوکوتا نے بات جاری رکھی۔ بھئی پہلے زمانے میں خالص سنہری بروکیڈ اتنا وزنی اور موٹا ہوا کرتا تھا کہ کسی خاندان کے سربراہ کی میت اٹھانے والوں کے ہاتھ تھک جاتے۔ مگر اب اس کی قیمت چار ین سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور کاغذ پنی اور سنتھیٹک تاروں سے بنی چادر کی چوگنی قیمت ہے۔

اچھا جو کچھ تم نے اس وقت خرچ کیا ہے اس پر کیا لاگت آئی؟

جب میں یہ سوال کر رہی تھی تو مجھے خیال تھا کہ دو ہزار ین سے زیادہ یا کم تو کیا ہی خرچ ہوا ہوگا۔

بس دیہات کی رہائش کا یہی تو فائدہ ہے بہن۔

ہنستے ہوئے بھائی نے اکی گامی کی طرف مڑ کر دیکھا جو حویلی کا منتظر اور منشی تھا۔ اور صبح کے سلام کے لئے اس طرف آیا ہوا تھا۔

''کیوں بھئی ان کے اندازے سے تو آدھا بھی نہیں خرچ ہوا ہوگا۔''

''کیوں آخر اتنا کیسے خرچ ہو جاتا۔اور ہم ہو جانے دیتے بھلا۔''

اکی گامی نے خالص تاجرانہ مبالغہ آمیز انداز میں تمسخر کیا۔

''جتنا یہ سوچ رہی ہیں، اتنا تو ساتویں دن کی فاتحہ کے کھانے کا خرچہ بھی ملا لیں تو نہیں ہوا ہے۔''

بھئی ٹوکیو میں تو آپ چاہے کہیں چلے جائیں، اتنا لذیذ سبزیوں سے تیار کردہ کھانا اتنے پیسوں میں ہرگز نہیں مل سکتا۔ نہ کہ اس میں دوسرے قسم کے کھانے بھی شامل ہوں۔

''بھئی اس پر تو صرف ایک ین لاگت آئی ہے۔''

''پھر تو میں یہیں آکر مروں گی۔ بس یہ طے ہے کہ یہیں سے اپنی تجہیز اور تکفین کرواؤں گی۔''

میری بات سن کر سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔شونی چی مجھے چھیڑنے لگے۔''ہاں پتہ ہے کہ تمہاری نیت ہے کہ تابوت سے نکل کر میز پر آن بیٹھو گی۔ سبزخوروں کا خاص کھانا کھانے۔ تل کی پھلیوں کی دال اور کدو کے نوڈل خاص طریقے سے تلی ہوئی یہ ڈش ہریوز واور گاڑھے گاڑھے سوپ میں پڑا ہوا نشاستہ جان جاتی ہے تمہاری تو اس پر۔''

''سچی بات ہے کہ میرا تو خود اپنی فاتحہ کے کھانے پر دل مچل جائے گا۔اور میں تو آن بیٹھوں گی............ خیر مجھے پتہ ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہی کھا سکوں گی۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ میں کہاں ایسی گاڑی پر لے جائی جاؤں گی۔ بھائی ہمارا جنازہ تو موٹر کار ہی پر جائے گا۔ جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔اچھا اگر میں نے اماں جتنی عمر پائی تو میں بھی دیکھ لوں گی کہ تیزی سے بدلتی ہوئی یہ دنیا کہاں جا کر رکتی ہے۔اور میں شاید زمانے کی بدلتی رو کے بارے میں اپنی ڈیسک پر بیٹھ کر کچھ لکھ سکوں۔'' بس ایسی باتیں سوچتے سوچتے میں نے اپنی چائے اٹھا کر پی لی جو پڑے پڑے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

ٹوکیو کا موسم گرم ہو گیا تھا۔اور ہم اپنے پہاڑی بنگلہ پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو میں اماں کی باقیات (راکھ) ساتھ لے جانے کے لئے اپنے سامان میں رکھ لیں۔جس سال پہلے پہل ہمارا گھر مکمل ہوا جو اس دور افتادہ اور سنسان سطح مرتفع پر تعمیرا ہوا تھا۔تو اتفاق سے اماں ہمارے پاس ٹوکیو آئی ہوئی تھیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ گرمی گذارنے نئے گھر میں گئی تھیں۔ وہ یہاں ریچھوں کی موجودگی اور ان کے ہر طرف گھومتے رہنے سے پریشان ہو جاتی تھیں۔اب یہ

بھی دس سال پہلے کی بات ہے۔اور یہ ہمارا چھوٹا سا پہاڑی گاؤں اب ایک پرفضا پہاڑی مقام میں تبدیل ہو چکا تھا۔اماں کی بڑی خواہش تھی کہ ایک بار پھر وہاں جا کر رہیں۔لیکن میں جان بوجھ کر ٹال جاتی تھی۔ایک تو اس خیال سے کہ اگر خدانخواستہ اتنی بلندی پر بیمار پڑ گئیں یا کچھ ہو گیا تو کیسی مصیبت ہو گی۔کچھ اپنی طبیعت کی سستی تھی کہ ان کو بالکل ہی مختلف جگہ اور ماحول میں اتنے عرصے تک رکھنا اوران کی دیکھ بھال کرنا گراں گذرتا تھا۔ان کے تقاضے کو ہر مرتبہ ٹال جاتی۔اور اب جب وہ یہ حسرت لئے دنیا سے چلی گئیں تو دل ملامت کرتا ہے۔میں کیسی نالائق بیٹی ہوں کہ اپنی ماں کی ایک خواہش پوری نہ کر سکی۔میں نے یہی ارادہ کر لیا کہ ان کی ہڈیاں وہاں لے جا کر دان کر دوں گی۔اب یہ ہوتا کہ روز سوچتی اور پھر بھول جاتی۔آخر ایک دن میں وہ لے ہی گئی اور ایک نوعمر جاپانی بلوط کے پودے کو پسند کیا۔جو پہاڑ کے عین سامنے کھڑا تھا۔اس کے سامنے والے پہاڑ کے دامن میں کھاڑی تھی۔میرے شوہر شونی چی اور چھوٹے بیٹے ہکارو نے مل کر ایک گڑھا کھودا اور مرتبان اس کی تہہ میں رکھ کر دفنا کر

پونم کا چاند

اس کے سائے تلے

تم آرام سے سوئی رہنا

میرے ہونٹوں پر سے کچھ اس طرح کے الفاظ خود بخود پھسل پڑے۔ ان کو ہائیکو تو نہیں کہا جاسکتا۔ عجب اتفاق تھا، یہ پونم کی رات تھی۔ آسمان پر پورا چاند نکلا ہوا تھا۔

اس خیال سے کہ اتفاقیہ ہی سہی ہم نے اس کام کے لئے بالکل ہی مناسب دن منتخب کیا ہے۔ ہم تینوں نے دلی مسرت اور اطمینان محسوس کیا۔

ہیرابے یاشی تائیکو

نابینا چینی سپاہی

یہ نو مارچ انیس سو پینتالیس کا واقعہ ہے کہ اتفاق سے عجیب بات ہوئی کہ جس وقت ایک بڑا ہوائی حملہ ہوا اس وقت گوما کا آسمان بہت صاف تھا اور شفاف تھا ایک جہاز جو شاید اوٹا کے علاقے سے اٹھا تھا، شمالی ہواؤں کے ساتھ اڑتا ہوا گذر گیا۔

میں جو ایک ایسا دانش ور تھا، جس نے پیشہ کے طور پر کھیتی باڑی کا کام اختیار کیا تھا، اسی صبح ناشی کی کے راستے کوہ اگا کی سے نیچے اتر کر آیا تھا۔ اگا کی ایک ایسا پہاڑ ہے جس پر برف جمتے جمتے یخ ہو جاتی ہے۔ اگا کی سے اتر کی میں نے کامی کمبارا سے آشنیو لائن گرین ٹرین پکڑی تھی اور پھر ریل بدلنے کے لئے تاکاساکی پر اترا تھا۔ مجھے ایک مرتبہ اور گاڑی بدلنا تھی تاکہ شنگو لائن کی ریلوے لائن کے ذریعہ اوای نو پہنچ سکوں۔

یہ تقریباً سہ پہر کے ساڑھے چار کا وقت تھا۔ اگرچہ آسمان اب تک شفاف تھا۔ لیکن آسمان کے نیچے مشینیں تیار کرنے والے کارخانے کے اس قصبہ کی چھتوں پر دھول اور سدا بہار درختوں کے پتوں اور ڈالوں کے درمیانی خلا سے نظر آنے والے آسمان پر جیسے سیاہ اندھیرا سا اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر واقع ویٹنگ روم میں بھی اندھیرا گھپ ہو رہا تھا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر اس میں گھسا ہوا تھا۔ ہر شخص کو اپنے اپنے سامان کی پڑی تھی۔ لوگ بانس کے بڑے بڑے صندوق سبزیوں کے ٹوکرے کندھوں پر اٹھائے یا زمین پر اپنے پاس رکھے بیٹھے تھے۔ شور، وحشت اور سراسیمگی سے سارا کمرہ گونج رہا تھا۔ عجیب ہل چل سی مچی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے سامنے دیوار پر ٹنگے بڑے سے گھنٹے کی طرف دیکھا۔ میں ویٹنگ روم سے نکلنے ہی کو تھا کہ پولیس کا ایک دستہ

داخل ہوا۔ ان کی ٹھوڑیوں کے نیچے ان کی ٹوپیوں کے تسمے کسے ہوئے تھے۔ وہ اسٹیشن کے ایک پل کو طے کر کے پلیٹ فارم پر پہنچے تھے۔ اس دستے میں پولیس کے افسر اعلیٰ اور ان کے ماتحت شامل تھے۔ ان کے لوہے کی ہیلمٹس ان کے پیچھے لٹک رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھا رکھے تھے۔ وہ اسٹیشن کے ایک ماتحت اہل کار کسی معاملے پر بات چیت کر رہے تھے۔ جوان کے ساتھ ہی آیا تھا، پھر ایسا معلوم ہوا کہ پولیس چیف نے مداخلت کر کے بات ختم کر دی۔ پھر وہ کلرک ایک مرتبہ پھر پل طے کر کے پلیٹ فارم کی دوسری طرف گیا اور دفتر سے سفید چاک کا ایک ٹکڑا لئے ہوئے واپس آ گیا اور اس نے پلیٹ فارم کی زمین پر ایک سفید لکیر کھینچی۔

میں زینہ کے ساتھ ایک ٹانگ ٹیڑھی کئے کھڑا تھا۔ میرے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ مسافروں کے ہجوم میں سے لوہے کی کیلوں سے بھرا ہوا تھیلا کسی نے میرے پیر پر پٹخ دیا تھا۔ کلرک میرے قریب آیا تو اس نے مجھے سختی سے دھکیل کر ایک طرف کر دیا۔ اور پلیٹ فارم پر سفید لکیر کھینچنا شروع کر دی۔ ان دنوں عام طور پر ریلیں بہت دیر سے آتی تھیں اور مسافر اس کی تاخیر کے ساتھ ساتھ کلرکوں کی جھڑکیوں کے بھی عادی ہو گئے تھے۔ سب کے سب بڑے تجسس سے دیکھتے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد برف سے ڈھکی ہوئی ریل پہنچی۔ قبل اس کے کہ میں اس کو پوری طرح دیکھ پاتا، سارے پولیس والے ایک دم اکٹھے ہو گئے۔ وہ ایک کالے ڈھیر کی مانند نظر آ رہے تھے۔ اب وہ دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ وہ گاڑی کے اس ڈبے کے دونوں دروازوں میں کھڑے ہو گئے جس میں میں سوار ہونے والا تھا۔ سفید لکیر ایسی ڈبے کے سامنے سے نکالی گئی تھی۔ کمپارٹمنٹ بالکل خالی معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن جوں ہی میں نے اس میں گھسنا چاہا، ایک پولیس والے نے زبردستی مجھے چڑھنے سے روک دیا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ اس کے اندر ایک نوجوان بیٹھا ہے جو یقیناً اس کا خدمت گار ہوگا۔ اس کی مخصوص ناک کو دیکھتے ہی جان گیا کہ یہ شہزادہ تاکاماتسو ہے۔

شہزادے کو دیکھ کر مجھ پر ایک ناقابل بیان جذباتی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ خود سوچیں کہ اگر آپ کی نظر کسی ایسی شخصیت پر پڑ جائے جس کو خیال وخواب سمجھا جاتا رہا ہو اس کو جعلی اور خیالی شخصیت خیال کیا جاتا ہو اور پھر اچانک وہ شخصیت آپ کی نظر کے سامنے بیٹھی ہو تو آپ کے جذبات کا کیا حال ہوگا، سو وہی میرا حال ہوا۔ میں اس خوبصورت نوجوان کو دیکھتا رہ گیا۔ فطرتاً

میرا جی چاہا کہ لوگوں کو چلا چلا کر چیخ چیخ کر بتاؤں کہ لوگو دیکھو وہ رہا شہزادہ۔ یہ تو ایک حقیقت ہے کوئی جعلی یا فرضی نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ لیکن اس حرکت کے لئے یہ وقت مناسب نہ تھا۔ نہ میں اور نہ ہی کوئی دوسرا مسافر یہ حرکت کر سکتا تھا۔ ڈبے میں بیٹھنا تو اسی وقت ممکن تھا کہ کسی نہ کسی طرح کوئی جان کا خطرہ مول لے کر ڈبے میں چڑھ جائے اور پھر وہاں بیٹھ کر گاڑی چھوٹنے کا گھنٹوں انتظار کرے۔

میں ایک درمیان والے ڈبے کی طرف لپکا لیکن ابھی تک میرا ذہن شہزادے کو دیکھنے کی وجہ سے حیران اور اتنا ماؤف ہو رہا تھا کہ میں نقل و حرکت بمشکل کر سکتا تھا۔ میں ابھی تک مسافرں کی قطار کے آخر میں ہی کھڑا تھا۔ اور منہ اٹھا اٹھا کر ڈبے کی طرف یہ معلوم کرنے کو دیکھ رہا تھا اندر گھسنے کی کوئی جگہ ہو سکتی ہے۔

ڈبے پر نگاہ ڈال کر اس کے خوشگوار اور شفاف ماحول کا اندازہ ہوا۔ اس کے نیلے کشن اور صفائی کو دیکھ کر تو بقیہ پوری گاڑی کی گندگی اور بدنظمی کا خیال کر کے وحشت ہونے لگی۔ کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشے اور دروازے میں شیشے کی جگہ ایک کھردرا سا لکڑی کا تختہ کیلوں سے ٹھکا ہوا، روتے ہوئے بچوں کی چیخیں، اپنے سامان پر آ کر بیٹھی ہوئی بڑھیا، ایک دروازوں والی الماری، ایک بڑی سی گٹھڑی میں بندھی ہوئی کھلی ہوئی جھاڑو...... ایک ملٹری پولیس کا آدمی.......... چلاتا ہوا آیا ''ابھی بیچ والے ڈبے میں کافی جگہ ہے ادھر۔'' مگر اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا بن گئی۔ کسی نے بھی اس کی آواز پر کان نہ دھرا۔ میں یہ سنتے ہی پہلے ڈبے میں چڑھنے کے خیال کو چھوڑ کر آخری ڈبے کی طرف لپکا۔ اس طرف ایک بھی مسافر موجود نہ تھا۔ ایک سپاہی شاید آفس کا کوئی جونیئر آفیسر تھا، سر کے اشارے سے سادہ کپڑوں میں اترنے والے مسافروں کو گن رہا تھا۔ یہ مسافر وہی بے وردی سپاہی تھے۔ ان کے کمبل ان کے کندھوں پر تھے۔ ان کے ہاتھوں اور چہرے پر میل اور چیکٹ اتنی جمی تھی کہ کوئی چاہے تو آسانی سے اتاری جا سکتی تھی۔

میں دروازے کے پاس کھڑا تھا اور حیران بھی تھا کہ ان کی یہ کیا حالت ہے اور اس کا سبب کیا ہے۔ غور سے دیکھنے سے پتہ چلا کہ یہ سب کے سب اندھے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنا لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کر اپنے آگے والے کی پیٹھ کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بے حد تھکے ہوئے اور پیلے نظر آ رہے تھے۔ ان کی جھپکتی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں رواں تھیں۔ ان کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے ان کی عمروں کا اندازہ لگانا محال تھا۔ لیکن جہاں تک

میرا اندازہ تھا کہ وہ پینتیس سے پچاس تک کی عمروں کے ہوں گے۔ زیادہ غور سے دیکھنے پر محسوس ہوا کہ ان میں سے ہر پانچ آدمیوں کے پیچھے ایک نارمل آنکھوں والا شخص موجود تھا۔ آنکھوں والے نارمل لوگ فوجی وردیوں میں تھے۔ ان کی وردیوں کا تقریباً وہی رنگ تھا جو جاپانی سپاہیوں کی وردیوں کا ہوتا ہے۔ بس رنگ میں ایک خفیف سا فرق تھا۔ ان کے ہاتھوں میں چھڑیاں تھیں، مجھے لگ رہا تھا کہ یہ ان لوگوں کے نگران ہیں۔

یہ لوگ راستہ کا اندازہ لگاتے ہوئے نابینا سپاہیوں کو جھڑکیاں دیتے ہوئے اور قطار درست رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے چل رہے تھے۔

''چلو۔ جلدی! جلدی......'' جس کے ہاتھ چھڑی تھی وہ زور سے چلاتے ہوئے اپنے سامنے والے سپاہی کو چھڑی سے کچوکتا جا رہا تھا۔ اب پتہ چلا کہ اس دستے میں سارے کے سارے چینی سپاہی تھے۔ اور قطع نظر اس سلوک کے ان کی گندگی سے بھی یہی اندازہ ہوا۔ پھر یہ کہ ان کا قیافہ بھی یہی بتاتا تھا کہ وہ مختلف لوگ ہیں۔

ریل کے ڈبے سے جتنے سپاہی اترے تھے ان کو پلیٹ فارم پر ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا تھا یہ تعداد میں پانچ سو تھے، مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔ ایک دفعہ پھر غور سے دیکھا ان سب کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں، آدھی کھلی اور آدھی بند جیسے روشنی ان کو ناگوار لگ رہی ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی آنکھ سے آنسو ٹپک رہے تھے یقیناً یہ سب کے سب اندھے تھے۔

نگران سپاہیوں نے جو نابینا نہیں تھے، اچانک کسی کو دیکھتے ہی سلیوٹ مارا۔ ایک جاپانی افسر جس کی کمر کے ساتھ خنجر لٹک رہا تھا ایک ڈبے سے نکل کر باہر آ کھڑا ہوا تھا۔

''اچھا اور باقی کہاں ہیں۔'' اس نے ایک سپاہی سے پوچھا جو اندھے سپاہیوں کی گنتی کرنے میں مصروف تھا۔

''جناب وہ بعد میں پہنچیں گے۔ فلاں فلاں ٹرین سے۔'' ماتحت نے جواب دیا۔ حتیٰ کہ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے تو رومال آنکھوں پر رکھ کر باقدہ رونا شروع کر دیا۔ ایک بات صاف ظاہر تھی کہ کمانڈر اور اس کے ماتحت افسر کی کوشش تھی کہ مسافروں کی اندھے سپاہیوں پر نظر نہ پڑے لیکن ابھی ریل چھوٹنے میں دیر تھی اور جنگلے کے پیچھے کھڑے مسافروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جو ان کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اور جنگلے کے پیچھے جمع ہو رہے تھے۔

آخر کار جو قطار میں سب سے آگے کھڑے تھے انہوں نے اسٹیشن کے زینے چڑھنے

شروع کر دیئے اور گاڑی آہستہ آہستہ چل پڑی۔ میں کمپارٹمنٹ کے دروازے کے پائیدان پر کھڑا ہوا تھا۔ اسی ڈبے کے سامنے جو ابھی خالی کیا گیا میں نے اس کا ڈنڈا پوری قوت اور مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ میں پولیس والوں کو بخوبی دیکھ سکتا تھا جو ان سپاہیوں کا پہرہ دے رہے تھے اور آپس کی سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے۔ ''میرا خیال ہے کہ یا تو ان کو کسی زہریلی گیس کے تجربے میں استعمال کی گیا ہے یا پھر کسی دھماکے کی زد میں آ گئے ہیں۔'' لوہے کی ٹوپی والے سپاہی نے کہا جو مجھ سے چار پانچ آدمیوں کے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔

اس کے ساتھی نے اس کی بات پر اعتراض کیا۔

''ارے بھئی یہ اپنے وطن میں ایسے تجربے نہیں کرتے ہیں۔''

اس شخص کی بات سن کر میں نے ایک عورت سے جس کی عمر تقریباً چالیس سال تھی، پوچھا

''یہ سپاہی ریل پر کب سوار ہوئے تھے؟''

''میرا خیال ہے شی نوانوامی کے قریب سے کسی جگہ سے سوار ہوئے تھے۔''

پھر تو یقیناً ناگویا کے علاقے سے آئے ہوں گے۔ میں سوچا۔ لیکن اس سے مجھے کوئی سراغ نہ ملا۔ نہ ہی صحیح بات کا پتہ چلا۔

جلد ہی مسافر اس منظر کو بھول کر آپس کی بات چیت میں مصروف ہو گئے۔ وہ خاتون جس سے میں نے یہ سوال کیا تھا، مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی۔ ''میں اچیگو کی رہنے والی ہوں۔ اس وقت اپنی بیٹی کے ساتھ چیبا جا رہی ہوں۔'' اس نے مجھے بتایا کہ اس کی بیٹی فوجی رضا کاروں کی خواتین کی تنظیم میں کام کرتی ہے اور وہ اپنی بیٹی کو پہنچانے جا رہی ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ہماری روانگی میں ایک ہفتہ کی تاخیر ہو گئی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ لڑکی کے گلے پر پھوڑا نکل آیا تھا اور چونکہ ان کو چیبا کا براہ راست ٹکٹ نہیں مل سکا تھا، اس لئے اب جہاں تک سفر جاری رکھ سکیں گی، اس ٹکٹ سے اسی جگہ اتر جائیں گی۔ اور وہاں قیام کر کے ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں گی۔ اب یہاں تک تو انہوں نے سفر کر لیا ہے مگر کس مشکل سے۔ یہ وہی جانتی ہیں۔

اس خاتون نے ابھی کچھ دیر پہلے چینی سپاہیوں کے بارے میں میرے سوال کا جواب ایسی لاتعلقی سے دیا تھا کہ میرا دل اس سے برا ہو گیا تھا لیکن اب یوں معلوم ہوتا کہ جاپانیوں کے اپنے معاملات اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ ان کو دوسروں کے بارے میں سوچنے کی مہلت بھی نہیں اور نہ ہی وہ ایسے واقعات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔

ٹرین اسٹیشن سے باہر نکلی تو میں اس ڈبے میں چلا گیا جس میں اب سے کچھ دیر پہلے چینی سفر کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا ڈبہ خالی ہے اور میں وہاں سے آرام سے لیٹ بیٹھ سکوں گا، لیکن میرے لئے وہاں ٹھہرنا مشکل تھا۔ ڈبے میں نا قابل برداشت تعفن اور بدبو بسی ہوئی تھی۔ میں وہاں سے اٹھ گیا۔

ٹرین کا کنڈکٹر اس کے آخری سرے سے اعلان کرتا ہوا آیا۔ ''اگلا اسٹیشن جمبو بارا......اگلا اسٹیشن جمبور بارا۔''

جب وہ مسافروں کے درمیان سے یہ اعلان کرتا گذر رہا تھا تو میں نے اپنا منہ نکال کر باہر کی طرف دیکھا۔ ڈوبے سورج کی کرنوں نے مغربی کھڑکیوں پر جیسے آگ سی لگا دی تھی۔ سرخ سورج کا گولہ بڑے وقار و تمکنت اور دیوتاؤں جیسے تقدس کے ساتھ آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چینیوں والا ڈبہ کاٹ کر علیحدہ کر دیا گیا ہے اور اب اس کی جگہ آخری ڈبہ وہ ہے جس میں میں بیٹھا ہوں۔

ہاں، وہ شہزادہ اب بھی اگلے ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن میں اتنا تھک چکا تھا کہ میں کسی کو بھی یہ بات نہ بتا سکا۔

....

جنگ کے خاتمے کے بعد ایک بار ادھر جانا ہوا تو میں نے تا کا سا کی اسٹیشن کے باہر والے دکان داروں سے پوچھا کہ پھر کبھی تمہیں وہ چینی سپاہی جو اس دن سفر کر رہے تھے۔ نظر آئے کہ نہیں۔ ان سب نے بیک زبان یہی جواب دیا کہ ''نہیں جناب ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ اور شاید جہاں ان کو بھیجا گیا تھا وہ وہاں سے کبھی لوٹ کر آئے ہی نہیں۔''

ہایاشی فیومیکو

نرگس

چونکہ وہ ابھی ابھی منہ میں سگریٹ دبائے تامائی کے بستر کے قریب آ کر کھڑا ہوا تھا۔اس لئے مجبوراً اس کو پوچھنا پڑا تھا۔رسالے پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس نے سوال کیا'' کیوں کیسا رہا؟'' اب سا کاؤ اتان سیدھا تو نہ تھا کہ ماں کو ساری روداد سیدھے سبھاؤ سنا دیتا'' کہ اماں۔ایسے ہوا، یوں ہوا، ہوا'' اسی وجہ سے اس کو خود ہی پوچھنا پڑا۔''ارے بھئی بتاؤ نا کیسا رہا۔'' اس نے دانت نکال دیئے۔ایک کشن کو پیر کے انگوٹھے سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا

''کچھ اچھا نہیں رہا............ارے بھئی جانو بات یہ ہے تمہارے اندر ممتا کا وہ تقدس ہے ہی نہیں جو اولاد کے کام آئے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا............ہونہ ممتا کا تقدس نہیں............اور یہ تم کو اپنی ماں کو جانو کہہ کر مخاطب کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔اچھا یہ بتاؤ کہ تم مسٹر تسودا سے ملے؟''

''بالکل ملا۔اور ہاں انہوں نے تم کو 'ہائے'' کہلوایا ہے، جانو۔''

تامائی اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے اس کو گھور کر دیکھا۔''مطلب کیا ہے تمہارا اس لفظ سے ہمارے معاشرے میں ایک لفظ بولا جاتا ہے۔مادری پدری محبت شفقت۔''

''لیکن اماں سے جو کہہ رہا ہوں وہ اس لفظ سے بالکل مختلف اور متضاد ہے میں نے کہا ہے مربیانہ تقدس۔''

تامائی کا اندا ہی اندر خون کھول رہا تھا۔ کس حقارت آمیز انداز میں اس کا اپنا بیٹا اس سے بات کر رہا تھا۔ میری دانست میں تو کوئی ایسی حرکت یا جواز نہیں ہے جس کی بان پر تم ایسے الفاظ میرے لئے استعمال کرو۔ کیا تم کو یاد نہیں کہ تمہارے ابا ہمارا ساتھ کتنی جلدی چھوڑ گئے تھے اور میں نے جو ایک تن تنہا عورت ہی تو تھی تم کو ان ہاتھوں سے پالا پوسا اور جوان کیا ہے اور تم اپنے باپ ہی کی طرح مجھے کچھو کے لگاتے ہو۔ کسی کی اولاد نے کاہے کو اپنی ماں سے اپنی بات کی ہوگی۔ اب تم بائیس ساک کے تو یو چکے ہو۔ تم کاہے کو اپنے لئے ملازمت تلاش نہیں کر لیتے۔ ملازمت کرو اور اب اپنا گھر بساؤ۔ میری خاطر۔ آج تک تو تم اس کوشش میں کامیاب ہو نہیں سکے۔ بات یہ ہے کہ تمہارا رویہ ہی ناروا ہے۔ ہاں تو اور کیا۔ بقول مسٹر کامی یاما کہ ملازمت مانگنے آئے ہیں سگریٹ منہ میں ٹھنسا ہوا ہے، گردن اکڑی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے ستیاناس تو ہونا ہی ہے۔''

''اچھا تو اب پتہ چلا کہ ملازمت کے لئے کسی اہلیت کی نہیں، رویے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تمہارا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی الو کا پٹھا اپنا رویہ درست کر لے تو اس کو ملازمت ملنا یقینی ہے۔'' ساکاؤ نے ہسپانوی سیتادور (بل فائٹروں) کے انداز میں اتنے بڑے بڑے گل مچھے رکھے ہوئے تھے کہ دیکھ کر غصہ آئے۔ ناک کے نیچے اتنے ملائم اور نرم رو میں مونچھوں کی جگہ آ گئے تھے جنہیں دیکھ کر یقین نہ آئے یہ کون جوان لڑکا ہے اور تامائی کے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا۔ کہ یہی وہی لڑکا ہے جو کچھ دن پہلے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ اور اب اپنے پاس یا پہلو میں بستر پر بیٹھا دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی غیر مرد وا ساتھ آ کر بیٹھ گیا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ تم شرافت اور حلیمی سے کسی سے بات نہیں کر سکتے۔ تم کو کوئی بھی تو اچھا نہیں سمجھتا۔

''اس کی وجہ ہے کہ آپ نے مجھے اسی طرح کا اٹھایا ہے۔ تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے مجبوری ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے خلاف آپ سے کسی نے کبھی شکایت بھی تو نہیں کی۔ بتائیں کبھی کسی نے میری شکایت کی؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اپنے بیٹھے کو آلتی پالتی مارے بیٹھا دیکھتی رہی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی خاموشی میں نفرت اور حقارت تھی۔ وہ پھر بولی یقین نہیں آتا کہ ہم دونوں کے درمیان ماں اور بیٹے کا رشتہ ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے کے سوا دنیا میں کون ہے۔ پھر نہ جانے کیوں ہم ایک دوسرے سے الجھتے رہتے ہیں۔ اچھا پھر مسٹر

تسودا نے کہا کیا؟''

''کچھ نہیں، کہنا کیا تھا یہی کہ وہ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے اور مجھے ٹیسٹ دینے کی کوشش کر کے دیکھ لینا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ٹیسٹ دے دیا۔''

''تمہیں اپنے آپ پر بھروسہ ہے کہ پاس کر لو گے؟''

''قطعی نہ۔ انہوں نے سوال ہی اس قدر احمقانہ کئے تھے کہ جواب دینے کو جی ہی نہیں چاہا۔'' ایک مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ساکاؤ نے سگریٹ کا باقی ماندہ ٹکڑا پاس رکھی ہوئی میلی سی ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''کاش تم کم از کم امتحان دینے ہی کے قابل ہوتے۔''

اپنے بیٹے کے چہرے کی کاہلی کے پیش نظر تامائی نے مایوسی سے سوچا تھا کہ یہ زندگی میں کبھی کچھ نہ کر سکے گا۔

''بھئی اگر آپ کا رویہ بھی ٹھیک نہ ہوا اور متحان میں بھی نکمے ہوں تو پھر تو مسٹر تسودا بھی آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔''

''اچھا خیر چھوڑو۔ چلو تم ہی ٹھیک، کہتے ہو گے۔''

تامائی اب اس سوال جواب سے اکتا گئی تھی۔

دراصل عرصہ ہوا وہ اپنے اس بچے سے مایوس اور دلبرداشتہ ہو چکی تھی۔ اور اگر وہ اس کو اپنے آپ سے جدا کر کے کسی اور کو دے دیتی تو شاید آج اس کرب واذیت سے دوچار نہ ہوتی۔

''اچھا انہوں نے تم سے کس قسم کے سوال کئے تھے؟''

''کس قسم کے! ارے میں نے کبھی ایسی باتوں کے بارے میں سوچا اور نہ دلچسپی لی۔ مثلاً یہ کہ فرانس اپنے بحران پر کس طرح قابو پائے گا۔ یا یہ کہ ٹرومین کی عمر کیا ہے۔ لو بھلا میں کیا جانوں ان باتوں کے بارے میں میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں۔''

''اچھا چھوڑو، میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔'' تامائی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اس نے تولیہ کی بنی ہوئی شب خوابی کی نائٹی پہن رکھی تھی۔ اور اس پر ریشمی کومونو کی جیکٹ پہنتے ہوئے وہ غسل خانے کی طرف چلی تا کہ کیتلی میں کچھ پانی گرم کر لے۔

جب وہ واپس آئی سوکاؤ اس کے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر کچھ کرید رہا تھا۔

''کچھ نہیں، مجھے کچھ پیسے چاہئے ہیں؟''

''چاہے جتنا کریدو۔ ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا۔ تم واقعی اب بگڑ گئے ہو۔ خدا کے واسطے اپنی ماں کو جلانا بند کردو اب۔ تم آخر مجھے اس قدر پریشان کیوں کرتے ہو۔ آخر چاہتے کیا ہو؟''

سوکاو کے ہاتھ ایک ناخن گھسنے والا نیل فائل لگ گیا تھا اور وہ اب تیزی سے اپنے ناخن گھس رہا تھا۔

''مذاق کررہے ہونا میرے ساتھ۔''

ارے اماں کوئی تمہاری جیب کاٹ رہا ہے اور نہ ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے ساکورائی سے آج رات اس کے پاس جانے کا وعدہ کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ میرا جیسا پلا پلایا شخص بلا ٹکٹ تو سفر کرہی نہیں سکتا۔ بس کرائے بھر کے پیسے ٹٹول رہا ہوں۔''

تامائی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پانی سے بھری کیتلی بجلی کے ہیٹر پر رکھ دی۔ اور وہاں سے ہٹ کر کھونٹی سے ٹنگے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور بالکل ساکت ہوکر آئینے کو تکنے لگی۔ اسے اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا بڑا قلق تھا، اب وہ تینتالیس سال کی ہوچکی تھی۔ اس کو یوں محسوس ہورہا تھا کہ اس نے اتنی عمر کاہلی میں ہی گنوادی۔ حالانکہ یہ بات نہیں تھی۔ وہ اپنے بچے کے لئے پاگلوں کی طرح کام اور محنت کرتی رہی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اس کو یہ خیال بھی آتا تھا کہ اگر وہ اس طرح بچہ کی ماں نہ بنی ہوتی تو ہوسکتا ہے کہ وہ اچھی اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی گذار رہی ہوتی۔ لیکن یہ عمر جو ہوتی ہے نا عورت کی چاہے وہ کیسی ہی جان توڑ محنت کیوں نہ کرے، اس کو واپس لانے کے لئے پھر دوبارہ لوٹ کر نہیں آتی۔ بس ایک بار جوانی ڈھلی سو ڈھلی۔

اس نے اپنے موٹے خشک بالوں میں کنگھا کرنا شروع کیا۔ اس کے سیاہ چمکیلے بالوں کی رنگت بھوسلی بھوسلی ہوگئی تھی۔ بال چھدرے چھدرے اور ہلکے بھی ہوگئے تھے اور یہ نتیجہ تھا جوان کی بے راہ روی اور کثرت شراب نوشی کا۔ تامائی نے اپنے سر میں تیل خوب چپڑ رکھا تھا۔ بالوں کو سامنے کی طرف لاکر جوڑا بنایا اور پھر کنگھے سے پلٹ کر پیچھے کی طرف کردیا۔ اس طرح کرنے سے اس کے رخساروں کی اوپر کی اٹھی ہوئی ہڈیوں کے تاثر میں کافی فرق پڑ گیا۔ اور اب اپنے چہرے کے تاثرات بدلنے کے لئے وہ ایک ماہر سرجن کی سی مشاقی اور مستعدی سے اپنے چہرے کے تاثر کو تبدیل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فی الحال تو بال پیچھے کو الٹ لینے سے اور بھی بوڑھی اور خرانٹ شکل نظر آرہی تھی۔ کیتلی کا پانی اب خوب ابل رہا تھا۔ ابلتا ہوا پانی تسلے میں ڈال

کر اس میں تولیہ بھگولیا۔ اور گرم گرم بھاپیں اٹھتے تولیے کو منہ پر لپیٹ لیا۔ تولیے کی گرمی اور بھاپ کی نسبت سے اس کی آنکھوں کے پپوٹے پھڑ کنے لگے تھے۔

''کہاں کی تیاریاں ہیں۔ اماں جی کیا باہر جا رہی ہو؟''

''ہاں بھی کمائی کرنے چلی ہوں۔''

''ارے بھئی کیا اور کہاں کے امکانات مگر میں بھی تو مجبور ہوں۔''

تامائی نے چہرے پر سے تولیہ ہٹا کر آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ چہرے پر تازگی اور بشاشت آ گئی تھی۔ جلد کی رنگت میں گلابی پن اور سرخی نمایاں ہو رہی تھی۔ کاش اس کی جلد ہمیشہ ایسی نظر آیا کرتی۔ لیکن اب تو اس نے اپنے چہرے پر مٹی کے تیل کی بدبو والی کولڈ کریم تھوپ لی تھی۔ وہ اپنی کٹھیلی انگلی کی مدد سے اپنی آنکھوں کے حلقوں کی تیزی سے مالش کر رہی تھی۔ چہرے پر تیل چمک رہا تھا۔ چہرے کے میک اپ کے بعد اس نے اپنے بالوں کو جوڑے دوبارہ آگے کر کے کھول دیئے۔ اور اپنے جھریائے ہوئے پپوٹوں پر روز کے چھوٹے چھوٹے ٹپے ڈال کر اس آئینے کے سامنے سے چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنا جائزہ لیا۔ تسلے کا کنکنا اور میلا کچیلا پانی اس کی غربت اور افلاس کی گواہی دے رہا تھا اور اس کو دیکھ کر اس پر غصہ اور بغاوت طاری ہو گئی۔ شاید وجہ یہ تھی اس کو حمام میں گئے پانچ روز ہو گئے تھے۔ اس کے میک اپ کئے ہوئے چہرے پر ذرا رونق نہ تھی۔ ہونٹ اتنے خشک ہو گئے تھے کہ لپ اسٹک پوری طرح پھیل نہ سکی۔ اور ہونٹوں کی یہ صورت ہو گئی جیسے کچی ٹونا مچھلی کے بے رنگ ٹکڑے۔

''مما آپ پہلے جیسی توانا نہیں رہی ہیں۔'' ویسے آپ کا خیال ہے کہ ابھی آپ بہت چاق چوبند ہیں اور آپ پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا؟''

''ارے بھئی، اب تم اماں کی جان بھی چھوڑو گے کہ نہیں............اب تم میرا پیچھا چھوڑ دو اور جا کر یا تو ساکورائی کے پاس کمرہ کرائے پر لے لو یا پھر کہیں اور رہو۔ دیکھو! اماں اب واقعی تھک گئی ہے............اور سون پچھلے جنم میں ہم ایک دوسرے کے حریف اور دشمن تھے۔ یہ ہمارا مقدر تھا کہ اس جنم میں بھی ہم ایک دوسرے کے دشمن ہی بنا کر بھیجے گئے۔ کیا تم کو مجھ پر رحم نہیں آتا کہ مجھے اپنی قید سے آزاد کر کے میرے حال پر چھوڑ دو۔ تم اب بڑے ہو جوان ہو تمہیں میری کوئی ضرورت نہیں۔ اور میری طرف سے تم جو چاہو کرو مجھے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں تمہاری کوئی شکایت سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں اپنے فعل کی خود مختار ہوں۔

بس مجھے ایک بات کی فکر ضرور ہے کہ تمہاری صحت اچھی نہیں رہتی ہے اور تم بہت جلد بیمار پڑ جاتے ہو۔ خیر، وہ الگ بات ہے۔ جب ایسی بات ہوگی میں سنبھال لوں گی۔ دیکھو میری بات سنو تم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر آزاد اور خود مختار زندگی گذارنا نہیں چاہتے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ اس طرح تم کو بھی سکون ملے گا۔

''میں سمجھ رہا ہوں اب میں تم پر بوجھ بن گیا ہوں اور تم مجھے اپنے راستے کا روڑا سمجھنے لگی ہو۔'' ساکاؤ کہنے لگا۔

''ویسے تو میرے نزدیک علیحدگی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ تم مجھے اب الگ کرنا چاہتی ہو۔ اچھا اگر ایسی ہی کوئی بات ہے تو میں تم کو اماں کے بجائے باجی کہا کروں گا۔ جیسے پہلے کہا کرتا تھا۔'' تامائی حد سے زیادہ آزردگی سے لپ اسٹک سے اپنے ہونٹ رنگنے کی کوشش کرتی رہی۔ سوکاؤ کہنے لگا۔ ''میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔''

وہ آئینہ میں اپنی شکل دیکھ رہی تھی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی چمک تھی۔ تامائی کہنے لگی۔ ''خیر جو کچھ بھی ہو اب اماں میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ ایک ہی کمرے میں گذار سکے۔ بات یہ ہے کہ تم خود موپاساں کی تصنیف ایک عورت کی زندگی پڑھا کرتے ہو اور میں نہیں چاہتی کہ اس عورت کی طرح تمہارے ہاتھوں قتل ہو جاؤں۔''

''بھئی واہ کیا لطیفے کی بات ہے۔ اماں اب اتنا بھی مبالغہ نہ کرو۔ بھلا اپنی ماں کو بھی کوئی قتل کر سکتا ہے۔ میں تمہاری پرواہ بھی کب کرتا ہو۔ میں تو تمہارے بارے میں اتنا بھی نہیں سوچتا جتنا اپنے ناخنوں میں بھری میل کے بارے میں سوچ لیتا ہوں۔ جوتی کی نوک پر مارتا ہوں۔ تمہیں۔ بات یہ ہے کہ اس دنیا میں آنے کے لئے میں نے یسوع مسیح کی مانند تمہارے پیٹ کا وسیلہ ہی تو مستعار لیا تھا۔''

''اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ اب تم بھی پر پرزے نکال لو نا۔ خوب آزادی سے اڑتے پھرو نا۔ اب اسکا کوئی جواز نہیں کہ میں تمہارا پوٹا بھرتی رہوں۔ بس اب حد ہوگئی ہے تم بڑے ہو گئے ہو۔'' تامائی بجلی کے ہیٹر کے سامنے بیٹھی تھی اس نے سبز رنگ کی پھٹی پرانی جیکٹ پہنی اور کالے رنگ کی سلکیکیشن چڑھالی۔ اور پیروں پر باریک اونی موزے پہننے کے بعد اپنے ناخنوں پر سرخی کی تہیں جمانے لگی اور اپنے ہاتھوں کو ہیٹر کی سرخ انگارہ سلاخ کے اوپر گھما گھما کر گرم کرتی رہی۔ ساکاؤ اس کے ہاتھوں کی طرف بالکل خالی الذہن کیفیت سے دیکھتا رہا۔ ان کو دیکھ کر کوئی اور خیال ذہن

میں آ ہی نہیں رہا تھا، بجز اس کے جیسے کسی چڑیل کے پنجے ہوں۔اس خیال نے کہ آج تک اس کی ماں کے منہ سے اس کے لئے ایک میٹھا بول تک نہیں نکلا اس کے اندر نفرت اور غصہ کی ایک موج بل کھانے لگی۔ اور اب اس کے اندر ایک شدید خواہش سر اٹھا رہی تھی کہ وہ اس کی کو اچھی طرح کچو کے لگائے۔

''افوہ! جوں جوں تمہاری عمر آ رہی ہے۔ تمہارے ہاتھ کتنے گھناؤنے نظر آنے لگے ہوں۔''

''اچھا.........تم سے مطلب، چلو اپنے کام سے کام رکھو، کبھی سوچا ہے یہ ہاتھ اتنے گھناؤنے کس نے کر دیئے.........صبح سے شام تک کام کر کے گھر واپس آئی تو لکڑیاں کاٹنا آگ جلانا پھر پکا کر تم کو ٹھنسانا......ان ہی ہاتھوں سے۔''

اچھا تو آج پتہ چلا کہ تمہارے ہاتھ اتنے گھناؤنے اور بدصورت کیسے ہوئے۔''

''اپنے ہاتھوں اور ناخنوں کی درستگی سے فارغ ہو کر تامائی نے ایک چیتھڑے سے اپنے چمکیلے اور روغن چڑھے ناخنوں کو رگڑا اور پھر اپنے ہاتھ نیم گرم پانی میں ڈبو دیئے۔ اپنے ہاتھوں کو صابن کی پٹی کے باقی ماندہ ٹکڑوں سے مل مل کر اچھی طرح دھویا۔ اور جھٹک کر پانی سے صاف کر کے تولئے سے خشک کرنے بعد اپنی آنکھوں کے قریب لا کر ان کا جائزہ لینے لگی۔

اچھا اب میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ میں مذاق تو نہیں کر رہی۔ جہاں سینگ سمائیں چلے جاؤ۔ واقعی میں اب تم سے قطعی بیزار ہو چکی ہوں۔

ساکاؤ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں وہ تھوڑی دیر اپنا سر دیوار سے ٹکراتا رہا۔ تامائی نے اپنا کوٹ کندھوں پر ڈالا۔ ایک پیالی میں کیتلی کا باقی گرم پانی انڈیلا اور راشن سے ملنے والی گڑ والی چینی ملا کر پی لیا۔

''اماں تم نے کبھی مجھ پر محبت کی نظر نہیں کی۔ کبھی شفقت بھرا خیال بھی نہ کیا۔ کیوں اماں کبھی کیا ہے؟'' اس نے اچانک ہی پیالی اپنے لبوں سے پھسل جانے دی۔ اس نے اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھا۔ وہ بہت ہی خستہ اور درماندہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اس وقت بالکل اس کے شوہر کی طرح دکھائی دے رہا تھا جس سے اس نے اس کی جوانی ہی میں طلاق لے لی تھی۔ میں نے تم سے بہت محبت کی ہے، لیکن میں کیا کروں۔ زندگی نے میرا بری طرح ناطقہ تنگ کر رکھا ہے اور ایسے بھی وقت مجھ پر گذرتے ہیں جب میں اپنی ساری توجہ تم پر مرکوز نہیں کر سکتی تھی۔ میں تم سے

محبت کیوں نہ کروں گی بیٹا۔ مجھے تو تم سے اس وقت بھی پیار تھا جب تم میرے پیٹ میں تھے اور مجھے دکھ دیا کرتے تھے۔ ساکاؤ اس وقت تھے جب تم بہت ننھے سے تھے اور اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ تمہاری نظریں بھی اب مختلف انداز میں مجھ پر پڑتی ہیں جیسے کوئی اجنبی میری طرف دیکھتا ہو۔ اماں اور ساکاؤ اب دو مختلف ہستیاں ہیں۔ تم محسوس کر سکتے ہو ہم کس انداز کے ماں بیٹا ہیں............اور بات یہ ہے کہ اب میں جس جگہ پر کھڑی ہوئی ہوں وہاں سے پلٹ نہیں سکتی۔ میرے اندر کام کرنے کی بے انتہا اور خواہش ہے۔ لیکن جب میں تمہاری نفرت کا حقارت کا سامنا کرتی ہوں تو مجھے شدید تکلیف ہوتی ہے اور کوئی بھی خوش آئندہ احساس میرے اندر سر نہیں اٹھاتا۔ ساکاؤ تم مجھ پر بوجھ بن گئے ہو۔'' اپنی پھٹی ہوئی جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ساکاؤ نے میں اکو پیش کیا۔ تامائی نے سگریٹ لے لیا اور اپنے منہ میں دبا لیا۔ ساکاؤ نے بھی ایک سگریٹ منہ میں دبا لیا۔ اور ماچس کی تیلی جلا کر دونوں سگریٹ جلا لئے۔ ''ٹھیک ہے پھر میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ ایک کے پاس چلا جاؤں۔ ٹھیک ہے نا؟'' ایک کا نام سن کر وہ بولی۔ ''ہاں بالکل اور اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی تو نہیں۔ ٹھیک ہے پھر یہی کرلو۔ جب تمہاری ماں تمہیں نہیں کھلا سکتی تو پھر اب تم ایک ہی سے کہہ سکتے ہو کہ وہ تم کو اور کما کر کھلائے، معلوم نہیں کیا بات ہے کہ تم ایک جوان آدمی کی حیثیت سے خود کما کر نہیں کھا سکتے اور تمہیں کسی نہ کسی عورت پر بھروسہ نہیں کر سکتے، اول تمہارے اس کے درمیان عمر کا بڑا فرق ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب لوگ تمہارے اور اس کے بارے میں باتیں بناتے ہیں اور مجھے بڑی شرم آتی ہے۔''

تامائی تائبی میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے والد ریلوے کی سڑک کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔ اس کی پرورش اور پرداخت سخت توجہ اور محنت سے کی گئی تھی، جیسا کہ ایک سرکاری افسر کی بیٹی نگہداشت ہوسکتی ہے۔ پھر اس کی ملاقات ایبی ناؤ کی سی ہوئی۔ جو آموائے کے ایک مذہبی اسکول سے فارغ التحصیل ہو کر یہاں آیا تھا۔ ایک ایسے گھرانے میں ایک ماہ سے ٹھہرا ہوا تھا، جن سے اس کی واقفیت تھی۔ کچھ عرصہ واقفیت کے بعد وہ دونوں ٹوکیو آ گئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اسی موسم بہار میں، ہی انیس برس کی ہوگئی تھی اور ایک سال پہلے اس نے لڑکیوں کے ایک اسکول سے گریجوایشن کیا تھا۔ ٹوکیو پہنچ کر انہوں نے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا اور اس کا کرایہ پندرہ ین ماہانہ تھا۔ اور یہ اوئی متسوزوشی گایا میں واقع تھا۔

ان ہی دنوں ساکاؤ پیٹ میں آ گیا۔ ایبی کی خواہش تھی کہ وہ امریکہ جا سکے۔ لیکن اس کی

غربت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ بمشکل اپنے کنبے کی گذر بسر کے لئے کما سکتا تھا، وہ ایک بہت معمولی سے مذہبی رسالے میں کام کر رہا تھا بطور مددگار مدیر کے۔ پھر تامائی کے اسکول کی ایک سہیلی اکاواتازوکو اسکول کی تعلیم مکمل کر کے ٹوکیو آئی تاکہ یہاں موسیقی کے کسی اسکول سے انٹرنس کا امتحان دے سکے۔ اتفاقاً وہ اسی گھر کی دوسری منزل میں مقیم تھی جس کے نیچے تامائی رہ رہی تھی۔ تامائی کو پتہ بھی نہ چلا اور ایبی اور تازوو کے آپس میں تعلقات قائم ہو گئے۔ لیکن کہاں تک دو ایک ماہ کے اندر ہی تامائی اس حقیقت سے آگاہ ہوگئی۔ اور اب وہ ہر روز تازوکو کی ایسی کی تیسی کرتی۔ بڑا ہنگامہ کرتی۔ تازوکو ایک دبو قسم کی عورت تھی۔ روز روز کی نکا فضیحتی سے بوکھلا کر اس نے موسیقی پڑھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ بالکل ہی خالی الذہن اور نکمی سی ہو کر رہ گئی۔ پھر روز روز کے جھگڑے سے عاجز آ کر اس نے وہ گھر بھی چھوڑ دیا اور دوزاکا ہنگو کے علاقے میں تین کمروں کا گھر لے کر رہنے لگی۔ یہ علاقہ تو دوزاکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی تبت کے بدھ کی پتھر کی مورتی کا استھان بھی تھا۔ اور یہاں شہر کے اندرونی علاقے کے تھوک فروشوں کے اسٹوروں میں کام کرنے والے رہا کرتے تھے۔ جس وقت تازوکو مکان تبدیل کر کے یہاں رہنے کے لئے آئی تھی تو تامائی گھر پر موجود نہ تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے کانوں میں بھنک پڑ گئی کہ تازوکو کہاں رہتی ہے۔ چنانچہ ایک دو دوزاکا والے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح گھر میں گھسی اور تازوکو بالوں سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر لے آئی۔ یوں اس گھر میں منتقل ہونے کے تقریباً چھ ماہ بعد تازوکو نے خودکشی کر لی۔ وہ گیس سے اپنا دم گھونٹ کر ختم ہو گئی۔ اس واقعہ سے بدلد ہو کر آ بی نے ملازمت چھوڑی۔ اور ہوا کے ایک آوارہ جھونکے کی مانند وہ نکلتا ہی چلا گیا۔ پہلے ایموائے گیا۔ اور ایموائے سے ملایا اور کوالالمپور پہنچا اور یہ تقریباً انیس سو اٹھائیس کی بات ہے اور آ بی کے بارے میں وقتاً فوقتاً افواہیں تامائی کو ملتی رہیں۔ اب اس کو آ بی سے انتہائی نفرت ہو چکی تھی۔ اسے کے ساتھ مرنے والی تازوکو سے بھی شدید نفرت کا اظہار کرتی رہتی تھی۔ جب بھی تازوکو کا خیال آتا وہ غصہ اور نفرت سے کانپ جاتی اس کی شکل اس کی آنکھوں میں گھوم جاتی اور وہ اس کی آنکھوں کے حلقوں کے گرد اور ناک پر تل تک نظر آنے لگے تھے۔ وہ رہ رہ کر تامائی کے خیالوں میں ایک آسیب کی طرح ابھرتی تھی اور خصوصاً یہ بات کہ اس نے گیس کی ربڑ والی نالی اپنے منہ میں ڈال کر اپنا دم گھونٹ دیا۔ اب مصیبت یہ تھی کہ ساکاؤ کی آنکھوں کے حلقوں کے آس پاس بھی بھورے بھورے تل تھے۔ بس ان پر نظر پڑتے ہی اسے عجیب گھن سی

آنے لگتی۔ اس کو محسوس ہونے لگتا گویا تازوکو کا سارا غصہ اور گلہ شکوہ ساکاؤ کی آنکھوں کے گرد چمٹ گیا ہے۔ گذراوقات کے خیال سے اس نے آبی کے ایک واقف کار کی مدد سے مذہبی رسالے میں کام شروع کر دیا۔ مگر تنخواہ اتنی کم تھی کہ ماں اور بیٹے کی گذربسر ہونا محال تھی۔ ایک بار والدین کے گھر سے نکل آنے کے بعد اسکا تابی میں اپنے خاندان سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی روزی کمانے کے سلسلے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ تاہم ایک مرد سے دوسرے مرد تک ایسا سلسلہ قائم ہوا کہ لگتا تھا کہ تنی ہوئی رسی ہے کہ جس پر وہ چڑھتی چلی جارہی ہے۔

جب سوکاؤ بچپن سے لڑکپن کی سرحد میں داخل ہوا تو اس کے اندر برے بھلے کی تمیز اور پہچان بھی پروان چڑھی۔ اور اس کو اپنی ماں کے طرز حیات اور مشاغل پر اعتراض بھی ہونے لگا تھا۔ ماں کی حرکتوں اور افعال کی کوئی صراحت اور جواز اس کے ذہن میں موجود نہ تھا بلکہ اس سبب سے وہ بڑا مضطرب اور بے کل سا رہنے لگا تھا۔ اس لئے کہ اس کا ناپختہ ذہن میں لڑکپن کی معصومیت اور تقدس ابھی زندہ تھا۔ اور وہ ماں کی حرکتوں کو نہ صرف بری نظر سے دیکھتا تھا، بلکہ یہ سب اس کے لئے ناقابل فہم بھی تھا۔ کچھ عرصے بعد دونوں ماں بیٹے تنہا زندگی گذارنے لگے اور اب گھر میں کوئی ملازمہ بھی موجود نہ ہوتی تھی تو اس کو اپنی ماں کا راتوں کو غائب رہنا بہت کھاتا تھا۔ اب تو دونوں عرصے سے یوں رہ رہے تھے۔ جیسے دو ریلیں ایک دوسرے کے قریب سے گذر جاتی ہوں اور بس کراس ہی کرتی ہوں ایک دوسرے کو۔ ایک تو اماں کا یہ کہنا تھا کہ اتنا بڑا سکول میں پڑھتا ہوا لڑکا اس کو اماں کے بجائے باجی کہے............ کسمپرسی کے سبب وہ بہت مایوس رہنے لگا۔ گھر گھسنا ہو گیا لوگوں سے اور اس کے اسکول کے ساتھیوں سے ملنے جلنے سے گھبرانے لگا۔ اور نوبت یہاں تک آگئی کہ اسکول کا کام بھی کرنا چھوڑ دیا۔ پرواہ ہی نہ کرتا۔ اور ابھی اس نے مڈل کا امتحان دیا تھا کہ سستی اور لدھڑ پن کا شکار ہو گیا۔ اور اب مکمل طور پر ہر بات اور کام میں ماں ہی پر انحصار کرتا۔ تامائی نے اس کا نام ایک پرائیویٹ اکیڈمی میں لکھوا دیا۔ کمزور صحت کے باعث وہ جنگی خدمات کے قابل نہ تھا۔ اور ماں جبری بھرتی سے بچانے کے لئے اس کو لئے جگہ جگہ چھپتی اور نظروں سے بچتی پھرتی تھی۔

جنگ کے خاتمے پر تامائی نے ایک واقف کار کے گھر کا ایک کمرہ کانجی میں کرائے پر لیا اور ساکاؤ کے ساتھ وہاں رہنے لگی...... وہاں اس نے اخبار میں ایک گھٹیا سے ہوٹل میں خادمہ کا

اشتہار دیکھا۔کاروبار محبت کا یہ ہوٹل اکی بکارو میں تھا۔اوراس طرح وہ گھر سے بالکل ہی کٹ کر رہ گئی۔ یہاں اس کا واسطہ کالا دھندا کرنے والوں سے تھا جو ہوٹل کے مستقل گاہک تھے۔اس طرح وہ غیر ملکی منشیات کے دھندے سے متعلق ہوگئی اور تھوڑی بہت رقم بھی جمع کر لی مگر ہوتا یوں تھا کہ ادھراس نے کچھ رقم پس انداز کی نہیں کہ ساکاؤ نے اڑا دی۔ابھی وہ بچت اور رقم کو پس انداز کر کے پوری طرح سکھ کی سانس بھی نہ لینے پاتی کہ رقم ساکاؤ کے ہتھے چڑھ جاتی اور وہ سارا پیسہ اڑا کر بیٹھ جاتا اس طرح دونوں کے درمیان تلخی اور کشیدگی بڑھتی رہی۔کبھی کبھی تامائی کا جی چاہتا کہ وہ اس کو قتل کر دے۔تامائی کو یہ بھی اندازہ نہ تھا آ بی زندہ ہے یا مر گیا۔اس کو گئے ہوئے بیس سال سے زیادہ گذر گئے تھے اوراس کے درمیان اس کی کوئی خبر نہ ملی۔

کچھ عرصے کے بعد ساکاؤ نے ایک عورت سے تعلق قائم کرلیا۔اوراس نے اپنی ماں کو انتہائی انتہائی ڈھٹائی سے بتایا کہ وہ عورت ایک شادی شدہ رقاصہ ہے۔ایک دن یہ ہوا کہ وہ واپس آئی،اتفاقاً وہ اس روز جلدی واپس آ گئی تھی۔تو اس نے دیکھا کہ ساکاؤ ایک عورت کے ساتھ سویا پڑا ہے۔یہ دیکھتے ہی وہ آپے سے باہر ہوگئی۔بیٹے کی عورت کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اوراس پر اس طرح ٹوٹ پڑی جیسے کبھی تازو کو پر جھپٹی تھی۔وہ عورت تو ایسی بھاگی کہ کبھی مڑ کر نہ دیکھا۔وہ تامائی کے وحشی پن سے خوف زدہ ہوگئی تھی۔لیکن ساکاؤ ماں کو دہلانے اور پریشانی کو کہتا رہتا کہ وہ تو اب اپنے خاوند کو چھوڑ رہی ہے۔اور کہتی ہے کہ مستقل طور پر یہاں آ کر رہے گی۔

ساکاؤ اپنی ماں کو قطعی پسند نہ کرتا تھا اس سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔وہ تو اس کو اس سے زیادہ وقعت نہ دیتا تھا کہ اس سے کے وسیلے سے دو وقت کی روٹی پیٹ میں پڑ جاتی تھی۔دراصل اس قسم کی جنگلی وحشی عورت کی گود میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے اس کو حقیقی محبت اور الفت کا کوئی تصور تھا ہی نہیں۔بچپن ہی سے بوڑھوں جیسی کاہلی اس پر طاری رہتی تھی۔اور کسی بھی اقدام یا حرکت کے لئے وہ کسی نہ کسی عورت کے ارادے کا منتظر رہتا۔اب وہ پھر بولا اگر تم مجھ سے علیحدگی چاہ رہی ہو،تو یہ میرے حق میں بھی اچھا ہوگا۔تاہم مجھے اس معاملے میں ایکو سے بات کرنا پڑے گی۔ اچھا،یہ سمجھ لو یہ اتنی آسان بات نہیں ہے کہ اب جو اپنے عاشقوں اور خریداروں کے ساتھ شب بسری کے کمرے کا فالتو کرایہ تو متیا کو دیتی وہ پیسے بچیں گے۔تو وہ اسی کمرے کو آراستہ کر کے شب باشی کے قابل بنا لے گی۔

کمرے سے پورچ تک جھاڑو لگا کر دھول مٹی اور کوڑا وہ پتلے سے صحن میں پھینک دیا کرتی

تھی اوراب کوڑے کا ایک ڈھیر بن گیا تھا۔ایک آوارہ بلی نے آکر اسے بکھیر دیا۔ جاپانی سرو کی باڑھ جو اس تنگ سے احاطے کے گرد کھڑی تھی، تقریباً سوکھ رہی تھی۔ ایک روز ایک اٹھائی گیرا اچکا سا چور باڑھ کے شگاف میں سے اندر آکر اس کے جوتے اٹھا لے گیا تھا۔ وہ اتنی غلیظ اور گندی تھی کہ مالک مکان نے اس کو کبھی اپنا باورچی خانہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ پچھلے چند دن سے وہ بیمار تھی۔ بڑھاپے یا ناتوانی کے باعث وہ بستر میں ہی گھسی پڑی رہی تھی۔ کچھ کرنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔اوپر سے نیا سال سر پر کھڑا تھا۔لیکن اس کے گھر میں کسی قسم کی تیاری کے آثار تھے ہی نہیں۔اس نے بھی نئے سال کا تہوار منانے کا خیال ہی ترک کر دیا۔حتیٰ کہ چاول کے کیک کا ایک ٹکڑا تک گھر موجود نہ تھا۔

اب اگر چہ اس نے بدقت اپنے آپ کو کھینچ کر کھڑا کر لیا اور باہر جانے کو تیار ہوگئی تھی۔تاہم باہر جانے کے خیال سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔کل کی بارش کا کیچڑ ااور پانی ابھی تک سڑکوں پر کھڑا تھا۔اواس کو کھڑاویں پہن کر باہر جانے کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی۔

''ساکاؤ تم واقعی کرنا نہیں چاہتے ؟'' اس نے بیٹے سے سوال کیا۔ساکاؤ دھیمے دھیمے سروں میں سیٹی بجا رہا تھا۔کندھے جھٹک کر بولا۔

''نہیں مجھے کوئی خواہش نہیں۔ ہر ایک بات تو میرے خلاف جاتی ہے۔ میں کچھ بھی تو کرنے جوگا نہیں۔ جب تک کہ اماں یا ایکو میرے آس پاس نہ ہو، مجھے تو زندگی بھی ایک عذاب ہی محسوس ہوتی ہے۔آپ اکیلے تو نہیں لڑ سکتے، ایک سے دو کا ہونا ضروری ہے۔اس نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا اور اگر تم پسند کرو تو میں کالے دھندے کی بات کرلوں تو متیا سے؟'' تامائی نے پوچھا۔

ساکاؤ اپنے کندھے جھٹکتا اور گھٹنے ہلاتا رہا۔ پھر بولا: میں نے ساکورائی کے ساتھ مل کر شیبویا میں فاؤنٹین پن بیچنے کی کوشش کی تھی۔ پھر ساکورائی کے بڑے بھائی کو کام مل گیا اور وہ یوں کہ یوں ہی پڑے رہے۔ عجیب مضحکہ خیز صورت حال تھی۔ میرے اندر کاروبار کا مادہ ہے ہی نہیں۔ مجھ سے تو ایک بھی نہیں نکلا۔البتہ جب میں نے ایکو سے کہا تو اس نے چھ قلم بیچ دیئے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ایسی چیزیں اگر کوئی خوش شکل اور خوش وضع عورت بیچ رہی ہو تو وہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔جس طرح ساکاؤ نے اپنی عورت کی تعریف کی تھی اس سے تامائی دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ذرا دیکھو تو کوئی ندامت یا جھجک نہیں محسوس کر رہا ہے۔اس کی

اس طرح تعریف کرتے ہوئے...... پھر جل کر بولی: ''اچھا! ہاں! کیا واقعی ایکو کی شکل اچھی ہے۔ اس موٹی بھینس میں ایسی کیا خوبی ہے۔ اچھا کیا اسے دیکھ کر یہ نہیں محسوس ہوتا کہ پانی سے بھری ہوئی مشک ہو۔'' خیر مجھے وہ حسین لگتی ہے اور بس۔ چاول کے کیک جیسی نرم اور چکنی جلد ہموار اور صاف ستھرا پیٹ، خوش رنگ جلد۔

''چلو جاؤ بھی۔ خوبصورت ہے! ہونہہ بات یہ کہ لے دے کہ یہی ایک عورت تو تم نے دیکھی اور برتی ہے۔ پہلی پہلی عورت۔''

''اچھا خیر، تم تو اپنی جوانی میں بھی کبھی ایسی نہ تھیں۔''

تامائی نے سرکنے والا دروازہ جو پورچ میں کھلتا تھا، سرکایا۔ موسم کی نمی اور کیچ کیچ کے باوجود آسمان صاف شفاف تھا۔ موسم اتنا گرم نہ تھا کہ زمین سے اٹھتی ہوئی بھاپ کھیتوں اور قابل کاشت اراضی پر رقصاں نظر آتی۔ کئی دن تامائی نے اپنی سرخ رنگ کی انڈر ویئر الوتی کے نیچے سوکھنے کے لئے ڈالی تھی۔ پڑے پڑے وہ خاصی غلیظ اور جاپانی پھل کی چھلکوں کی طرح مڑی تڑی نظر آ رہی تھی۔

دن ڈھلے تامائی اور ساکاؤ ساتھ ساتھ ہی نکلے۔ وہ کیجی جوجی کی طرف مڑ گئی، جو ساکاؤ کے راستے سے مخالف سمت میں واقع تھا۔ اس نے دو رویہ درختوں والا کشادہ راستہ پکڑ لیا اور پھر اس کو کاٹ کر پارک کے بیچ والے راستے سے یوکی کے گھر پہنچ گئی۔ اور وہاں جاتے ہی اس نے سپرنٹنڈنٹ سے تو متیا سے فون پر بات کرنے کے لئے کال مانگی۔ لیکن وہاں سے جواب ملا کہ کچھ دن پہلے وہ کسی کاروبار کے سلسلے میں گیا ہوا ہے اور تین جنوری سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ یہ بات اس کو عجیب لگی۔ ابھی کچھ دن پہلے تو ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ سال نو سے پہلے ایک بار وہ دونوں لوکی کے گھر پر ملیں گے۔ چنانچہ اب وہ خود کا یا تاماجی والے دفتر میں چلی گئی۔ ایک عورت نے یہ جواب دیا کہ تو متیا کو ز کام تھا اور وہ چار پانچ دن کے لئے باہر گیا ہوا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سی بات کا یقین کرے۔ لیکن اس کو اندر سے پریشانی ہو رہی تھی کہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔ کیا گڑ بڑ ہے؟ یہ معلوم کرنے کے خیال سے وہ شمورن جا کو پہنچی۔ جہاں پر تو متیا کا گھر تھا...... وہ دیوار کے بالکل قریب جا کر کھڑی ہو گئی کہ کوئی پھاٹک سے باہر نکلے تو اس سے دریافت کرے۔ کچھ دیر بعد ایک جوان سی عورت جو سلیکس پہنے تھی، باہر آئی۔ اس کو دیکھ کر تامائی نے یہ ظاہر کیا کہ وہ دفتر سے کوئی ضروری پیغام لائی ہے۔ ''میں کمپنی سے مسٹر تو متیا کے لئے بڑا

ضروری پیغام لائی ہوں کیا وہ اندر ہوں گے۔''''ارے نہیں۔ وہ تو کسی کاروبار کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور تین جنوری تک واپسی کی امید ہے۔''

''یہ تو بڑا خراب کام ہو گیا۔ مجھے تو کمپنی کی جانب سے ایک اہم اور فوری کام سے بھیجا گیا ہے۔ اچھا تو یہ کسی بزنس ٹرپ کا سلسلہ تو نہیں ہے؟ یقیناً وہ کمپنی کے کام سے تو گئے نہیں ہیں۔'' ہاں آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں گی۔ ٹھیک ہے میں بیگم صاحبہ سے پوچھ کر آتی ہوں۔ خادمہ پھاٹک کی طرف واپس چلی گئی۔ تامائی جلدی سے گھوم کر دوسری طرف ہوئی اور تیزی سے اسٹیشن کی طرف لپکی۔ اندھیری اور تنگی شہر کے ساتھ والی نہر پر چلتی ہوئی وہ نہر کے پانی کی مہک کو محسوس کر رہی تھی۔

جب کونچی میں ریل سے اتری تو اچانک ہی اس کا ارادہ بدل گیا۔ اور اس نے سوچا کہ وہ کامی یاما کے یہاں چلی جائے۔ وہ وہاں پہنچی تو وہ رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ خوب نمایا، دھویا، چکنا چپڑا بنا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے شراب رکھی تھی وہ جھینگوں کے انڈوں کے خاگینے کے ساتھ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ اس نے تامائی کو ایک پیالہ پیش کرتے ہوئے کہا''ایک جام کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا........... چلے گا؟'' کامی یاما کی بیوی بھی ٹھنڈی ٹھنڈی اور صاف وستھری نظر آرہی تھی۔ اس کے بال گردن سے اوپر تھے۔ وہ ابھی بیوٹی پارلر سے آئی تھی۔ چاہے میں جب بھی آؤں تمہارے یہاں...... تمہارا گھر شادمانی اور مسرتوں سے ہنستا ہوا محسوس ہوتا ہے...... مجھے تم پر رشک آتا ہے اتسوکو۔ تم خوش اور آباد رہو۔'' کامی یاما کی بیوی اتسوکو بھی تابئی کے اسی سکول میں تھی جہاں سے تامائی نے پڑھا تھا۔ اور چونکہ وہ اور تامائی دونوں کونچی میں رہتی تھیں اس لئے ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئی تھیں۔ کامایا کی مارونوچی کے معاشی میگزین میں کام کرتا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ اسی رسالے میں ساکاؤ کو کوئی ملازمت دلوا دے لیکن وہ اس کی کم علمی اور اکھڑ پن پر حیران رہ گیا۔ پھر اس کے بعد اس نے ایسا کوئی خیال کیا ہی نہیں۔ ادھر اتسوکو کو جب معلوم ہوا کہ تامائی کے سکول نے تازو کو خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔ تو اس وقت سے وہ اس سے کھنچ کر اور قدرے فاصلہ رکھ کر ملتی تھی۔ تاہم وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی سہیلی تباہی کے گڑھے میں گرتی جائے۔ اور وہ چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی...... اتسوکو کی شکل ملکہ کوگو سے ملتی تھی۔ اتنی کنبے کے لوگ اس کو گوسان ہی کہتے تھے۔ کاجی یامانے شراب کا پیالہ پیش کیا تو تامائی نے قبول کر لیا۔ پھر بار بار کامی یاما اس کا پیالہ بھرتا رہا اور وہ پیتی رہی۔

پھر کامی یاما کہنے لگا

''تامائی ابھی تمہاری ایسی عمر تو نہیں ہے کہ تم بوڑھی لگنے لگو۔نہیں معلوم تم نے اس کے بعد پھر دوسری شادی کیوں نہیں کی؟''

''اس لئے کہ میں ایک بچے کی ماں ہوں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''اتسوکو نے کہا۔

''نہیں بھئی میرا ساکو بہت بدذات ہے۔ وہ مجھ پر کڑی نظر رکھتا ہے۔ اور اگر ایسا کوئی معاملہ ہو تو اس کو ایسا بگاڑتا ہے کہ کیا بتاؤں۔''

''آخر وہ کس حد تک ایسی حماقت کر سکتا ہے؟......ایک بچے کی فطری طور پر یہ آرزو ہوتی ہے کہ اس کی ماں چین سے رہے۔'' کامی یاما نے کہا۔

''لیکن میرا بچہ اور ہی قسم کا ہے۔ واقعی وہ عجیب فطرت کا ہے۔''

تامائی کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے سرد اور تاریک گھر میں واپس جائے جہاں پہنچنے کے بعد وہ بستر میں ہوائی قلعے بنانے لگتی تھی۔ اسے اچھے دنوں کے خواب آنے لگتے۔ لیکن جہاں پر خواب وخیال کا تسلسل ٹوٹتا تو بھیانک حقیقت سامنے آجاتی۔ اس کا ہر ایک شے سے دل بیزار ہو جاتا وہ جب بھی کسی شاداب اور شگفتہ عورت کو اپنے شوہر کے ہمراہ ہنستے مسکراتے پہلو بہ پہلو چلتے دیکھتی تو اس کا دل رشک وحسد سے جل کر خاک ہو جاتا۔ آخر وہ عورتیں بھی تو اسی کی عمر کی ہیں۔ اور اس کا اپنا یہ حال۔ چلو پہلے جیسی نو بہار جوانی نہ سہی مگر اس کا آفتاب عمر یوں اور اتنی جلدی کیوں ڈھل گیا۔ اپنی عمر رفتہ اور زندگی کی بہار کے لٹ جانے کا سب سے بڑا سبب اور قصوروار وہ ساکاؤ ہی کو گردانتی تھی۔ ہر شخص خوف، خواب اور خواہشات اپنے اندر رکھتا ہے۔ مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں اور آسائشوں کو بھی حسرت اور ندیدے پن سے دیکھتے ہیں۔ اب اس وقت کامی یاما کی آسودہ اور زندگی کی مسرتوں سے معمولی کھانے کی میز کے قریب بیٹھے ہوئے اس کے دل میں ایک ہی خواہش ایک ہی تمنا سر اٹھا رہی تھی۔ کاش وہ اس وقت کے کھانے کے لئے اس سے بھی پوچھ لیں اور وہ اس میز پر سے شکم سیر ہو کر سیدھی اپنے گھر جا کر بستر میں آرام سے جا کر گھس جائے۔ خیر جو کچھ بھی ہو تو متیا نے اسے بڑا دھوکا دیا۔ وہ تو بڑا آسرا لے کر اس کے پاس گئی تھی۔ اور اب اسے یوں لگ رہا تھا کہ اب تو متیا سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوگی۔ اور اب دونوں کے درمیان کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ یہ واسطہ ختم ہی تھا سمجھو......اس

لئے کہ ابھی چند ہی دن کی تو بات ہے کہ تومتیا نے کہا تھا کہ اب ماس تو رہا نہیں تم پر بس ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئی ہیں۔ اور سچ بات بھی یہی تھی کہ اگر وہ اپنی بانہہ میں چٹکی لیتی تو اب وہ کسے ہوئے بازو پر پھچلتی ہوئی نہیں پڑتی بھی۔ اب تو چٹکی بھرنے پر پھٹے اور ہوا نکلے ہوئے ربڑ ٹائر کی طرح پلپلی پلپلی کھال ہی لٹک کر رہ جاتی تھی۔ جھریائی ہوئی جھالرسی ہو کر۔ اگر چہ کئی بار اس نے ارادہ بھی کیا کہ جسم کے کساؤ کی ورزشیں کر کے اپنی گرتی ہوئی حالت کو سہارا دے لیکن اس کو کھانے کمانے کی فرصت ہی کب ملتی تھی جو باقاعدگی سے ورزش کرسکتی۔ کمائی کر کے گھر آتی تو زندگی کا ایک ہی مصرف ہوتا۔ ساکاؤ سے الجھتے رہنا یا بستر پر پڑے رہنا۔

کھانے کے بعد وہ کامی یاما کے گھر سے نکلی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ بن بلائی مہمان۔ وہ اتنی دیر ان کے سر پر بیٹھی رہی تھی کہ جب وہ جانے کے لئے اٹھی تو دونوں میں سے کوئی بھی اسے رخصت کرنے اور خدا حافظ کہنے دروازے تک اٹھ کر نہ آیا۔ باہر نکل کر وہ اس کشادہ سڑک پر آ گئی جو صنوبر کی دورویہ قطار کے درمیان سے گزرتی تھی۔ پالا ماری سرد ہوا کے جھونکے اس کے بدن میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ اور آسمان پر بے شمار تارے جگ مگ جگمگ کر رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک دراز قد شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ امید کی ایک موہوم سی کرن دل میں جگمگائی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے بات ہی کر لے۔ اس نے اپنی رفتار کم کر دی اور یوں چلنا شروع کر دیا جیسے کسی خیال میں مہمک چلی جا رہی ہو۔ پیچھے پیچھے آدمی نے پوسٹ آفس کے قریب آ کر گھوم کر اس کے چہرے کو سڑک کے کھمبے کی روشنی میں دیکھا۔ تو تامائی کی نظر اس پر پڑی۔ وہ نوجوان لڑکا اس کا چہرہ دیکھتے ہی واپس مڑ گیا۔ تامائی فریب خوردہ اور آزردہ سی اپنی رہ پر چلی گئی۔

گھر واپس آ کر وہ عقبی حصہ سے شیشے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ بجلی کا ہیٹر روشن تھا۔ اندھیرے میں اس کی روشنی کسی عفریت کی آنکھ کی مانند چمک رہی تھی۔ لگتا ہے ساکاؤ پھر اس کے بستر میں آن گھسا ہے۔ اس نے دھیرے سے آواز دی ''ساکو'' ''ہاں'' ''خیر تو ہے آج تم واپس کیسے آ گئے؟''

''ایکو نے مجھے واپس کر دیا۔ کہا آج نہیں۔'' تامائی نے بتی جلائی تو دیکھا کہ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی ہیں۔ ارے یہ تو خاصی خطرناک حالت ہے۔ چلو کیتلی میں ہیٹر پر پانی گرم کرنے کو رکھ دیتی ہوں۔ ''سگریٹ ہے تمہارے پاس'' ''ارے ایک بھی نہیں؟ ویسے بھی

جب تم کماتے نہیں تو سگریٹ پینے کا کیا جواز ہے۔'' سردی بہت زیادہ تھی۔ تامائی نے بھی اپنا کوٹ اتار کر پتلی سی رضائی پر ڈال دیا اور بستر میں گھس گئی۔'' آج واپسی میں سکورائی کے پاس چلا گیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تم ہوک کائیڈو جا کر رہنا پسند کرو گے۔ وہاں کان کنی کے دفتر میں ایک ملازمت ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ کارکنوں کی رہائش کا بھی بندوبست ہے ڈارمیٹری میں اور تنخواہ بھی معقول ہے۔''

''ہاں معلوم تو بہت مناسب ہوتی ہے۔ ہے کہ نہیں تم کیوں نہیں چلے جاتے؟

اور ہاں انہوں نے تمہاری تعلیم کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی؟''

''خیر لکھ تو میں بہت اچھی طرح سکتا ہوں۔ معقول اور موثر انداز میں۔''

اچھا ہوک کائیڈو میں کس جگہ رہنا ہوگا ''بی ہورو'' ہاں۔ وہاں شدت کی سردی پڑتی ہے۔ ابھی سے سردی بڑھ گئی ہوگی۔ اچھا پتہ نہیں جن کی چھاتی کمزور ہو ان کے لئے نقصان دہ تو نہیں ہوگا وہاں کا موسم...... ارے اماں فکر نہ کرو میں شرطیہ کہتا ہوں کہ اگر میں چلا گیا تو آپ کتنا خوش ہوں گی۔ خس کم جہاں پاک۔ نجات تو ملے گی بھئی تمہاری ماں ایک قابل نفرت بے حد خراب عورت ہے نا۔ تمہارے جانے سے وہ سکھ کی سانس لے گی۔''

تامائی کو اندر کی جانب سے ماہ جونگ کی گوٹیں چلنے کی آواز سے بے حد کوفت ہو رہی تھی۔ ساکاؤ پھر بولا ''یہ یاد رکھنا بی ہورو جا کر رہنا موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے۔'' ''رہنے بھی دو ایسی کوئی بات نہیں وہ جگہ ٹوکیو سے بدرجہ بہتر ہے۔ میری بات سنو۔ اگر وہاں زندگی سنور جائے تو مجھ کو اپنے پاس بلا لینا۔ ساکو اماں اب ٹوکیو سے بیزار ہوگئی ہے۔ تھک گئی ہے۔'' قریب سے ہی آگ بجھانے والے انجن کی آواز سنائی دی۔ سبزیوں کے کھیتوں سے پرے کہیں دور ساکو بیٹا اماں بہت اکیلی اور تنہا ہے۔ اگرچہ تم اس کا مطلب سمجھ نہیں پاؤ گے۔ آج میں بہت دل برداشتہ ہوں۔ اب میں جینے سے بے زار ہو چکی ہوں۔ دیکھو میری قوت ارادی بہت مضبوط ہے۔ میں نے زندگی میں بے شمار بدنصیبیوں اور مشکلوں کا مقابلہ کیا ہے۔ لیکن اب بالکل ٹوٹ گئی ہوں۔ میں بہت تیزی سے بدشکل اور نا قابل برداشت ہوتی جا رہی ہوں۔ اب تو میری روح بھی کچلی گئی ہے۔ بیٹا میں تم کو کیسے بتاؤں۔ سنو تم مرد ہو...... اور تم مردوں کے محسوسات کو خوب سمجھتے ہو...... مرد بڑا سنگ دل اور بے رحم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اب تم سمجھ گئے ہو گے میری بات۔'' ''ہاں اب بالکل سمجھ گیا ہوں۔ اچھا تو کیا اس قسم کا سلوک اور باتیں اس دور میں ہوتی

ہیں جب دونوں جوان ہوتے ہیں۔یعنی ابا نے تم کو بڑی آسانی سے چھوڑ دیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوا اور جدھر چاہا منہ اٹھا کر چل دیئے۔کتنی غیر ذمہ داری کی بات ہے۔پہلے تم کو پھانسا اور پھر کسی دوسری عورت سے مسحور ہو کر تم کو چھوڑ چھاڑ کر چلتے بنے۔واقعی انسان بھی عجیب شے ہے اور مجھے اس سے ہمدردی ہے۔'' بھئی ساری بات پیسے کی ہے اور خدا نے انسان کو بنایا ہی اس عجیب چیز کو ایجاد کرنے کی خاطر ہے۔کون سی مشکل ہے جو آسان نہیں ہو سکتی۔اگر آپ کے پاس پیسہ ہے۔'' تامائی نے اپنی انگلیوں کے رنگے اور سجے ہوئے ناخنوں کو اس طرح اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلایا جیسے وہ کوئی دستی پنکھا کھول کر اسے دیکھتی ہو۔اور شاید اس طرح وہ اپنے ہاتھوں کی جھریوں اور بدصورتی کو واضح کرنا چاہتی ہو کہ یہ اب کسی مرد کو دکھانے کے قابل نہیں رہیں۔

ساکو کہنے لگا'' یہ کہنا بھی تو مشکل ہے کہ ساکو حقیقت میں کیا ہے۔اچھا یا برا آدمی ہے...... میں واقعی برا آدمی ہوں۔'''' یہ ضروری تو نہیں ہے کہ تم بھی برے آدمی ہو۔ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔صرف بائیس سال۔تم کو ابھی اچھے برے کا پتہ ہی کیا ہے۔ارے ہاں یہ بتاؤ کیا تم کسی لکھ پتی کی بیٹی کو پھانس نہیں سکتے۔یا کسی بھی رئیس زادی کو؟'''' توبہ......نفرت ہے مجھے بیٹیوں...... اور لڑکیوں سے تو'' ...... '' وجہ یہ ہے نہ کہ تمہارا کسی نوجوان لڑکی سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔'''' افوہ مما واقعی تم حد سے زیادہ بری ہو۔'''' ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

تامائی کے اندر تو ایسی بے حسی طاری تھی کہ اب مزید برائی کا بھی حوصلہ باقی نہ تھا۔آخر برائی بھی تو کسی بل بوتے پر ہی کی جاتی ہے۔ان دس سالوں نے اس سے بدی کی صلاحیت بھی چھین لی تھی۔اور اب تو اسے یوں لگتا تھا کہ ہر کوئی ایک منافقانہ مغالطے کا شکار ہے۔اور اسی منافقت کے درمیان خلق خدا یعنی انسانیت بپھرے ہوئے شیروں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ رہی ہے۔کنٹرول،قوت اور دولت کو چارے کے طور پر استعمال کر رہی ہے اور بس۔قوت ، دولت اور کنٹرول وہ چیزیں ہیں جنہیں حاصل کر کے انسان مدتوں سکون اور اطمینان سے اپنی جھولی بھرنا چاہتا ہے۔اب تامائی کو مکمل طور پر یقین تھا کہ اس کے اور اس کے بیٹے کے لئے اس جہاں میں امید اور عافیت نام کی کوئی شے نہیں باقی رہی۔حد یہ کہ ماں اور بیٹے کا رشتہ بھی بے معنی ہو چکا ہے اور اس سے بھی کسی قسم کی خوشی یا سکون کا کوئی امکان نہیں۔

'' تم جانا چاہتے ہو۔؟'' ساکاؤ نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ خاموشی سے چھت کو تکتا رہا۔ تامائی سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ آخر وہ کس عمر میں اس کو اپنے ساتھ سلاتی رہی تھی۔ چھ

برس کی عمر سے اور آج تک تو کبھی اس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چھو کر تک نہیں دیکھا۔ وہ بے چارہ تو سدا سے چپ چاپ اکیلا ہی سوتا رہا تھا۔ زندگی میں اس کو معمولی سی خوشی تو الگ کبھی ڈھنگ کا سلوک بھی تو نہ ملا تھا۔ آج تک وہ کبھی اس کو چھٹی پر کہیں گھمانے پھرانے بھی نہیں لے گئی۔ اکیلا رہ کر وہ پختہ کار ہو گیا تھا۔ اس کو بھی خبر تھی کہ سولہ برس کی عمر ہی میں وہ خود لذتیت کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ زندگی میں اتنا تنہا اور محروم تھا۔ اسکے لئے ایسا ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ اسے اس کی حرکت کا خوب علم تھا، لیکن انجان بنی رہتی تھی۔ جانتے بوجھتے بھی یہی ظاہر کرتی تھی کہ اس نے کچھ دیکھا ہے اور نہ اندازہ لگایا ہے......اس وقت بھی اس کو یہ پوچھنے کی توفیق نہ ہوئی کہ اس وقت کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔

دو دن بعد ساکاؤ نے واقعی ہوک کائیڈو جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے ایکو سے تین ہزار ین مانگے لئے تھے۔ اور یہ رقم کچھ تو ڈھارس اور تقویت کا باعث تیس تاریخ کو رات کی ٹرین سے ''میں ساکورائی کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اور کبھی واپس نہیں آؤں گا۔'' ''ہاں ٹھیک ہے۔ خدا ہم دونوں کا نگہبان ہو۔'' زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اس کو روکنا چاہتی ہے۔ بس یوں ہی خود اپنے ہی خیال سے کچھ جذباتی ہو کر دل بھر آیا تھا۔

جس رات کو وہ روانہ ہوا۔ وہ دونوں پر ایک ہجوم علاقہ سے گذرے، سال کی آخری رات کو الوادع کہنے والوں کا ہجوم گنزا میں جمع تھا۔ ''افوہ غضب کی حسین عورتیں ہیں۔''

''ہاں وہاں ہوک کائیڈو میں اس سے بڑھ کر خوبصورت عورتیں ہوتی ہیں۔'' ''نہیں شہر کی عورتوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔''

''ہاں سب ہی مردوں اور خاوندوں والی ہوتی ہیں۔'' تامائی اور ساکاؤ دو دوستوں کی طرح شانہ بشانہ چلتے اور باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ''وہاں تو ابھی سے بڑی ٹھنڈ پڑنا شروع ہو گئی ہوگی۔'' ''ہاں شرط لگا لو۔ میں جب تک وہاں پہنچ نہ جاؤں کیا کہہ سکتا ہوں وہاں کے بارے۔ ہاں البتہ ایک آرام ہوگا کہ میں کوئلے کے اسٹور سے کمرہ گرم کر سکوں گا اپنے لئے ہے نا عیش والی بات۔ میں تو تائیوان میں پیدا ہوئی تھی اس لئے مجھے تو ٹوکیو سے زیادہ ٹھنڈی جگہ معلوم نہیں۔ ہاں ایک بات ہے سخت برفباری کا موسم کچھ کچھ رومینٹک ہو جاتا ہے۔'' ''رومینٹک ارے نہیں، خیر اگر وہاں آندھی آئے تو پتہ چلے گا کہ رومینٹک ہے یا نہیں۔ اچھا ہاں اب آج کے

بعد کیا مصروفیت رہا کرے گی۔ کیا کیا کروگی۔'' ''میں...... میں بڈھی اور بڈھی ہوتی جاؤں گی۔ پتہ ہے جوانی اور گئے دن کبھی لوٹ کرنہیں آتے۔ ہوسکتا ہے کہ سردی کی شدت سے پے در پے دمے کے دورے پڑنے لگیں اور میں مر بھی جاؤں۔''

ساکاؤنے ہکاری سگریٹ کے دو پیکٹ خریدے۔ اور ایک تامائی کو پکڑا دیا۔ ''اماں اب تو تم کو کوئی مرد ملنے سے رہا۔'' ''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ ایسی کوئی امید تو نہیں ہے۔ ارے اب زندگی میں کسی فلاح کی امید رکھنا بھی بے کار ہے۔ تمہاری گاڑی کا وقت تو نہیں نکل جائے گا۔ کیا وقت ہے؟'' سوکاؤ نے کپڑے کی دکان والی کھڑکی سے اندر لگے وال کلاک کو دیکھا اور بولا ''ابھی تو بہت وقت ہے میرے پاس۔ ابھی دو گھنٹے اور ہیں۔'' وہ کہنے لگی۔ ''اچھا پھر میں روانگی کے وقت ٹرین پر خدا حافظ کہنے نہیں جاتی۔ ہاں یہ بہت اچھا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ ایکو مجھے رخصت کرنے آئے گی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کو کمبین میں میرا انتظار کرے گی۔'' چلتے چلتے تامائی کے قدم رک گئے۔ وہ ایکو کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اچانک ہی مختلف جذبات اور احساسات اس کے اندر سر اٹھا رہے تھے۔

''سنو میری بات! اگر اماں کو کچھ ہو جائے تو تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگے نہ چلے آنا۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ میں تو ایک جذباتی جھٹکے سے ہی مر سکتی ہوں۔ میرا کیا ہے۔ لیکن ساکو تمہیں آنے کی ضرورت نہیں۔ ساکو نے اثبات میں اپنی ٹھوڑی ہلا دی۔ اس نے ایک کرم خوردہ خاک آلود فوجی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ اس کو دیکھ کر کڑھ رہی تھی۔ وہ یعنی اس کا اپنا بیٹا کتنا کم نصیب اور بخت مارا نظر آ رہا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ کوئی عورت اس کی پشت پر تھی تو چلو دوسرے کی بیوی ہی سہی۔ تھی تو۔ اس کی خبر گیری کرنے والی۔ ساکو نے ہاتھ ملایا مصافحے کے لئے۔ اس مصافحے میں گرم جوشی نہ تھی بس یوں ہی ہاتھ ملا کر چھوڑ دیا۔ وہ کہنے لگی اب میں تم کو دیکھ تو نہیں پاؤں گی پھر بھی جہاں رہو خوش رہو خیریت سے رہو۔ اور ہاں ایک بات سنو۔ دیکھو میں خط کتابت کرنے میں بالکل ہی نکمی ہوں۔ اس لئے تم میرے خط کا انتظار نہ کرنا۔ گھنے درختوں کی باڑھ کے قریب راستے کے نکڑ پر کافی کی دکان تھی۔ جدھر سے کافی کی خوشبو کے بھبکے چلے آ رہے تھے۔ ساکاؤ مڑا اور عجلت سے اندھیر میں گم ہو گیا۔ اس کی پیٹھ پر بوغ بند میں بندھا ہوا اس کا چھوٹا موٹا سامان تھا۔ ایک دو مرتبہ تامائی نے پلٹ کر اسے دیکھنا چاہا لیکن دھند اور کہر کی دبیز چادر کے پیچھے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اب وہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اپنے شانوں کو اچکا کر اس نے ایک گہری اور لمبی سانس کھینچی۔
سال رفتہ کی آخر شب کو رخصت کرنے والوں کے ہجوم سے سڑکیں اور شہر کی تمام گلیاں تک معمور تھیں۔ مچھلی کے اسٹور پر نیلی روشنیوں تلے نقرئی کرنے والی ایک دکان پر نمائشی عورت کی پتلی سیاہ مخملی تھان کو دونوں بازوؤں پر پھیلائے کھڑی ہوئی۔ غرض کیا کچھ نہ تھا جو اس وقت اس کی نظر کے سامنے نہ تھا۔ اس کی خالی خالی نظروں پر سے ہر شے جیسے پھسلی جارہی تھی۔ یکا یک ایک عجیب سی بے وجہ اور بے نام خواہش تامائی کے دل میں انگڑائیاں لینے لگی۔ ٹوکیو سال کی اس آخری رات بھی ویسا کا ویسا ہی نظر آرہا ہے۔ وہی رونق اور وہی گہما گہمی۔ اور ایسے میں جشن کی اس رات وہ چپ چاپ موت کو گلے لگا لے تو کیسا رہے۔ جیسے دسمبر کی اس سرد اور آخری رات کو ہوا کے تند جھونکے کے ہمراہ شمع کا روشن شعلہ بجھ کر غائب ہو جائے۔ اور اس کی یہ حرکت اس تیز و تند جوانی کی رخصت کی آخری علامت بن جائے گی جیسے شمع بجھنے سے پہلے ہی بھڑک اٹھتی ہے۔ دسمبر کی سرد رات اور ٹوکیو شہر کی گلیاں...... ایک گلی سے ایک نوجوان لڑکی قدیم روایتی انداز میں اپنا جوڑا سجائے نکلی۔ دو بچے ہاتھوں میں تھاپیاں اٹھائے چڑی چھکا کھیلنے میں مصروف تھے۔ سفید پروں سے بنا شٹل کاک ننھے سے پرندے کی طرح کبھی ادھر تو کبھی ادھر کو اڑتا نظر آرہا تھا۔ وہ چھلاوے کے مانند چھجے کے نیچے لیمپ کی روشنی میں لپک چھپک ادھر سے ادھر نظروں سے اوجھل ہوا۔ گلی نمبر چار کے قریب سے ایک دکان سے پیچھے کی طرف ایک کپڑا بیچنے والی کی صدا رہ رہ کر آتی تھی۔
آیئے۔ آیئے آپ کی پسندیدہ مخمل، مورنگا کی مخمل یہاں موجود ہے۔ اس دکان پر اس طرف آیئے، آیئے، ایک اور جانب سے صدا آتی تھی۔ کینڈی...... کھانڈ والے کوزے لینا نہیں......
تامائی نے بھیڑ میں گھس کر سیلوفین میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ اٹھا کر چپکے سے جیب میں ڈال لیا۔ اور آگے بڑھ گئی۔ بڑا مزا آیا تھا اس کو اپنی اس حرکت کا۔ چینی کے برتنوں کی دکان پر سے اس نے ایک بے حد سا کٹائی، سویا ساس انڈیلنے والا اڑا لیا۔ اتنے بڑے ہجوم میں اس کو کون دیکھتا۔ لیکن اس کو خوشی اس بات کی نہ تھی کہ کوئی اس کو دیکھ نہیں رہا ہے، بلکہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اپنی جیب بھری بھری محسوس کر رہی تھی۔ کوئی اس کو دیکھ ہی نہ رہا تھا۔ گویا وہ نقاب پہن کر گھوم رہی ہے۔ اور واقعی اس طرح ہجوم کے بیچ میں چلتے رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے زندگی دلچسپ اور جینے کے قابل چیز ہے۔ اپنے بیٹے سے جدا ہو کر وہ اپنے آپ کو آزاد اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ دھندلائی ہوئی مدھم مدھم روشنی والی گلی سوکی یاشی میں داخل ہوئی

اس نے سیلوفین کا پیکٹ کھول کر مخمل جیسی نرم نرم ٹافی نکال کر اپنے منہ میں ڈال لی۔ جلتے بجھتے روشنی والے اشتہار سے ایک بہت دل آویز موسیقی کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ دوسری طرف آسمانوں پر کھائی جانے والی غذا کا اشتہار چل رہا تھا۔

اوٹایوکو

زبوں حالی کی باقیات

مختصر سے خستہ اور ٹوٹے پھوٹے شیڈ کے چاروں طرف چھاجوں پانی پڑ رہا تھا۔ ہر سو بارش کا پانی چھپ چھپ شڑشڑ بہہ رہا تھا۔ لگتا تھا طوفان آیا ہوا ہے۔

آدھی رات کے وقت جب اک جہان سویا پڑا تھا، یہ تباہ اور اکیلا چھپر ہی نہ تھا جو بارش اور آندھی پانی میں گھرا کھڑا تھا اس کے آس پاس بے شمار اور سینکڑوں ایسے ہی شکستہ اور خستہ حال مکان تھے جو آباد بھی تھے۔ ان مکانوں کے مکین بھی انسان ہی تھے جو اس وقت میں نہ صرف زندہ تھے بالکل عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے تھے۔ اور جب مجھے یہ خیال آتا تو کچھ تسلی سی ہو جاتی تھی۔ تنہائی یا اکیلے پن کی بات تو ایک طرف تھی۔ اصل قصہ یہ تھا کہ مکان کا یہ پورا کا پورا جھنڈ سینکڑوں مکانوں پر مشتمل بستی کا حال جون میں ہونے والی بارشوں نے تباہ کر دیا تھا۔ اور پوری کی پوری بستی ہی شہر کی بقیہ آبادی سے کٹ کر ایک جزیرہ سا بن کر رہ گئی تھی۔ ایک مکان کی حالت دوسرے سے ذرہ برابر بھی مختلف نہ تھی۔ یہی وجہ تھی اپنے اس خستہ حال اور تنہا جھونپڑے میں بیٹھ کر میرے اندر رفاقت اور ہمسائیگی کا شدید احساس تھا۔ ان بے شمار جھونپڑوں کے اندر محوخواب مکینوں کی سانس کا ہر ہر تار جیسے ایک ہی ڈور سے بندھا ہو۔ اتنا کہ میں اپنے گھر کی تنہائی میں ان کی دوسراہٹ کرگرمی اور تقویت محسوس کر سکتی تھی۔ میں تو خیر تنہا ہی جاگ رہی تھی میرے ساتھ والے ان گھروں میں بھی محوخواب لوگوں کے درمیان کم از کم ایک فرد ضرور بیدار ہو گا، جو میری ہی طرح بارش کے پانی سے بلبلا کر نکل آنے والے کیچوؤں کو گھر میں رینگتے دیکھ رہا ہو گا۔

میں نے ساتھ والے ملحقہ کمرے میں جھانک کر دیکھا، چونکہ پورے گھر میں فقط ایک ہی بلب تھا، اس لئے اس کی روشنی تمام گھر کو دھیمی دھیمی مدھم سی روشنی فراہم کرتی تھی۔ کچھ اس طرح

کہ کھانے کے تین چٹائیوں والے کمرے اور باورچی خانے سے گذرتی ہوئی چھ چٹائیوں والے کمرے خواب کی پرانی، سبز دھانی رن کی جالی میں سے گذرتی ہوئی اندر پہنچتی تھی۔ روشنی کے اسی مرکز سے جالی کے باہر رینگتے ہوئے کیچوے اب مچھر دانی کی بوسیدہ جالی اور کناروں تک رینگ آئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پوری مچھر دانی کی جالی پر رینگتے پھر رہے تھے۔ اوران کے لجلجے جسم ساری جالی پر نظر آرہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ نمی اور ہوا میں موجود ہر ذرے سے وہ اپنی غذا حاصل کر رہے ہیں۔

خواب گاہ کی مچھر دانی میں کنبے کے پانچ افراد سوئے ہوئے تھے اور وہ بھی اس انداز میں گویا ایک دوسرے پر لدے ہوئے ہوں۔ میں تو کھانے کے کمرہ ہی میں بیٹھی تھی۔ وہاں سے بیٹھ کر نزدیک ترین چہرہ میری چھوٹی بہن ٹیکو کا تھا جو اس رخ کو منہ کئے سو رہی تھی۔ ٹیکو نوعمری ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کی ایک بچی چھ سال کی تھی۔ اور دوسری دو سال کی گود میں تھی۔ دونوں بچیاں بے ترتیب حالت میں سوئی ہوئی تھیں۔ اپنی ماں کی ٹانگوں میں گھسی ہوئی گڑ مڑی مارے۔ شاید روشنی سے بچنے کے لئے میری اماں نے کروٹ لے رکھی تھی اور اب اپنی ٹانگوں کو آستینوں والی شال سے جسے کالی ما کی کہا جاتا ہے، ڈھانک رکھا تھا۔ سونے والوں میں ہماری ایک مہمان بھی شامل تھی۔ یہ میری چھوٹی کزن ہاشی موٹو میانو تھی جو آج صبح ہی مجھ سے ملنے گاؤں سے آئی تھی۔ میں تین سال بعد ٹوکیو سے گھر واپس آئی اور وہ میری آمد کا سن کر ہی یہاں پہنچی تھی۔ ابھی تک میری اس کی اس حد تک کھل کر بات چیت نہیں ہو سکی تھی کہ وہ مجھے اپنی حالات تقدیر کے انقلابات کے بارے میں کچھ بتا سکتی...... چنانچہ وہ اس وقت میری طرف سے کروٹ لے کر اور مچھر دانی سے بالکل ہٹی ہوئی سوئی پڑی تھی۔ اور کیچوے بڑے اطمینان سے رینگتے ہوئے اس کے آس پاس پھر رہے تھے۔ اور جالی میں اتنی گنجائش تھی ہی نہیں کہ میرے سونے کے لئے جگہ باقی رہتی۔ اس لئے کہ میرے سونے کی جگہ پر تو میانو سوئی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا بدن سکیڑ لیا تھا تاکہ میرے لیٹنے کی گنجائش نکل آئے اور اس طرح مچھر دانی کے کنارے اور اس درمیان تھوڑی سی جگہ نکل آئی تھی۔

ایک ہی مچھر دانی تلے خونی رشتوں کا گچھا ایک گلدستہ سکڑا سمٹا پڑا سو رہا تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی بدنصیبی اور مقدر کے بوجھ تلے دبا ہوا ایسی پریشانیوں میں گھرا ہوا کہ عام حالات میں تو ان کا تصور بھی محال ہو۔ اور عام حالات میں تو مچھر دانی کے اندر رینگتے ہوئے کیچوؤں کا بھی تصور محال

ہی ہوتا ہے۔ خیر یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ ان کیچوؤں کو دیکھ دیکھ کر پست ہوگئی تھی اور سخت پریشان بھی۔ تاہم میں اپنی اماں اور ٹیکو کی ترکیب سے متفق نہیں تھی، جو وہ کیچوؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتی تھیں۔ انہوں نے ایک خالی ڈبے میں نمکین پانی بھرا اور بے کار کی ہوئی چاپس اسٹکس سے اٹھا اٹھا کر کیچوؤں کو نمک کے پانی میں ڈالنا شروع کر دیا۔ میں اس طرح ان کو مارنے کے حق میں نہ تھی۔ میں ان کی جانیں بچانا چاہتی تھی۔ اب بے چارے کیچوے کیا جانیں کہ وہ ہمارے لئے پریشانی کا باعث ہیں۔ وہ بےقصور اور انجان تھے۔ جنگ میں ہزیمت کے بعد جاپانی دریاؤں میں طوفانی سیلابوں کا ایک ریلا تھا جو مختلف بدیسی زنانہ ناموں سے چل پڑا تھا۔ اور سالہا سال تک مختلف علاقوں کو تاراج کرتا رہا تھا۔ طوفان کا یہ زور سب سے زیادہ ہیروشیما کی تباہی اور کھنڈرات کو مزید غارت کرتا رہا۔ ہیروشیما کا وہ علاقہ جہاں جنگ ایک بالکل ہی انوکھے انداز میں لڑی گئی تھی، تباہی و غارت گری کا سب سے بڑا مرکز یوں بنا کہ وہاں زہریلی اور بے پناہ بارشوں کا سلسلہ نہ تھمنے والے انداز میں جاری تھا اور سمندر میں طوفان ایک کے بعد ایک سر اٹھاتے رہے۔ خصوصاً اس شہر مرگ یافنا کی بستی کے پریڈ گراؤنڈ کا تو حال ہی ناقابل بیان تھا کہ وہاں تو کسی بستی اور مکان کا نام ونشان باقی نہ تھا۔ اور اب ان لوگوں کے لئے جن کے مکان جل کر تباہ ہوگئے تھے، نئے گھر تعمیر کئے جا رہے تھے۔ ماسوا ان فوجی عمارتوں کے کھنڈرات اور ملبے کے جو تباہی سے پہلے پاس پاس تعمیر کی گئی تھیں۔ جن گھروں کو تعمیر کیا جا رہا تھا ان میں سارے کے سارے خانماں برباد تو سما نہیں سکتے تھے، نہ ہی ہر کوئی فوجی عمارتوں کی باقیات میں پناہ گزین ہوسکتا تھا۔ چنانچہ تیکو اور اس کے شوہر کو بمشکل ایک گھر حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ یوں کہ انہوں نے چور بازاری کے ذریعے قرعہ حاصل کرلیا۔

بمباری کی تباہ کاریوں کی زد میں آئے لوگوں کے لئے جو گھر تعمیر کئے جا رہے تھے وہ سب کے سب پریڈ گراؤنڈ کے ایک ہی کھلے گوشے میں بنائے جا رہے تھے۔ اب ہوتا یوں تھا کہ موسلا دھار بارشوں اور طوفانی ہواؤں کے تسلسل میں ہر سال وہ سارے کے سارے گھر تنکوں سے بنے آشیانوں کی طرح بکھر کر رہ جاتے۔ سارے کا سارا مکان ہی طوفانی اور پیٹم پیٹ بارشوں میں چر مر ہو کر رہ جاتا اور پھر کیچڑ گارے کی تہوں میں کیچوؤں کی افزائش نسل ہوتی۔ چونکہ یہ وادی کا علاقہ تھا، یہاں بارش کے پانی کے نکاس کی کوئی راہ نہ تھی۔ سارے سال فرشوں کے تختے کیچڑ پانی میں دھنستے دھنستے اب گلنا شروع ہوگئے تھے۔ ان کے تلے کیچوؤں کی افزائش بڑی تیزی

سے ہو رہی تھی۔ گچھوں کے گچھوں کی شکل میں۔ اماں اور تنیکو بڑی مستعدی سے انہیں پکڑ پکڑ کر نمکین پانی میں ڈالتی رہتی تھیں۔ اور میں ان کو اس میں پگھل پگھل کر گھل گھل کر ختم ہوتے دیکھتی تھی۔ یہ سارے کے سارے گلتے بھی نہ تھے۔ بس ادھر گلی سے خاکستری خاکستری لاشوں کی شکل میں۔ ڈھیر کے ڈھیر ہو کر پہنچ جاتے۔ اس قدیم ترکیب کے آگے بے بس ہو جاتے تھے اور یہ پرانا آزمودہ نسخہ ان پر بڑا کارگر تھا۔

اب ان کو یوں مرتے دیکھ کر میرے ذہن میں انسانی لاشوں کے وہ جھلسے ہوئے ڈھیر گھوم جاتے جو نہ تو پوری طرح جل کر خاکستر ہوتے اور نہ ہی زندہ رہنے کی سکت ان میں باقی رہتی تھی۔ اور ان کی اس موت اور کیچوؤں کی موت میں کچھ ایسی مناسبت محسوس ہوتی تھی کہ اب مجھے محض مرے ہوئے کیچوے ہی نہیں نظر آتے تھے۔ بالکل ایک اور تصور ان سے وابستہ ہو گیا تھا۔

یہ بے قلب و جگر سا لماتی کیڑا اب میری نظر میں اپنا ایک تشخص قائم کر چکا تھا۔ میں ان پر نمک ملا ہوا پانی چھڑک کر ان کی جان لینا نہیں چاہتی تھی بلکہ میں نے اس وقت ان کو دور بھگانے کی ایک اور ترکیب سوچی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ مچھر دانی میں سوئے ہوئے تمام لوگ غافل اور بے خبر سو رہے ہیں، اور ان کو میری حرکت کا پتہ بھی نہ چلے گا، دن کو میں نے ڈی ڈی ٹی خرید کر رکھ لی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے دو ایک مرتبہ ڈی ڈی ٹی چھڑکنے کا عمل جاری رکھا تو کیچوے بوکھلا جائیں گے۔ اور اس طرح اندر داخل ہونے سے باز رہیں گے۔ لیکن جب میں نے اماں اور تنیکو کے سامنے ڈی ڈی ٹی کا نام لیا تو وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔ ظاہر تھا مفلسی اور قلاشی کی حالت میں گذر بسر کرنے کے سبب سے ان کے لئے ڈی ڈی ٹی کے مقابلے میں نمک ملا پانی کہیں زیادہ سستا نسخہ تھا۔ اس حقیقت کے ادراک نے میرے دل کو بوجھل اور افسردہ کر دیا۔ لیکن اب میں یہ تجربہ اس وقت کرنا چاہ رہی تھی جب سارا گھر سو رہا تھا۔ میں نے ڈی ڈی ٹی کے منہ پر لگی ہوئی سیل کو توڑا اور سفید پاؤڈر کھانے کے کمرے کے فرش پر چھڑک دیا۔ بل کھاتے مروڑے لیتے ہوئے کیچوے شیشے کے دروازے کی جھری سے نکلنے لگے۔ بارش کی روک تھام کے لئے دروازوں کے ساتھ لکڑی کی جھلملیاں موجود نہیں تھیں، اسی طرح شیشے کے دروازوں کی جھریاں بھی ٹھیک سے بند نہیں کی گئی تھیں۔ وہ سارے کے سارے ستونوں اور دروازوں پر چڑھنا شروع ہو گئے حتیٰ کہ کھانے کی نیچے پایوں والی چوکی کے پایوں سے لپٹ گئے۔ ان کے رینگنے سے لکڑی پر چمکدار دھاریاں سی پڑنے لگیں۔ چونکہ کیچوے زیادہ تر بلبلا بلبلا

کر دروازے کی جھریوں سے باہر نکلنے کے لئے ادھر کو ہی جمع ہو رہے تھے، اس لئے میں نے بار بار ڈی ڈی ٹی کا پاؤڈر چھڑکا۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ یہاں سے بھاگیں گے لیکن جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ڈی ڈی ٹی کی تیز جھار میری آنکھوں اور نتھنوں پر اثر کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی کیچوؤں کے نرم نرم جسم پگھل پگھل کر پانی کی طرح بہہ رہے تھے۔

ان کی مشکل یہ تھی کہ وہ پسوؤں اور مچھروں کی طرح اڑ کر اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے تھے۔ نہ ہی ان کے بے ہڈی کے لجلجے جسم کیمیائی مادے کا دفاع کر سکتے تھے۔ اس نظارے سے میرا جی متلانے لگا۔ بات یہ ہے جس دن ہیروشیما کے شہر پر وہ منحوس زردی مائل سفید شعلہ اس شہر کو ایک توس کی طرح جھلسانے کے لئے جھکا تھا، میں اس دن اسی شہر میں موجود تھی۔ اور میں نے اپنی آنکھوں سے شہر، اس کے باسیوں اور جانداروں کو پگھلتے اور جھلستے دیکھا تھا۔ یعنی یہ شہر اور اجسام کسی شعلے سے نہیں جلے بلکہ مہلک ہتھیاروں سے نکلتی ہوئی شعاعیں، جیسے آسمان سے برس گئیں، اور بس ہر شے پر پگھلنے اور جھلسنے کا عمل شروع ہو گیا۔ میں اس منظر کے صدمے اور دہشت کو چھ سال سے جھیل رہی ہوں۔ اب یہ انیس سوا کیاون ہے لیکن اس وقت سے آج تک کا وقفہ میرے نزدیک ایک تختہ سیاہ کی طرح ہے...... اور اسی سیاہ اذیت سے میں فرار تلاش کرنے کے لئے خواب آور گولیوں کا سہارا لیتی رہی ہوں۔ نہ صرف رات کے وقت بلکہ دن کے وقت بھی مجھے مسکن انجکشنوں کی مدد سے خود کو پرسکون رکھنا پڑ رہا ہے۔ جو یقیناً نشہ آور ہیں۔ میں نے شراب نوشی کی بھی کوشش کی لیکن اس سے میرا پیٹ خراب ہو جاتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ شراب کو منہ لگانے سے پہلے ہی پیٹ پر اثر ہونے لگتا ہے۔ پھر میں نے موت میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اور میں ہی اپنے فرار کی متلاشی نہیں ہوں، بلکہ ہمارے مشہور شاعر ہارا تامیکی جو ہیروشیما میں پیدا ہوئے اور ان کی کئی نثری تصنیفات دوسری زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں، انہوں نے اسی موسم بہار میں اسی کرب واذیت سے نجات پانے کے لئے خودکشی کی ہے اور اس خبر سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں ایک قدم پیچھے رہ گئی ہوں۔ اور اب جبکہ وہ اپنے آپ کو ختم کر کے اس اذیت سے نجات پا گئے ہیں، تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کہ خود بھی اہل قلم ہوں، آخر ان کی تقلید کیوں نہ کر سکی۔ اور جب میں ان کے ذکر کے رتجگے میں گئی تو میں ان کی موت کا مفہوم سمجھنا چاہتی تھی کہ آیا موت کے دامن میں ان کو اس کرب واذیت اور اس دہشت سے نجات مل گئی یا نہیں۔ لیکن یہ سوال میں کس سے کرتی وہ وہاں موجود کب تھے۔ اس احساس نے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس

جہاں سے رخصت ہو چکے ہیں، میں خودکشی سے متنفر ہوگئی اور یہ میرے خیال میں ایک بڑی مکروہ حرکت بن گئی۔

میں نے ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ ملتوی کر دیا۔ اور کیچوؤں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ لیکن پھر بھی ان کے اس طرح مرنے کا خیال میرے لئے نا قابل برداشت تھا۔

میں نے اس جگہ کو ایک ردی اخبار سے ڈھانپ دیا تا کہ میرے ذہن سے ان کی موجودگی کا خیال جلد سے جلد نکل جائے۔ کیونکہ ان پر نظر پڑتے ہی سات سال قبل ہلاک ہونے والوں کے مردہ اجسام کا خیال از سرنو تازہ ہونے لگتا۔

دس دن قبل ٹوکیو سے جس رات میں واپس آئی تھی، اس وقت میری والدہ نے میرے خیال سے تھوڑی سی سا کی شراب خرید کر رکھی تھی۔ اس وقت میں نے سوچا کہ چلو ایک بڑا سا گھونٹ لے کر دیکھتی ہوں کچھ تو اعصاب شل ہو کر سکون آئے گا۔ میں نے مچھر دانی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ تیکو میری ہی طرف دیکھ رہی تھی اور پورے طور پر بیدار تھی۔

''کیا وقت ہو گیا؟'' تیکو نے پوچھا۔ اس کو پتہ ہی نہ چلا کہ میں نے ڈی ڈی ٹی چھڑک کر کیچوؤں کو گھلا دیا ہے............

''ساڑھے بارہ''

''اچھا۔ نہ جانے کیسے شاید کسی کیمیائی دوا کی بدبو سے میری آنکھ کھل گئی ہے۔ پتہ نہیں کس چیز کی بو ہے۔''

''میں کہتی ہوں تم اٹھ ہی کیوں نہیں جاتیں۔ آؤ ہم دونوں مل کر بیٹھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں نے مچھروں اور پسوؤں کو بھگانے کے خیال سے ڈی ڈی ٹی چھڑکی ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اٹھ جاؤ منٹ بھر کے لئے اور میرے ساتھ بیٹھ کر پیو۔'' میں چاہتی تھی کہ دل کا بوجھ جلد سے جلد ہلکا کر لوں۔

''واقعی! اس وقت پئیں؟''...... تیکو جو کبھی بھی سا کی شراب کو منہ نہ لگاتی تھی۔ میرے چہرے پر لکھی وحشت اور مایوسی کو محسوس کر کے اٹھ بیٹھی اس نے مچھر دانی کے کنارے کو اونچا کیا اور باہر نکل آئی۔ پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس نے کالی مٹی کی کانگڑی میں آگ جلائی۔

ارے سا کی کو گرم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چلو ٹھنڈی ہی پیتے ہیں۔

''ارے تکلف کیوں کرتی ہو آگ جلانا کوئی اتنا مشکل کام تو نہیں۔'' ''نہیں بھئی تکلف نہیں

کر رہی ہوں بس تم جلدی سے بیٹھ جاؤ۔شیشے کی بوتل میں ساکی اور دو پیالے لے کر کھانے والی چوکی کے ایک طرف بیٹھ گئی۔اس کے سامنے میں بیٹھی تھی۔اس نے ہاتھ پیچھے کر الماری میں سے مٹھی بھر مونگ پھلی نکال کر سامنے رکھی۔تیکو نے اور میں نے ایک ساتھ پیالے اٹھا کر آپس میں ہلکے سے ٹکرائے اور خاموشی سے پی لئے۔

میں نے کہا ''ہر چیز کتنی سرد ہو رہی ہے کہ نہیں؟''

یہ مونگ پھلیاں بھی بالکل سیلی ہوئی ہیں۔ایک سیکنڈ ٹھہرو۔تیکو بے فکری اور ہلکے پھلکے دل کے ساتھ اٹھی،ایک ککڑی لے کر اس کے آڑے ترچھے ٹکڑے کاٹے اور ان پر نمک لگا کر لے آئی۔ککڑی کا سبز چھلکا بے حد فرحت بخش اور شاداب نظر آ رہا تھا۔

''بارش ہو رہی ہے...... ہے نا۔''

''ہاں بھئی اتنی بارشیں ہوتی ہیں کہ بس''

''سنو اگر بہت موسلا دھار بارش پڑے گی تو پانی کے ریلے کے ساتھ کیچڑ بہہ جائے گی اور انسانوں کی ہڈیاں اوپر آ جائیں گی۔کیچڑ کے ہٹ جانے سے کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟''۔

''ارے وہ تو بغیر بارش کے بھی باہر آ سکتی ہیں۔''

''ہاں اگر کوئی دسیوں سال بعد بھی پریڈ گراؤنڈ کے کھنڈرات کی کھدائی کرے گا تو بھی اس کے اندر سے انسانی ہڈیاں برآمد ہوں گی۔کیوں میں غلط کہہ رہی ہوں۔''

''ارے دسیوں سال کی بات کرتی ہو میں کہتی ہوں کہ آج بھی اگر کوئی یہاں آس پاس سبزیوں کا باغ لگانے کے لئے کھدائی کرنے بیٹھ جائے تو بے شمار چیزیں مثلاً بی جوہ، سیلیٹیس اور کھانے پینے کے ظروف تک ہڈیوں کے ساتھ برآمد ہوں گے۔''

''بھئی یہ میں بی جوہ کا مطلب نہیں سمجھی کیا مطلب ہے اس لفظ کا۔''

اوہو یہ جو فوجی سپاہیوں کی پیٹی ہوتی ہے نا! اس کے بکسوئے کو کہتے ہیں اور یہ پیٹی اوبی کاوا کے چمڑے کی ہوتی ہے وہ اس کو ادبی کاوا کہتے ہیں۔یہ فوجی اصطلاحات بہت ہی واہیات ہیں۔زیادہ تر چینی الفاظ کو جاپانیا لیا ہے۔''

ہاں ہاں سینکڑوں اور ہزاروں سال بعد بھی ہڈیاں ، انسانی جسموں کی ہڈیاں ، فوجی سپاہیوں کے بکسوئے اور کھانے پینے کے برتن برآمد ہوتے رہیں گے۔

ہماری زبانوں سے بولے ہوئے یہ الفاظ وہ تھے جو ان فوجیوں اور دوسرے انسانوں کی

آمد کا تخمینہ اور تعین کر رہے تھے۔ جو اس پریڈ گراؤنڈ کی فوجی عمارت کے اندر اور باہر مرے اور تہہ خاک گم ہو گئے۔ ان ہی میں مجھ سے چھوٹا اور تائیکو سے بڑا بھائی تتسو جی بھی تھا۔ جو چھ اگست کو فرسٹ یونٹ کے ساتھ موجود تھا اور اسی جگہ دیکھتے دیکھتے آنا ''فانا'' ہلاک ہوا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ پر جہاں اب بمباری کے متاثرین کے لئے مکان تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ اور اس کی موت بھی ایسی کہ اس کی ہڈیوں کا نشان تک بھی نہ مل سکا۔ وہ تو بس ایک حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ اب اس وقت ٹھنڈی ساکی کے گھونٹ بھرتے ہوئے نہ تو تیکو نے نہ ہی میں نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تھا۔ اب ہم اس آہ وزاری اور نالہ ماتم کو از سر نو برپا نہیں کر سکتے تھے۔ جو برسوں سے ہمارے دل کے نہاں خانوں کی گہرائیوں میں اتر چکے ہیں۔ ہم تو اپنے سگے رشتے داروں میں بھی بیٹھ کر اب ان واقعات کا ذکر نہیں کرتے۔ اپنے غم واندوہ پر امنڈنے والے سیل اشک کو تھام لیتے ہیں اور اگر ایسے ہی بے تاب ہوتے ہیں تو راتوں کو تکیے میں منہ دبا کر آنسو بہا لیتے ہیں جبکہ دوسری دنیاؤں کے لوگ آرام سے خواب راحت کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ سوچی لاتیکو کے خاوند کے واقعے ہی کو لے لیجئے ایک وقت ایسا آیا کہ اس کو فوجی ہسپتال سے جو اسی پریڈ گراؤنڈ میں واقع تھا، بلاوا آ گیا۔ یہ ہسپتال اسی فرسٹ یونٹ سے ہی ملحق تھا۔ جہاں تتسو جی مرگ ناگہانی کا شکار ہو گیا۔ چونکہ سوچی فوج میں تھا، اس لئے چھ اگست کو وہ کیوشو میں تعینات تھا۔ اس طرح وہ چھ اگست کی ایٹمی بمباری بلکہ تابکاری کی ہلاکت سے تو بچ گیا لیکن جنگ کے خاتمے کے فوراً ہی بعد تپدق کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن گیا۔ اس کے سلسلے میں مجھے ایک خوش فہمی سی تھی کہ وہ جنگ کے سلسلے میں مارا گیا ہے اور اس نے اس طرح حرکت اور جدوجہد کرتے ہوئے جان دی۔ لیکن پھر اسی خیال کے ساتھ ایک خیال یہ بھی پیدا ہوا کہ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی اپنے اندر پیدا ہونے ہی نہیں دینا چاہئے۔ بس میرے دل کو سوچی اور تتسو جی کی موتوں کا داغ لگنا تھا سو لگ گیا۔ دونوں مختلف نوعیتوں کی اموات تھیں۔ لیکن ایک دوسرے پر حاوی۔ اور ایک کے بعد ایک یکے بعد دیگرے ہی واقع ہوئی تھیں۔

''ارے نہیں بھئی یہ کیا؟ میرے تو کھجلی ہو رہی ہے، تیکو نے کہا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور ابھی اس نے ساکی کے دو پیالے بھی نہیں لئے تھے۔ ایک دم ہی اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر اپنا ہونٹ بری طرح کھجانا شروع کر دیا۔ اب اس کے دہانے کے دائیں طرف زخم کا نشان انگریزی حرف x کی شکل کا جو بہت بدنما دکھائی دیتا تھا، بمباری کے وقت اس کے پورے جسم پر تیس سے

زیادہ گھاؤ ایسے لگے تھے۔ یہ گھاؤ ایسے لگائے تھے کہ کہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی برچھیاں سی اڑا اڑ کر اس کے سارے بدن کو تیز دھار چاقو کی مانند کاٹ گئی تھیں اور سب سے نمایاں گھاؤ اس کے ہونٹ پر لگا تھا جو ایکس کی شکل میں اس کے چہرے پر دور سے ہی نظر آتا تھا اس وقت جو بھی غذا یا دوا اس کے منہ میں ڈالی جاتی تھی باہر کو بہہ جاتی تھی۔ اور میری والدہ تو یہی شکر کرتی تھیں۔ کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے ورنہ تو اس شکل پر اب کون پوچھتا اس کو اور سوچئی کی موت کے بعد اس قسم کی وسوچ اور بات ہماری نفسیات پر دوسری طرح اثر انداز ہوتی تھی۔

''ساکی پینا اچھا تو نہیں ہے کیوں؟ ہے نا بری بات افوہ کیسی کھجلی پڑ رہی ہے۔''

''پھر لگا دوں ایک انجکشن؟ سکون پڑ جائے گا۔ میرا مطلب خواب آور انجکشن سے تھا۔ جو بے خوابی کے مرض میں لگائے جائیں تو نیند آ جاتی ہے۔''

''نہیں نہیں میں انجکشن نہیں لگوا سکتی۔ لو اور سنو یہ ضروری ہے کیا کہ آدمی اپنے اندر زہرا اتارتا رہے۔ پتہ ہے صحت تباہ کر دیتے ہیں۔''

''بھئی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ زہر کو زہر سے مارو ورنہ تو میں اس سب کے بغیر زندہ رہ سکتی تھی کیا؟''

اب مجھ پر تھوڑا تھوڑا نشہ چڑھ رہا تھا۔ اور چاروں طرف رینگتے ہوئے کیچوؤں کے غول کے غول جلوس کی شکل میں بہت ہی موہوم نظر آ رہے تھے۔ تیکو باورچی خانے میں چلی گئی اور اس نے چند گھونٹ پانی پیا۔ ''اب بھی کھجلی ہو رہی ہے؟''

''اب تو کچھ کم ہو گئی ہے۔''

تیکو نے دیکھا کہ اب میں کچھ کچھ مسرور نظر آ رہی ہوں، تو اس نے بات شروع کی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسی بات کی منتظر تھی کہ میری طبیعت کچھ ہشاش بشاش ہو تو بات چھیڑے۔ چنانچہ ایک دم ہی دھیمی اور نرم نرم آواز میں بولی ''مسٹر کراتا، جانتی ہو نا تم ان کو مسٹر کراتا؟'' میں سوچتی تھی کہ اب تو کبھی ممکن ہی نہیں ہوگا کہ مسٹر کراتا کا نام سن کر میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو سکے لیکن حقیقت یہ ہے ایسا لگتا تھا کہ اس نام نے میرے دل میں انگڑائی سی لی ہے۔ میں نے اپنی بہن کی طرف دیکھا جو عمر میں مجھ سے دس سال سے زیادہ چھوٹی تھی۔

''ہونہہ...... میں یہی تو قع کر رہی تھی کہ اب تم یہ نام لو گی۔''

''نہیں بات یہ ہے کہ اس بار تمہارے آنے سے کوئی ایک مہینے پہلے کی بات ہے کہ باجی

متسو نے ان کو ایک ٹیکسی اسٹینڈ کے سٹاپ پر دیکھا تھا۔''

''ارے جھوٹ کہتی ہے میں نے خود یہ افواہ سنی تھی کہ وہ چھ اگست کی قیامت میں زندہ بچ گیا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ وہ بتا رہی تھی کہ وہ بڑے ٹھاٹ باٹ میں تھا۔ اور پہلے ہی کی طرح شان دار لباس پہن رکھا تھا۔ ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ تم ٹوکیو چلی گئی ہو۔ جنگ کے بعد اور خوب لکھ رہی ہو۔ ان کو تمہاری صحت کے بارے میں بڑی فکر تھی۔ اس لئے انہوں نے بار بار سوال کیا کہ وہ ٹھیک تو ہے۔ پھر انہوں نے ماں کے بارے میں بھی پوچھا۔ ان کو بڑا رنج تھا اس خیال سے کہ اماں کو تمہارے سلسلے میں پریشانی رہتی ہے...... وہ بتا رہے تھے کہ ان کے بچے اب بڑے ہو رہے ہیں۔ خاص کر بڑی بیٹی تو اب جوان ہو گئی ہے۔ اب تو اس کی شادی کا وقت بھی قریب آ رہا ہے۔ باجی متسو کو کہہ رہی تھیں کہ وہ بہت اداس تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور باجی کو بھی بڑا رنج ہوا۔

متسو کو مجھ سے چھوٹی اور اور تیکو سے بڑی تھی۔ اس کی شادی میسا سا کے مندر کی طرف ہوئی۔ اب تو اس کے پانچ بچے بھی تھے۔ اس کو کراتا کے ساتھ میرے لگاؤ اور تعلقات کا بخوبی علم تھا۔ ایک طرح سے اسی شخص کے کارن میرا مقدر پھوٹا تھا۔ اور میں نے اس کی اس حرکت پر اسے کبھی معاف نہیں کیا کہ اس نے مجھ سے اتنی بڑی حقیقت کو چھپائے رکھا کہ گاؤں میں اس کی بیوی بچے موجود ہیں۔ اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ جعل سازی کا مرتکب ہوا تھا اور اس وقت جب میری عمر صرف بیس سال تھی، اس نے اپنے ساتھ مجھے بھی کثرت ازدواج کا مرتکب کیا۔ اس کو معاف کبھی نہ کیا لیکن مجھے اس سے محبت ہوئی اور میں نے اس کا بچہ بھی پیدا کیا۔ پھر میری زندگی کے آٹھ سال کچھ یوں گذرے کہ ایک دن جھگڑا کر کے اس کے گھر سے نکل آئی اور چند ہی روز گذرتے کہ وہ رو دھو کر واپس لے جاتا۔ اور پھر آٹھ سال اس طرح گذار کر آخری بات جب ہمارے درمیان علیحدگی ہوئی تو میرے والدین اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ میں اس کا بچہ ساتھ لا کر ان کے گھر رہوں۔ میری والدہ کو کراتا سے نفرت تھی۔ اور انہوں نے ہی میرے دل میں اس سے نفرت پیدا کی تھی اور کراتا کو میری ماں سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ ان ہی کو فساد کی جڑ اور ہماری علیحدگی کا سبب سمجھتا تھا۔ اس نے بچہ ایک ایسے بے اولاد جوڑے کے حوالے کر دیا جو اس کے قریبی اور عزیز دوست تھے۔ اب وہ دونوں اس خیال ہی سے خوف زدہ

ہو جاتے کہ میں بچے سے ملوں یا اس کو دیکھنے ان کے یہاں جاؤں۔ بچہ سے بچھڑ کر میری محبت اور ممتا تو ختم نہیں ہوسکی لیکن اب وہ ساری محبت کراتا کی ذات پر مبذول ہوگئی۔ ہر وقت اس کی یاد ستاتی چنانچہ اس کو بھلانے کی خاطر میں نے وہسکی اور نشہ آور چیزوں کا استعمال شروع کیا۔ چونکہ میں ان چیزوں کی عادی نہ تھی اس نے میری صحت کو برباد کر دیا تاہم اس کی الفت میں قدرے تخفیف ہوئی تو میں نے اپنی توجہ ہٹانے کے لئے لکھنا شروع کر دیا۔ میری تحریروں کو ہاتھوں ہاتھ نہیں لیا گیا وجہ یہ تھی کہ میں کسی مرد کی محبت کے فسانے نہیں لکھ سکتی تھی۔ اور وہ ادب جو صرف اپنی ذات کے خول میں محدود ہو کر لکھا جاتا ہو، یا محض دوسروں کے حالات پر مبنی ہو، اور جس میں کسی انسان کے لئے محبت کا جذبہ ہو کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

ایک لمبا عرصہ گذر گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے وسط کی بات ہے۔ اس وقت میرا بیٹا سترہ اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔ میں نے اب تک اس کی صورت ایک بار بھی نہیں دیکھی تھی۔ اور اس وقت تک مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ تمام عمر اس کی صورت کو ترسوں گی۔ میں ایک بار اس کی صورت ضرور دیکھنا چاہتی۔ اس خیال سے اور بھی کہ یہ نوعمر اور نوخیز لڑکوں کی عمر کا خطرناک دور ہوتا ہے اور پھر وہ تو کامی کازے پائلٹ کی تربیت لے رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کسی وقت بھی وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر ہی جائے۔ میں ایک بار تو اس سے مل لوں۔ میری دلی خواہش تھی چنانچہ میں نے اس کو گود لینے والے والدین کو ایک خط لکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا جس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اسے کراتا کے اور میری ماضی سے یا اس ماضی سے اپنے تعلق کا کوئی علم ہی نہیں اور یہ کہ وہ ان ہی کو اپنے حقیقی والدین تصور کرتا ہے۔ تو اب اگر میں اس کو دیکھنا چاہتی ہوں تو اس کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ بالکل اجنبی بن کر ملوں۔ کسی غیر معمولی تعلق کا اظہار نہ ہو۔ یہ بڑی ہی حسرت ناک شرط تھی، ملاقات کی اور میں اس کی روادار بھی نہ تھی چنانچہ دل پر پتھر کی سل رکھ کر خاموش ہوگئی۔ اس اثنا میں چند سال پہلے یہ واقعہ بھی ہوا کہ کراتا کی بیوی جسے وہ ایک بار طلاق دے چکا تھا'' لیکن مجھ سے علیحدگی کے بعد اس سے دوبارہ شادی کر لی تھی۔ وفات پا گئی کسی بیماری سے۔ اس کی وفات کے بعد کراتا کا سب سے بڑا بیٹا اور کراتا کی بیوی کی سب سے چھوٹی بہن میرے پاس آنے جانے اور ملنے لگے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ لڑکے کو اپنی ماں کے مجھ سے گلے کا اور لڑکی کو اپنی بہن کی شکایت کا کچھ نہ کچھ علم ضرور تھا۔ اور کبھی کبھار ان ہی کے ذریعہ مجھ کو خبریں بھی ملتی رہیں نہ صرف کراتا کی بلکہ میرے اپنے بچے کی تھی۔ وہ کچھ اس طرح بات

کرتے گویا اپنے عزیزوں کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔ ان ہی سے مجھے کراتا کی دوسری شادی کا بھی پتہ چلا کہ اس نے ایک نوعمر لڑکی سے شادی کر لی ہے اور کراتا کے بڑے بیٹے نے یہ بھی بتایا کہ کراتا بار بار کہتا ہے کہ اس لڑکی میں میری بڑی شباہت ہے۔

علیحدگی کے ماہ وسال نے میرے ذہن سے اس محبت اور وارفتگی کو تقریباً محو کر دیا تھا۔ ایک سبب یہ تھا کہ میرے اندر پختگی آ گئی تھی اور وہ پہلی سی خام خیالی باقی نہ تھی۔ البتہ ایک دکھ بھری خلش بے شک باقی تھی اور میں کبھی کبھی اپنی نوجوانی کے درخشاں اور جوش وخروش سے معمور دنوں یاد کر کے کڑھتی تھی۔

اب اس وقت تیکو کے منہ سے اس کا نام سن کر اور جو کچھ اس نے کہا وہ کچھ سن کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے مزاج میں اب کس حد تک تبدیلی آ گئی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی قریبی رشتہ دار کی بات ہو رہی ہے جس کا تذکرہ اب قصہ پارینہ اور بھولی ہوئی کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

تیکو نے مجھے بتایا کہ اس نے متسو کو سے کہا تھا کہ اماں سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ میری خطاؤں اور ماضی کی غلطیوں کو معاف کر دیں۔

اگر یہ بات ہے تو یقیناً اب اس نے میرا پیچھا کرنے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ اور وہ مکمل طور پر مجھ سے دست بردار ہو چکا ہے یہ سوچ کر میرا دل ڈوب سا گیا۔ اچھا تو یہی انجام تھا میری محبت کا۔

میں تو اپنے بچے کے بارے میں کچھ سننے کے لئے بے تاب تھی۔

میں سوچا کرتی تھی کہ وہ بچہ جسے میں نے جنم دیا تھا، وہ کب کا مر چکا ہے۔ اور ہو سکتا ہے انہوں نے اسے مجھ سے ملانے کی حامی اسی لئے نہیں بھری ہو کہ وہ مجھے یہ غم ناک خبر نہیں سنانا چاہتے تھے کہ وہ اب دنیا میں موجود ہی نہیں ہے۔ اسی خبر کو چھپانے کے لئے انہوں نے انکار کر دیا۔ تو اب اس سے ملنے کی کوشش بھی بے سود ہے۔ تاہم دل کے کسی گوشے میں یہ احساس بھی موجود تھا کہ وہ بچہ جسے میں نے جنم دیا ہے اسی طور کرۂ ارض پر کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہے۔

ایسا لگتا ہے مسٹر کراتا وہیں کہیں مساسا مندرہ کے آس پاس رہتے ہیں۔ متسو کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے پھر کبھی ایسے ہی راہ چلتے مل جائیں۔ ''اگر تم کہو تو میں پھر متسو کو سے کہوں کہ اگر اب کی بار ملاقات ہو تو ان سے تمہارے بچے کے بارے میں پوچھے۔'' تیکو نے بڑی سادگی سے کہا۔

''مجھے یقین نہیں کہ وہ متسو کو سچ بات بتا دے گا۔ بات یہ ہے کہ ٹوکیو سے آنے سے پہلے تسورو کی چھوٹی بہن ناؤ کو مجھ سے ملنے آئی تھی میں نے چاہا کہ اس سے پوچھوں......لیکن۔''

تسورو کو کراتا کی بیوی تھی جسے کراتا کے سلوک نے منتشر کر کے رکھ دیا تھا۔ آخر کو وہ ختم ہوگئی۔ جل جل کر۔ ناؤ کو اس کی بہن تھی۔ میں نے جب اس سے بچے کے بارے میں سوال کیا تو وہ کہنے لگی کہ جنگ کے بعد سے کراتا کو اس کا کوئی پتہ نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں وہ لوگ کہاں ہیں۔ بس اس نے اتنا ہی کہا کہ وہ جو اس کا بوڑھا باپ ہے نا، جس نے اس کو گود لیا تھا۔ وہ اوسا کا پریس کے کسی شعبہ میں پروف ریڈر تھا اور کوبے میں اس کی رہائش تھی۔ بس اتنا بتا کر اس نے زبان روک لی۔ اور پھر میں نے اپنے موجودہ رفیق کاناتائیکو کو بتایا جو میرے پاس ہر وقت تو نہیں مگر اکثر رہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ جب تم بچے سے ملنے جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے چلنا میں بھی ملنا چاہتا ہوں۔ اچھا اگر وہ مر ہی چکا ہے تو یہ انکشاف میرے لئے کتنا لرزہ خیز اور ہولناک ہوگا۔ اسے دیکھنے اور خبر لینے سے تو لاعلمی میں رہنا ہی بہتر ہوگا۔

فرض کرو وہ محاذ پر کام آ گیا یا پھر اس وقت جب ایٹم بم گرایا تھا وہ اتفاقاً ہیروشیما شہر میں موجود ہو، ہاں ہوسکتا ہے کہ وہ کوبے سے کسی ضروری کام سے وہاں بھیجا گیا ہو تو پھر وہ اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا ہوگا۔ چونکہ اس بات کا امکان موجود تھا، کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، تو پھر میں اپنے دل کے گھاؤ کو کرید کر کیا کروں سوائے اس کے زخموں سے چور دل کے زخموں کو مزید خون گشتہ کرلوں۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے میرے دل کو اتنے چرکے لگا رکھے ہیں اور زندگی کے مسائل میں اتنی الجھنیں ڈالی ہیں کہ میری تو روح بھی بوکھلا گئی ہے۔

ساکی کا زیادہ حصہ تو میں نے ہی پیا تھا۔ اور اس کے اثر سے دل بہت ہلکا پھلکا اور مسرور ہو رہا تھا اور چونکہ میں پی کر ہنسی کی طرف مائل ہو جاتی ہوں اس وقت بھی میں نے قہقہہ لگایا اور میرا موڈ ہی بدل گیا اور میں نے کہا۔

''چلو میانو کو جگاتے ہیں اور پوچھتے ہیں آئندہ کے کیا ارادے ہیں۔ ہمارے تو رشتہ دار جہاں کہیں بھی ہیں پریشان حال اور خوار ہی ہیں۔ جگاؤ جگاؤ نا اسے۔'' میں نے تیکو سے کہا۔

''میں نے ابھی مچھر دانی میں سے اس کی آواز سنی ہے۔''

''ہاں ہاں، میں تو خود اٹھ کر آنے ہی والی تھی تم دونوں نہ معلوم کب سے کھسر پھسر کر رہی ہو......میں تو بڑی دیر سے چپکی پڑی جاگ رہی ہوں۔''

میانو پہلی نظر میں سرد مہر نظر آتی تھی۔ وہ ہمیشہ غیروں کی مانند نرم نرم مہذب آواز میں گفتگو کرتی تھی۔ حالانکہ وہ اور میں سگی خالہ زاد بہنیں بھی تھیں اور ایک دوسرے کی ہم عمر بھی۔ وہ مچھر دانی سے باہر نکل آئی اس کا چہرہ مایوس اور پیلا نظر آتا تھا۔ شکل صورت اس کی مجھ سے اور تیکو ہی سے ملتی تھی۔

''تم ساکی نہیں پیو گی؟ ابھی چند پیالے باقی ہیں؟''

''ساکی؟ بھئی ذرا ڈر ہی لگتا ہے۔ ساکی تو......''

وہ چوکی کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی اور اس کے مزاج میں بڑی یکسوئی اور اعتدال تھا۔ دراصل اس وقت یہی بتانا چاہ رہی تھی کہ ساکی شراب پینا تو ایک طرف وہ تو اس سے ملتی جلتی کسی چیز کی طرف بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔

میانو کو دیکھ کر ایک واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ میانو نے اپنی والدہ کے ہمراہ جو میری امی کی بڑی بہن ہیں، تین اگست کی رات تیکو کے گھر میں بسر کی۔ اسی دن میں بھی ٹوکیو سے پہنچی تھی۔ اس لئے کہ وہاں ہوائی حملوں کے تواتر میں شدت آ گئی تھی۔ تین اگست کی رات دوسری منزل کے کشادہ کمرے میں گذار کر چار اگست کی صبح صبح وہ ہیروشیما سے نکل گئی تھیں۔ اپنے سامان کا انہون نے پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا کہ سارا فرنیچر دو گھوڑوں والے ریڑھے پر پہلے روانہ کر چکی تھیں۔ اپنا گھر خالی کر کے وہ ہیروشیما سے بھاگ کر جا رہی تھیں۔ محنت کشوں والے پاجامے پہن کر اپنے سفری تھیلے کندھوں پر اٹھائے ہوئے وہ پیدل ہی نکل پڑی تھیں۔ میری ستر سالہ بوڑھی خالہ نے مضبوط چمڑے کے سینڈل پہن کر اس کے تسمے باندھ لئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اب یہ آخر ملاقات ہے اور اب کے بچھڑے پھر مل بھی سکیں گے کہ نہیں۔ ہم سب ہی کے دلوں میں ایک ناقابل بیان حد تک موجود تھی جنگ کے خاتمے پر خالہ کا تمام سرمایہ ڈوب گیا جو امہوں نے مخمورین ریلوے کے کھاتے میں جمع کیا ہوا تھا۔ یہ انکشاف ان کے لئے ایک ناقابل برداشت تھا۔ بیمار تو پہلے ہی سے تھیں۔ اس نقصان کے صدمے کو سہار نہ سکیں اور ختم ہو گئیں۔ اور اب اس وقت ہمارے استفسار پر کہ اب مستقبل کے کیا منصوبے ہیں۔ اس نے کہا کہ

''ارے بھئی منصوبے کیا ہونے ہیں۔ بیمار مرد گھر میں پڑا انتظار کر رہا ہو گا۔ بس تسویا کو سے ملنا ہے تمہارے ساتھ ہسپتال جا کر اور تھوڑی سی شاپنگ کر کے واپس جانا ہے جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ اب یہاں تو آج رات تم سے مشورہ کرنا تھا۔''

میانو کا المیہ جنگ کے بعد مضحکہ خیز ہی لگ رہا تھا۔بچپن سے ہی وہ منچوریا میں فینگ شیان کے شہر میں پلی بڑھی اس کے والد اور بڑے منچورین ریلوے کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔میانو کی عمر کوئی انیس سال ہوگی جب اس کی شادی دواؤں کے مقامی تھوک فروش سے ہوگئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دواؤں کی آڑ میں اصل کاروبار تو افیون کا ناجائز دھندہ تھا۔میرے خالو میانو کے والد بدھ مت کو ماننے والے کٹر مذہبی شخص تھے۔ان کو داماد کی جعل سازی اور کاروبار پر سخت اعتراض ہوا اورانہوں نے جلبلا کر بیٹی کو گھر بٹھالیا۔عرصے تک میانو گھر ہی بیٹھی رہی اور مجرد زندگی گذارتی رہی۔ پھر والد اور بھائی دونوں ہی یکے بعد دیگرے ساتھ چھوڑ گئے۔ والد کی وفات کا تو سبب ضیعفی ہی تھی انہوں نے فینگ شیان ہی میں وفات پائی اور بھائی کی موت جاپان ریڈ کراس کے ہسپتال میں تپدق کے عارضے میں ہوئی۔منچوریا کے واقعات سے ہی پتہ چل گیا تھا کہ جنگ ابھی مزید پھیلے اور بڑھے گی۔ چنانچہ جنگ کے شعلوں نے جب غمزدہ ماں بیٹی کا تعاقب کیا تو خالہ اور میانو ہیروشیما شہر واپس آگئی تھیں۔اور عرصے تک وہیں مقیم رہیں۔ چونکہ وہاں پر عزیز واقارب بہت تھے،سب ہی نے میانو کی دوسری شادی کا مشورہ دیا۔اور یکے بعد دیگرے بڑے معقول اور قابل غور رشتے بھی لائے۔میانو نے دوسری شادی کی تجویزوں کی سختی سے مخالفت کی اور کبھی کبھی تو وہ رشتہ لانے والوں پر مشتعل ہو کر بری طرح جھپٹتی۔اتنی کہ وہ ششدر رہ جاتے۔اور توبہ توبہ کرتے۔ وہ شادی کے خلاف اپنے شدید ردعمل کا جواز یہ پیش کرتی تھی کہ شادی تو ''کپنا ماشی ای'' ہے۔ ہمارے علاقے میں یہ لفظ بےحرمتی اور ناپاکی کے لئے استعمال ہوتا......اس کی بات پر ظاہر ہے عزیزوں کے قہقہے نکل جاتے تھے۔ جو شخص اس سے شادی کا خواہش مند ہوتا اس کے خیال میں اس کی نظر اس کے والد کے اس سرمایہ پر ہوتی تھی جو جنوبی منچورین ریلوے کے ذمے واجب الادا تھا۔گذر بسر کے خیال سے میانو نے سلائی کی ایک کلاس کھول لی......اس کی کمر کے مہرے میں متعدی بیماری ہوگئی تھی جس کی وجہ سے اسے کورسٹ اوراور سکاسٹ پہننی پڑتی تھی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد رفتہ رفتہ ریڑھ کی ہڈی کی خرابی کی وبا ختم ہوئی تو میانو کی تکلیف بھی رفع ہوگئی۔اب اس کی رنگت بھی نکھر آئی تھی اور جسم بھی گداز ہوگیا تھا۔تاہم اس وقت تک وہ چالیس سال کی ہوگئی تھی۔

گاؤں میں ان کے گھر کے ساتھ ہی ایک شخص رہتا تھا، یہ شخص کنوارا تھا اور مجرد زندگی گذار رہا تھا۔ یہ ایک طرح سے اوسط درجے کا زمیندار تھا۔اس کے مجرد رہنے کا اصل سبب یہ تھا کہ نو

عمری ہی میں اس کو تپدق ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ ٹوکیو میں رہتا تھا۔ وہ کاشت اور زمینداری کے کئی شعبوں میں کام کرتا تھا۔ ابھی اس کی عمر پوری پچاس سال نہیں تھی۔ جنگ کے دوران وہ میانو کے کافی قریب ہو گیا تھا۔ وہ اس کے لئے اناج اور سبزیوں اور انڈے وغیرہ لا دیا کرتا تھا۔ اپنی وفات سے قبل اس کی والدہ نے میانو پر بڑا دباؤ ڈالا کہ وہ اس تنہا زندگی گذارنے والے مجرد شخص کا ہاتھ پکڑ لے۔ اس بار میانو کو بھی کچھ ہوش آیا اور اس نے اس امر کا اعتراف کیا کہ آج تک وہ منچورین ریلوے کے کھاتے سے ایک پائی بھی نہ نکلوا سکی تھی۔ اب اس نے اپنے عزیز واقارب سے صلاح مشورے شروع کر دیئے۔ ہر طرح یعنی زبانی بھی اور بذریعہ خط وکتاب بھی۔ اسی سلسلے میں اس کا مجھے ایک خط ملا تھا۔ میں نے اس کو اثبات میں جواب دیا۔ لیکن سچی بات ہے کہ مجھے رشک ہو رہا تھا اور میں بڑے حاسدانہ انداز میں سوچنے لگی دیکھو کیا خوش نصیب جوڑا ہے اور پختہ عمری کی شادی کا مزا ہی اور ہے۔ اور یہ بات تو میانو سے پوچھنا چاہئے کہ ایسی پکی عمر میں شادی کا تجربہ کس نوعیت کا رہتا ہے۔ لیکن اسکا کیا کیا جائے کہ میانو نے اس کے بعد مجھے کبھی خط لکھا ہی نہیں۔ پھر جب وہ اپنے گھر جا کر رہنے لگی تھی تو اس کے دو سال بعد مجھے اس کا نئے سال کی مبارک باد کا ایک کارڈ ملا تھا اور اس سے پتہ چلا کہ اس کے شوہر پر فالج کا ایک معمولی سا حملہ ہوا تھا۔ اگر چہ یہ بہت ہلکا تھا، لیکن وہ ابھی تک پلنگ پر ہی پڑے ہوئے ہیں۔ دراصل نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا تھا۔ مجھے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اس حادثے کے اثر سے ان دونوں کا تپدق کا مرض دوبارہ عود کر نہ آئے جس میں وہ دونوں پہلے بھی مبتلا رہ گئے۔ لیکن اس بات کی توقع نہ تھی کہ اس کے شوہر کا شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہی آدھا دھڑ بیکار ہو کر رہ جائے گا۔ جو کچھ بھی ہوا اس قسم کے غیر متوقع حادثات اور ایسے میرے دل پر بوجھ بن جاتے تھے۔ میانو نے کسی سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی غیر حاضری میں اس کے معذور خاوند کی دیکھ بھال کر دے اور وہ اس کی نگرانی میں اسے چھوڑ کر مجھ سے صلاح مشورہ کرنے بھاگی آئی تھی۔

''بھئی وہ بے چارہ اتنا بیمار اور بے بس ہو رہا ہے تو تم اس کو اس حال کس طرح چھوڑ سکتی ہو۔'' میرے منہ سے بے اختیار یہ بات نکلی۔

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ اس کو اس حال میں چھوڑ کر کہیں چل دوں۔ اور جاؤں گی بھی تو کہاں۔ اس جہان میں میرا کوئی گھر بھی تو نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کب تک اس حال میں پڑا رہا اور میں اس کی خدمت کرتی رہی اور پھر وہ مرجائے تو اس کے خاندان والے مجھ سے یہی تو

کہیں گے کہ جب تمہاری کوئی اولاد نہیں تو تمہیں یہاں رہنے کا کیا حق ہے، مہربانی سے یہ گھر چھوڑ دو۔ پھر بولو۔ بتاؤ۔''

''کیا واقعی کوئی ایسی بات کہے گا۔ تمہیں یقین ہے۔''

بھئی ایسے حالات میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی مراجیتا رشتہ دار نکل ہی پڑتا ہے یہ کہنے کو۔ اور پھر ان کے تو بہت عزیز رشتے دار ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم تو ناول نگار ہو۔ تمہاری نظر میں ایسی صورت حال کا کوئی حل ہو تو مجھے بتاؤ۔''

''ارے بھئی ناول لکھنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میری دنیا کی ہر چیز پر نظر ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس صورت حال میں میانو کو زیادہ قلق اس بات کا ہے کہ شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد ہی اس کا خاوند پلنگ پر پڑ گیا۔''

''اور ہاں یہ دیکھو کہ اب ہم خاک پھانک کر تو زندہ نہیں رہ سکتے نا۔ اس کی خدمت کے ساتھ مجھے کھیتی باڑی بھی سنبھالنا پڑے گی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے سفر کے آغاز ہی میں ساری راہیں گم کر دی ہوں بلکہ خود ہی گم ہو گئی ہوں۔''

میانو کو اپنے شوہر سے کوئی لگاؤ نہیں اور یہ بات اس کی گفتگو کے دوران محسوس ہوتی تھی۔ تو پھر مجھے بھی قدرے بے رحمی سے کہنا پڑا۔

''کون کہہ سکتا ہے کہ پہلے کون مرے گا۔ کوئی ایسا پیمانہ جس سے قطعی طور پر اندازہ لگایا جا سکے؟''

''ہاں ہمارے زمانے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔''

تیکو ہماری مختصر گفتگو بڑی خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ فطرتاً کم گو تھی، اس نے میانو کی برباد زندگی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے مچھر دانی کے اندر رینگ گئی۔ معلوم ہوتا ہے اسے بھی نیند آ رہی تھی۔ تیکو کے پیچھے پیچھے وہ بھی مچھر دانی کی طرف مڑ گئی تھی۔

''اوئی'' اس کی چیخ نکل گئی۔ اس لئے کہ اس کی نظر کیچوؤں پر پڑ گئی تھی جو نہ صرف کھانے کے کمرے میں اکٹھے ہو رہے تھے بلکہ رینگ رینگ کر مچھر دانی کی چھت پر چڑھ رہے تھے۔

''توبہ! کتنے وحشت ناک ہیں، توبہ میری۔ میں نے اپنی زندگی میں کیچوے نہیں دیکھے۔ مجھے جھرجھریاں آ رہی ہیں۔ اس نے خوف سے سکڑتے ہوئے کہا۔''

''ارے میانو شکر کرو کہ تم چھ اگست کو ہیروشیما کے شہر میں موجود نہیں تھیں۔ جب میں ان

کیچوؤں کے گچھے کے گچھے دیکھتی ہوں تو میری کیا حالت ہو جاتی ہے۔ میں تو اس خیال سے لرز جاتی ہوں۔ جیسے وہ تمام فوجی اس دن ہلاک ہوئے تھے۔ اب کیچوؤں کی صورت میں نکل پڑے ہیں اور اس پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہو رہے ہیں۔''

اگلی صبح بوندا باندای ابھی جاری تھی جب میانو میرے ساتھ گھر سے نکلی۔ ہم دونوں ریڈ کراس کے ہسپتال میں اپنے چھوٹے کزن تسوکو کو دیکھنے گئے جو گذشتہ تین سال سے اس ہسپتال میں پڑا تھا۔ ہم نے سوچا کہ پہلے کسی اسٹور سے تسوکو کے لئے کچھ کھانے پینے کی چیزیں خرید لیں۔ ہم ٹرام والی سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک گندی غلیظ سی ٹیکسی بیچ سڑک پر کھڑ کھڑ کرتی جا رہی تھی۔ بالکل کسی کاہل نکمے آدمی کی طرح اس پچاس میٹر کی سڑک پر چلی جا رہی تھی جوان دنوں زیر تعمیر تھی۔ ہماری نظر کے سامنے ایک عجیب قطعہ زمین تھا شہر کے عین وسط میں جہاں جنگ کی تباہ کاریوں کے آثار ابھی اور نمایاں تھے۔ شہر کے عین وسط میں یہ بے مقصد سڑک نکالی جا رہی تھی۔ خستہ اور درماندہ سڑک جو جنگ کی افراتفری سے قبل اس طرف کو نکلتی تھی اب اس کا رخ دریا کے گھاٹ کے ساتھ موڑ دیا گیا تھا اور دریا کا یہ حال تھا کہ ہر برسات میں اس میں طغیانی آ جاتی تھی اور ہر طرف سیلاب کا پانی چڑھ آتا تھا سال بہ سال کے سیلاب کی تباہ کاریوں کی وجہ سے یہ سڑک بالکل ویران اور سنسان ہی پڑی رہتی تھی۔ بجز چینی طرز پر بنی ہوئی فالودے کی ایک دکان کے کچھ بھی نہ نظر آتا تھا۔ پچاس میٹر کی نامکمل سڑک کے ساتھ والی ٹرام کی پٹڑی کے قریب ہی کوڑے کرکٹ کے انبار پر یہ چینی طرز کی نوڈل شاپ بنی تھی جس میں فالودے کا سوپ اور کڑھی وغیرہ بکتی تھی۔ اس نوڈل شاپ کے سلامت اور باقی رہ جانے کا سبب مجھے ایک اخبار نویس نے بتایا تھا جس کے ہمرہ کوئی پانچ سال قبل میں اس سڑک پر چلتی ہوئی آئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ بات یہ نہیں ہے کہ سڑک تعمیر کرنے والوں کی طرف توجہ نہیں گئی بلکہ قصہ یہی تھا کہ دوسری دکانوں کے مالکوں نے تو دکانوں کو ہٹانے پر راضی نہ ہوا۔ دراصل اس دکان کے مالک کا تعلق ایک تیسرے ملک سے تھا۔ تیسرے ملک کے اس شخص کی حریت پسندی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے وہ صحافی بہت ہنسا تھا۔ بڑے فاتحانہ انداز میں وہ تیسرے ملک کے اس شخص کی جرات رندانہ کا ذکر کرتا رہا تھا۔ دکان جو کوڑے کرکٹ کے انبار سے اٹے ہوئے ایک ٹیکرے کے اوپر کھڑی تھی۔ اس کے دونوں جانب اسی کچرے اور کوڑے کے ڈھیر میں سے کاٹ کر دکان تک رسائی کے لئے سیڑھیاں سے نکالی گئی تھیں جو پچاس میٹر والی سڑک پر سے ہوتی

ہوئی اوپر تک پہنچتی تھیں۔ ٹرام کی پٹری کی طرف کو دکان کی مڑی تڑی شکل والا سائبان تھا جو تقریباً ڈھے جا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا ''چینی فالودہ'' زینہ کے پاس سے گذرتے ہوئے ایک دلچسپ نظارہ یہ بھی نظر سے گذرا کہ ایک جرمن شیرڈ (جرمن گدی) نسل کا کتا بڑا نظر آتا تھا اور اس کے مقابلے میں بلندی پر بھرپور بہار پر تھا۔ روڈ نیڈرم اور جلاپ کے پھول بکثرت کھلے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے پاس سے گذرتے ہوئے جب یہ سب بیان کیا تو میانو کھل کھل کر ہنس پڑی۔

''مزے کی بات ہوئی نا کہ صرف تیسرے ملک کا باشندہ ہی اپنی ضد پر اڑا اور قدم جمائے بیٹھا ہے۔''

''لیکن سننے کی بات تو نہیں معلوم ہی نہیں کہ یہ دکان گرانے اور ڈھانے سے کیوں بچی ہوئی ہے۔ اور اتنی بلندی پر کیوں قائم ہے؟''

''وہ کیوں؟''

کہتے ہیں کہ اب پورے شہر کی سطح تین فٹ اونچی ہوگئی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ پچاس میٹر لمبی سڑک ابھی پچھلی ہی سطح پر قائم ہے۔ جبکہ یہ کھوکھا اونچی کی ہوئی کافی بلند سطح پر قائم ہے۔ دراصل عمارت یا دکان کھڑی ہے............ میں نے کہتے کہتے زبان روک لی۔

''لاشوں پر؟ ہیں، مقتل پر؟''

''بس دونوں ہی پر سمجھ لو۔''

ہم نے جلدی سے اپنی نگاہیں چینی طرز پر بنی ہوئی فالودے کی دکان پر سے ہٹا لیں جو کوڑے کے انبار سے بنے چبوترے پر کھڑی تھی۔ بارش تھمی نہیں تھی۔ سڑک کی تعمیر سے متعلق کارکن مزدور پچاس میٹر لمبی سڑک کے دونوں جانب ننھے ننھے نورستہ پودوں کی کاشت میں مصروف تھے تاکہ مستقبل میں اس سڑک کے دو جانب گھنے سایہ دار درختوں کی مضبوط قطاریں کھڑی نظر آئیں۔ میں نے ایک مزدور سے سوال کیا۔

''تم کیا لگا رہے ہو؟''

سڑک کے دونوں جانب کی نشان دہی کے لئے درختوں کے پودے بٹھا رہے ہیں۔ شجر کاری کر رہے ہیں۔''

میرے دل میں ملال اور رنج کے گہرے سائے تیزی سے اترنے لگے۔ ویسے تو میں

مستقل ہی افسردہ رہتی تھی لیکن اس نظارے نے تو جیسے میرا دل دہلا دیا۔اس حقیقت کے احساس نے کہ اس پچاس میٹر لمبی سڑک کے دونوں طرف شجرکاری کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں اس سڑک کو فوجی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔

''یہ کس درخت کے پودے ہیں؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''یہ پلین اور لنڈن کے پودے ہیں اور یہ اتنی دیر سے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کے بڑے ہونے اور گھنے درخت بننے میں اتنی دیر لگتی ہے کہ ہم تو ان کے سائے میں بیٹھ بھی نہ سکیں گے ان کے بڑے ہونے کا انتظار ہی میں مرجائیں گے۔''

بوڑھے آدمی نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میرے چہرے پر لکھی رنج کی تحریر کو پڑھا۔ وہ خود بھی بسورہا تھا۔ دھوپ اور موسموں کی شدت میں تپے اس کے چہرے پر ملال کے ساتھ ساتھ طنزیہ مسکراہٹ بھی تھی۔

جاپان ریڈ کراس ہسپتال میں داخل ہو کر ہم نے انکوائری سے تسویا کو کے کمرے کا پتہ پوچھا۔ مجھے اس انکشاف پر بڑا تعجب ہوا کہ ان تین برسوں میں میانو نے اس کی کوئی خیر خبر لی ہی نہیں۔ جب سے وہ اس ہسپتال میں داخل ہوئی تھی۔ وہ کبھی اس سے ملنے آئی ہی نہیں۔ غصہ تو مجھے اپنے آپ پر بھی تھا کہ ہم میں سے کسی نے بھی تسویا کو کی تسلی بخش طور پر خبر گیری نہیں کی جبکہ ہمیں پتہ تھا کہ وہ گردوں کی دق میں مبتلا ہے اور اب تو اس کا حلق بھی متاثر ہو گیا تھا۔

اس کی بیماری کی شدت اور نوعیت جاننے کے باوجود جب میں اس لڑکی کے ساتھ ہسپتال آئی تھی جس کا چہرہ ایٹمی بم کے سبب مسخ ہو چکا تھا، تو میں ایک لحظ کو بھی اس کے کمرے کے پاس رکی تک نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھی میں ایک دن اور بھی اس ہسپتال آئی ایک لڑکی کی عیادت کرنے جس کی شکل اتنی مسخ ہو چکی تھی کہ انسان کے بجائے جانور سے زیادہ مشابہ ہوگئی تھی۔ اس ہسپتال میں وہ آپریشن کے لئے داخل تھی۔ اور چند دن بعد اس کا آپریشن ہونے والا تھا۔ اس دن بھی میں تسویا کو سے مل نہ سکی تھی۔ چونکہ تسویا کو میری والدہ کے سب سے چھوٹے بھائی کی بیٹی تھی۔ اور اس کی پیدائش سیئول میں ہوئی تھی۔ میں نے اس کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

بجز چند تصویروں کے جو وقتاً فوقتاً ہمیں ملتی رہتی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے حد دلکش اور حسین تھی۔ بالکل اپنی ماں کی تصویر۔ تاہم میرا دل اس کی طرف سے صاف نہ تھا۔ بیس سال پہلے کی بات ہے کہ انتہائی رنج وغم کی حالت میں کراتا سے علیحدگی کے بعد میں

نے لکھنا شروع کر دیا تھا اور میرے والد کی زمینداری تباہ ہو چکی تھی۔ اور اسی صدمے سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ جو روپیہ مجھے ٹوکیو میں ملتا تھا وہ اتنا کم رہ گیا تھا کہ گذار مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ میں قلم چلا کے کچھ کما سکوں لیکن میرے ناولوں کا کوئی خریدار نہ تھا۔ اسی اثنا میں میں بیمار پڑ گئی۔ اب مجبوراً میں نے اپنے بدنیت ماموں کو لکھا کہ مجھے کچھ رقم بھیج دیں، لیکن ماموں صاحب جنہوں نے نوآبادیاتی سیئول میں زمینیں، مکان اور کافی جائداد خریدی ہوئی تھی، جواب گول کر گئے تھے۔ دراصل یہ میری حماقت ہی تھی اس لئے کہ میں بچپن ہی سے ان کی بدنیتی اور خصلت سے واقف تھی اور وہ ہم سے ملتے بھی نہ تھے۔ بس میں خیالوں اور خوابوں ہی میں اپنی ماموں زاد بہن کو دیکھا کرتی جسے میں نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ ماموں نے جواب نہ دیا تو پھر ایک اور خط اسی مضمون کا بھیجا جس کا جواب مامون کے بجائے ممانی نے دیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ یہ بھی خوب رہی کہ وہ بھانجی جس نے کبھی ہمیں کسی موقع، کسی تہوار یا سال نو کسی بھی موقع پر مبارکباد کا ایک کارڈ بھی نہ بھیجا، آج ہم سے امداد طلب کر رہی ہے، پیسے کی صورت میں۔

پھر ایسا ہوا کہ تسویا کو شادی کے قابل ہوئی تو ماموں اور ممانی نے جوان دنوں ساری ون ہوانگ ہائے ڈو میں مقیم تھے۔ مجھے لکھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ اپنی بیٹی کی شادی نوآبادیاتی علاقے کے کسی فرد سے کریں۔ اب تم ایسا کرو کہ اپنی بہن کے لئے ٹوکیو میں کوئی مناسب رشتہ دیکھو۔ اس وقت میری ملکیت میں ایک مکان تھا اور میں اپنی والدہ کے ساتھ اس میں رہتی تھی۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا تھا کہ آپ اپنے بھائی کو لکھ دیں کہ آپ کو اپنی بیٹی کی تو اتنی فکر ہے تو کسی اور کی بیٹی کا خیال بھی تو کرنا چاہئے۔ لیکن اماں نے ایسا خط لکھنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ مجھے بہت پیار سے سمجھایا کہ تمہیں اپنی چھوٹی ماموں زاد بہن کا خیال کرنا چاہئے۔ چنانچہ اب وہ اور ان کے ساتھ میں بھی تسویا کو کی ایک بے حد سجی تصویر جس میں وہ لمبی آستینوں والے کیمونو میں تھی، ہم دونوں لئے گھر گھر پھرتی رہیں۔ نہ صرف اپنے عزیزوں کے گھروں میں گئے بلکہ اپنے جاننے اور ملنے والوں کے یہاں بھی تسویا کو کے لئے مناسب بر کی تلاش میں پھرتے رہے۔ غرض ایک عزیز گھرانے میں بات چل پڑی۔ اور اس طرح ٹوکیو اور کوریا کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ چل پڑا۔ بات طے ہو گئی۔ ایک نوجوان کا انتخاب کر لیا گیا۔ اب یہ تھا کہ بہت جلد لڑکے کی والدہ تسویا کو کو دیکھنے کوریا جانے والی تھیں کہ اچانک ماموں کا خط ملا کہ تسویا کو نے یہاں ایک لڑکا پسند کر لیا ہے۔ جو منچوریَن ریلوے میں اچھے عہدے پر کام کر رہا ہے اور اس کا مستقبل بہت امید افزا ہے۔

اس واقعے کے ایک ہی سال بعد ایک بلیک مارکیٹ بوٹ کے ذریعے ماموں اور ممانی اولین پناہ گزینوں کے ساتھ یہاں پہنچے۔ ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ ان دونوں کی عمریں ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھیں۔ اب دونوں ایک پرائمری اسکول میں جو پہاڑی علاقے کی ایک سطح مرتفع میں واقع تھا۔ اس علاقے کا یہ حال تھا کہ بجلی تک نہ تھی۔ ان کے ساتھ تسویا کو کے دونوں بچوں میں سے بڑا جس کی عمر چھ سال تھی، ان کے ساتھ ہی تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے ان کے اس حال پر ذرا بھی افسوس نہ تھا۔ یہ وہی تو ہیں جنہوں نے میرے حال پر رحم نہ کھایا اور میرے لئے ان کے دل سے پانچ ین بھی نہ نکلے۔ بیس سال پہلے ان کی بے اعتنائی نے جو زخم دل پر لگایا تھا، اس کا نشان ابھی تک دل پر ثبت تھا۔ اور بیس سال پہلے جو کھچاؤ تھا وہ اسی طرح اپنی جگہ موجود تھا، اب تسویا کو کے معاملے میں میری فکرمندی ایک اور ہی نازک معاملہ تھا۔ جیسے دل کے تنے ہوئے تاروں کو کسی نے مضراب سے چھیڑ دیا ہو۔ میں اس کا سامنا کرتے ہوئے کچھ گھبرا رہی تھی۔ جوں ہی ہم نے اس وارڈ کا دروازہ کھولا جو ایک طرح سے اس ہسپتال کا مثالی وارڈ کہا جاتا تھا، تو ایک خاص قسم کی صفائی اور بشاشت کا احساس ہوا۔ اس کشادہ روشن اور ہوادار کمرے میں پانچ پژمردہ اور نحیف عورتیں خاموشی سے اپنے بستروں پر پڑی تھیں۔ ہم دونوں میانو اور میں نے پہلی ہی نظر میں تسویا کو کو پہچان لیا۔ اس لئے کہ ہماری اور اس کے خدوخال میں ایسی گہری مشابہت تھی جو چھپائے نہیں چھپتی تھی۔

جب میانو اور میں کمرے میں داخل ہوئے تو اس وقت تسویا کو گڑ مڑی مارے پڑی ہوئی تھی بستر کے کنارے پر۔ جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں، اس نے ہمیں پہچان لیا، ایک موہوم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر لہرائی۔ لیکن وہ اسی طرح گڑ مڑی مارے تقریباً اوندھی پڑی تھی۔ دراصل وہ پیشاب کر رہی تھی۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے بڑی نرمی اور اخلاق سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس کی حالت اتنی نازک نہ تھی جتنی میرا خیال تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی ایسے بات چیت کرنے لگی جیسے ہم سدا سے ایک دوسرے سے اسی طرح ملتے جلتے اور بے تکلف تھے۔ وہ میانو سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔ لیکن مجھ میں ایک جھجک سی تھی۔ میں گپ شپ کی اتنی ماہر نہ تھی۔ سو میں نے جلدی سے اس کی طبیعت اور حال کے بارے میں سوال کر دیا۔

اس نے کہا ''مجھے چوبیس گھنٹے میں پینتیس چھتیس مرتبہ پیشاب کرنا پڑتا ہے۔ میں تو سونے کو ترس گئی ہوں۔''

تم جب بیمار پڑی تھیں تو اس وقت تمہاری کیا عمر تھی۔ میں نے اپنی کزن سے پوچھا۔ جو مجھ سے عمر میں چھوٹی تھی۔ اور تیس سال کی اب ہوئی تھی۔

''اماں ابا کے کوریا چھوڑنے کے ایک سال بعد میں اپنے دونوں بچے چھوڑ کر ان کے پاس اس پہاڑی علاقے میں چلی گئی تھی۔ وہاں جا کر رہنے کے بعد یہ ہوا کہ ایک سال بعد ہی میری ٹانگیں نا قابل بیان حد تک ٹھنڈی رہنے لگیں پیشاب بار بار اور جلدی جلدی آنے لگا۔ تسویا کو نے بڑی صاف گوئی سے بتایا۔ تمہیں پتہ ہے کہ اماں ابا ایسے سطح مرتفع پر جا کر رہے ہیں جو بس سمجھو کہ پہاڑ کے قلب میں ہے۔ وہاں کی زندگی کی سہولتیں برائے نام ہیں، نہ ڈاکٹر نہ کچھ اور۔ ڈاکٹر کو جا کر دکھانا بھی ایک جوئے شیر کے لانے سے کم نہ تھا۔ میں سوچتی ہی رہی کہ ڈاکٹر کے پاس جاؤں اور اس وقت تک حالت بگڑ چکی تھی۔ پھر ڈاکٹر نے اپنے کلینک میں داخل کر لیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال وہاں رہنے کے بعد اس ہسپتال میں داخل ہو گئی۔''

''مجھے تو یہ تعجب ہے کہ یہ بیماری تمہیں کہاں سے اور کیسے لگی۔ جس سے دونوں ہی گردے متاثر ہو گئے۔'' میں نے پورے جوش اور ملال سے کہا۔

''ارے، بہن میرے میاں پورے اڑتیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ دق کے مرض میں ختم ہو گئے۔''

''ہاں اماں نے مجھے بتایا تھا۔''

''ان کی موت کے بعد تقریباً اسی عمر میں دو بچوں کا ساتھ تھا اور تقریباً فاقہ کشی کی نوبت آ گئی تھی۔ اب اتنا وقت کہاں ملتا تھا کہ پوسان تک جا سکوں۔ میرے خیال میں بیماری کا ایک سبب یہ بھی ہوا۔'' تسویا کو اس طرح بات کر رہی تھی گویا وہ کسی اور کے بارے میں بتا رہی ہے۔

''پھر میں نے بیٹے کو اس کے ددھیال بھیج دیا، اپنے شوہر کے والدین کے پاس۔ لیکن میرا دل اپنے ابا کے لئے بڑا دکھتا ہے کہ میں اس حال میں پڑی ہوں تو ان کا دل کیسا دکھتا ہوگا۔ سوچتی ہوں اگر ٹھیک ہو گئی تو اپنے بچوں کو لے کر ان کے پاس پہاڑوں ہی میں جا کر رہوں گی۔ جہاں میرے والدین شاید کسی پرائمری سکول میں پڑھا رہے ہیں۔ اگر میں تندرست نہ ہوئی تو اپنی موت تک ان پر بوجھ بن کر رہ جاؤں گی۔'' وہ تمام باتیں جو تسویا کو دل ہی دل میں کرتی اور سوچتی رہتی ہو گی اب ہمارے سامنے کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

تسویا کو دھیمی دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی رہ رہ کر وہ اپنے ابا کا ذکر درمیان میں لے آتی

تھی۔'' وہ بالکل پہاڑ کے حصہ یعنی قلب میں واقع پرائمری سکول کی کسی شاخ میں کام کرتے ہیں۔انہیں جس روز مجھ سے ملنے آنا ہوتا ہے تین بجے رات ہی سے اٹھ کر چل پڑتے ہیں۔بیس میل کا فاصلہ پیدا ہی طے کر کے پہاڑ کے ساتھ ساتھ ٹرام کی پٹری تک پہنچنا ہوتا ہے۔یہ فاصلہ وہ معمولی مزدوروں والے کپڑوں اور ٹائی یعنی مزدوروں کے پہننے والے ربر سول جوتوں ہی میں طے کرتے ہیں۔بس میں چڑھنے سے پہلے کپڑے اور جوتے تبدیل کرتے ہیں۔''میں نے اور میانو نے تسویا کو کو سمجھایا اتنی باتیں نہ کرو تم تھک جاؤ گی۔یقیناً اس کے حال زار پر دل کڑھ رہا تھا اور ہمدردی بھی تھی۔لیکن اس اکیلی ہستی کے لئے دل اس طرح شق نہیں ہو رہا تھا جیسے اس دوسرے وارڈ میں پڑی عورت کو دیکھ کر دل پر آرا سا چل گیا۔جو ایٹم بم کی شعاعوں کی تابکاری سے جھلس کر رہ گئی تھی۔وہ چت پڑی ہوئی کیسے کرب سے کراہ رہی تھی۔تسویا کو کی تکلیف اور حالت اس سے کہیں بہتر تھی۔میں نے جب پہلی مرتبہ ان نوعمر لڑکیوں کو دیکھا تھا جو تابکاری سے جھلس کر ایسی نظر آ رہی تھیں، جیسے وہ آدھی انسان اور آدھی عفریت ہوں۔تو میرا عجب حال ہوا تھا۔ان کو دیکھ کر میں سب کے سامنے ہی بلک بلک کر رونے لگی تھی۔مجھے جب ان کی موجودہ اور آئندہ زندگیوں کا خیال آیا تو بے تاب ہو کر اس طرح روئی کہ میں اپنے بھائی تستو جی کے لئے بھی ایسا نہ روئی ہوں گی۔وہ تو فرد واحد اور میرا ذاتی غم تھا۔کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہوتا تو رات کی تنہائی میں آنسو بہا لیا کرتی تھی۔

جب تسویا کو اپنا حال بیان کر رہی تھی اور میں اس کو اس حال میں دیکھ رہی تھی، کہ جنگ کی تباہ کاریاں اور خرابہ یہاں بھی زندگی کو کوکھ میں چھپا بیٹھا ہے۔میرے اندر جو ایک آفاقی دکھ تھا تسویا کو اس کا محض ایک چھوٹا سا گوشہ تھا۔لیکن یہ بات ضرور تھی وہ غم کے اس وسیع دائرے سے باہر نہ تھی۔میرے اندر ایک عجیب وغریب کیفیت جنم لے رہی تھی۔میں اسے بیان یوں نہیں کر سکتی تھی کہ اس کا تعلق موت سے تھا۔ایک شاعر جس نے اس شہر کی تباہی کا چشم دید نظارہ کیا تھا، اور پھر جنگ کوریا سے پیدا ہونے والی صورت حال نے اس ساری تباہی اور المیے کو از سر نو اس کے ذہن میں بیدار کر دیا تو اس کے لئے ساری پریشان کن اور وحشت ناک یادیں گویا انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔چنانچہ دہشت اور پریشانی کے شدید دباؤ کے تحت اس نے خودکشی کر کے اپنا کام تمام کر لیا تھا۔میرے اندر اب اسی قسم کی وحشت اور خطرے کا احساس سر اٹھا رہا تھا۔ہر وقت ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تابکاری کے نتیجے میں پھیلنے والی بیماریاں از سر نو سر

اٹھانے لگیں۔ میں خودکشی کی قائل نہ تھی اور اس حرکت کو سخت ناپسند کرتی تھی لیکن اس کا کیا علاج کہ ہر وقت ایک مرگ ناگہاں اور خوفناک بیماریوں کا دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ ایٹم بم کی تابکاریوں کا خوف اک روگ بن کر میری جان کو لگ گیا تھا۔ مجھے یہی لگتا تھا کہ ایک دن میں اچانک ختم ہو جاؤں گی۔ میں جب سے ہیروشیما میں واپس آئی تھی تو دل پر سیاہ بادل سا چھایا رہتا تھا۔ اور مجھے یوں لگتا تھا گویا میری روح اپنے گھر کو اور اس تباہ شدہ شہر کو الوداع کہہ رہی ہے۔ گویا، دم واپسی ہو اور میں اپنے عزیزوں رشتہ داروں اور واقف کاروں سے خاموش اذن رخصت لے رہی ہوں۔ میرے اندر ایک خواہش جنم لے رہی تھی، کہ اپنوں سے ایک آخری ملاقات اور ان کی دید اس طرح ہو جائے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلے۔

''سنو میرے لائق کوئی خدمت؟ کوئی کام؟'' میں نے تسویا کو سے پوچھا۔ تو اس نے دھیرے سے سر ہلا کر جواب دیا۔

''شکریہ بہت بہت، لیکن مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ اس مثالی وارڈ میں تمام نرسیں میرا بڑا خیال رکھتی ہیں۔''

اس کو خدا حافظ کہتے ہوئے وارڈ سے نکل کر میں نے سوچا۔

چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ اس کو دیکھ لیا۔ حالانکہ یہاں اس سے ملاقات کے لئے آنے میں سراسر میرے ہی ارادے کو دخل تھا۔

''میری تو جیسے ہی اس پر نظر پڑی میں نے پہچان لیا۔ عین مین تمہاری صورت ہے۔'' میانو سے میں نے سرگوشی میں کہا۔ ہم دونوں راہداری سے نکل کر صدر دروازے کی طرف جا رہے تھے۔

''ارے نہیں بالکل تمہاری شکل ہے۔'' میانو نے فوراً جواب دیا۔

''تمہارے اور اس کے چہرے میں ذرا بھی فرق نہیں۔''

ہم اس کشادہ اور وسیع صدر دروازے کی طرف آ گئے جس کو اب ٹھیک ٹھاک کر کے جنگ سے پہلے والی شکل دے دی گئی تھی۔ جب ہم پتھر سے بنی نیچی نیچی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے تو مجھے سفید لباس میں وہ نرس آتی نظر آئی جس سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں آخری بار ہسپتال آئی تھی۔ بلکہ اس نے مجھے کھانا بھی کھلایا تھا۔ میری اور اس کی بہت باتیں ہوئی تھیں مجھے اس کا نام بھی یاد تھا۔ دل چاہا تھا کہ اس کا نام لے کر آواز دوں۔ لیکن پھر ہمت نہ ہوئی اس

لئے کہ پچھلی بار کی ملاقات اور گفتگو میں اس کے منہ سے کچھ ایسی باتیں سنی تھیں جو سیاہ آسیبی پرندوں کے پر بن کر میرے دل پر سایہ فگن رہتی تھی۔ ان کے منحوس پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ابھی تک دل میں بازگشت بن کر موجود تھی۔ میں نے اس کو مخاطب کرنے کا حوصلہ اسی لئے نہ کیا کہ اب دوبارہ اس قسم کی باتیں سننے کا حوصلہ نہ تھا۔ نوجوان نرس نے جس کا نام فیو کاہارا تھا اپنے جوڑوں اور اعضا پر پڑے ہوئے زخموں کے وہ نشان دکھائے تھے جو گرتے مکان کے ملبے کے نیچے دب جانے سے پڑ گئے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کتنی دیر تک نرسوں کی ڈارمیٹری کے ملبے کے نیچے پڑی رہی تھی اور اس کے اردگرد آگ کے شعلے ناچ رہے تھے۔ یہ عین چھ اگست کی بات نہ تھی بلکہ سات اگست کا واقعہ ہے جب وہ گھسٹی رینگتی ہسپتال کے صدر دروازے تک پہنچی تھی۔ اس نے ہی مجھے بتایا کہ اس موقع پر جتنے ڈاکٹر، نرسیں اور مریض زندہ بچے تھے وہ بھی نیم مردہ اور خون میں تر بتر تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اور زخمی مریض تھے کہ ہر طرف سے غول کے غول امنڈے چلے آتے تھے۔ ہسپتال میں صحت مند ڈاکٹروں اور نرسوں کی اس درجہ کمی تھی کہ میں اپنے زخموں اور چوٹوں کی شدت سے نہ کھڑی ہوسکتی تھی اور نہ چل سکتی تھی۔ اس کے باوجود گھسٹ گھسٹ کر اور زمین پر رینگ رینگ کر میں ان کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کر رہی تھی۔ مریضوں کی کراہوں اور کربناک چیخوں کا عجیب عالم تھا۔ ہر ایک کے منہ پر ایک ہی لفظ تھا۔ ''پانی، پانی، خدا کے واسطے دو گھونٹ پانی پلادو۔'' وہ اسی طرح چیختے چیختے دم دے دیتے۔ اور میرا یہ حال کہ زمین پر گھسٹتی ہوئی چاروں طرف گھوم رہی تھی اور ان کے منہ میں پانی ڈال رہی تھی۔ اور کہتی

''لو پانی پیو............منہ کھولو............یہ لو پانی۔'' اور پھر یہ ہوا کہ پانی بھی ختم ہو گیا۔ ایک قطرہ پانی نصیب نہ تھا۔ حتیٰ کہ میں زور زور سے چیخنے اور سر پھوڑنے لگی۔ ''ارے کیا کروں مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ایک شیر خوار بچے کو اس کی مردہ ماں کے پہلو سے اٹھا لیا اور رو رو کر اس سے سوال کرنے لگی۔ ''ارے تم کیوں پیدا ہو گئے؟ کس لئے اس دنیا میں آ گئے۔ کیا ماں کی کوکھ کچھ بری تھی۔ نرم گرم اور ہر آفت سے محفوظ نو مہینے تو گذار لئے تھے تو اب یہی وقت رہ گیا تھا اس دنیا میں آنے کا۔ کاہے کو پیدا ہو گئے ہو۔ نہیں آنا تھا نا اس دنیا میں۔''

اس وقت فیو کوہارا کے جذبات میرے دل میں اتر گئے تھے۔ وہ کہتی رہی تھی اور میں سنتی

رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ لاشوں سے راہداری پٹی پڑی تھی۔ ہر لاش پر ایک کاغذ چپکا دیا گیا تھا ''مردہ'' ایسے میں ایک پگلے شخص نے لاشوں پر کودنا شروع کر دیا۔ ان کے زخمی گوشت اور بدن کی طرف اشارہ کر کے وہ بکے جا رہا تھا۔ ''ان کے چاروں طرف چوڑی اور زرد پٹی ہوئی ہے۔'' وہ لاشوں پر اس طرح کودتا پھر رہا تھا جیسے پتھروں پر کود رہا ہو۔ اس سے اگلے دن اس نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ ''ذرا سا سوپ تو پلا دو ہمیں۔'' اور ابھی چند چمچے ہی حلق سے اترے تھے کہ دم دے دیا اس نے۔

فیوکو ہارا کے پاس۔ ہسپتال کی المناک کہانیوں کی ایک پوری الف لیلہ موجود تھی۔ درد وکرب کے لامتناہی قصے۔

اب یہی تو ڈر تھا کہ اگر میں نے اس کو آواز دے دی اور وہ اپنی دستان کو وہیں سے مکمل کرنے بیٹھ گئی جہاں سے چھوڑی تھی تو یہ میانو پر زیادتی ہوگی۔ اس لئے کہ اس کو دن ڈھلنے سے پہلے پہلے گاؤں پہنچنا تھا۔ دوران سفر فیوکو ہارا کے یہ دہشت ناک اور دلخراش قصوں سے ہیولے بھوتوں کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہیں گے۔

میانو کے ہمراہ شاپنگ کے لئے جانے سے پہلے میں نے ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور کے پے فون پر شن کیچی سے بات کی۔ شن کیچی کراتا کا وہ بیٹا تھا جو مجھ سے اکثر ملنے آیا کرتا اور کبھی رات کو بھی میرے پاس رک جاتا تھا۔ جب سے اس کی ماں تسورو کو کا انتقال ہوا تھا، اماں نے کراتا کو معاف کر دیا تھا اور وہ شن کیچی کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آنے لگی تھیں۔ وہ ایک مختصر سی کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ جو سن مبو کے نام سے ہیروشیما کی لڑائی کے بعد قائم کی گئی تھی۔ وہ اس کمپنی کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھا۔ یہ عہدہ لڑائی کے بعد کا تاثر رکھتا تھا اپنے نام کے حوالے سے۔ اس نے میرے فون کا جواب ایسے دیا گویا وہ میرے فون کا منتظر ہی تھا۔

''ہاں میں نے کل آپ کا نام اخبار کے ایک پینل میں دیکھا تھا اور مجھے پتہ نہ تھا کہ آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں۔ سو میں نے ایک کارڈ آپ کو اس اخبار کی معرفت لکھا تھا۔'' اس نے بہت ہی ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔ ہونہہ ہمیشہ کی طرح وہی خود پسندی اور ہیکڑی جتا رہا ہے۔ میں نے سوچا اور اس سے کہا کہ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں ایک بار۔

''ایک بار کیوں؟ کیا آج آپ میرے گھر نہیں آئیں گی؟ پتہ ہے یہاں شام کو اتنے جگنو نکل آتے ہیں کہ بہت ہی خوبصورت نظارہ ہوتا ہے۔'' مجھے شن کیچی کے مزاج کا خوب اندازہ

تھا۔ کراتا سے شادی کے بعد میں شن کیچی اور کراتا کے دوسرے بچوں کے ساتھ بہت رہی تھی۔ ہمیشہ اس کی باتوں میں مصلحت آمیز چاپلوسی کا انداز ہوا کرتا تھا۔ اب جب اس نے کہا کہ آپ بتائیں کہاں ٹھیری ہوئی ہیں میں خود آتا ہوں آپ کو لینے۔ وہ جتنا اصرار کر رہا تھا۔ اتنا ہی مجھے اس کی بات اور آواز میں ظاہری داری اور بناوٹ کا شبہ ہو رہا تھا۔ اب بات یہ تھی کہ کچھ تو یہ لالچ کہ شاید اس سے اس ملاقات میں مجھے اپنے بچے کا اتہ پتہ معلوم ہو جائے۔ اور پھر یہ کہ اس سے مل کر دل کی اس پرانی بے قراری اور بے تابی کو تھوڑی بہت تسکین مل جاتی جواب تک اس کے باپ کے سلسلے میں میرے دل کے نہاں خانے میں کہیں نہ کہیں موجود رہتی تھی۔ میں نے لائن کے دوسرے سرے پر بیٹھے ہوئے شن کیچی سے کہا

''سنو میں اپنی ایک عزیزہ کے ساتھ دو گھنٹے کے لئے جا رہی ہوں۔ انہیں آج ہی واپس گاؤں جانا ہے۔ چنانچہ اس کو رخصت کر کے اگر وقت ملا تو میں ضرور تمہاری طرف آؤں گی۔''

شن کیچی نے بڑے شگفتہ اور زندہ دلانہ انداز میں اپنے گھر کا پتہ بتایا جو شہر کے مضافات میں واقع تھا۔ جب میں باتیں کر رہی تھی تو اس وقت میا نو اسٹور کے کسی شعبہ کے اندر خریداری میں مصروف تھی۔ وہ خریداری سے فارغ ہو گئی تو ہم دونوں اپنی چھتریاں کھولتے ہوئے صدر دروازے کی طرف بڑھے۔ میا کو کی چھتری کا رنگ کتھئی اور میری چھتری سبز رنگ کی تھی۔ پھر ہم ٹرام کی پٹڑی والی سڑک پر چلنے لگے۔ اور وہاں سے ہم ٹرام پر سوار ہو گئے۔ ''دیکھو کب اب اس بہن سے ملنا ہوتا ہے۔'' میں سوچ رہی تھی ساتھ ہی میرے دل میں ایک اور خواہش بھی سر اٹھا رہی تھی۔ کراتا سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔ یہ خواہش پہلا سا دم گھوٹنے والا جذبہ نہ تھا بلکہ ایک بڑی میٹھی اور سہانی سی یاد تھی جس میں اپنائیت اور ایسی مانوس آشنائی اور قربت کا احساس تھا جسے کسی بھی قریبی عزیز سے قرب اور ملنے کی خواہش کہا جا سکتا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ جنگ کی تباہ کاریوں نے میری جو ذہنی حالت کر دی ہے اس انتشار اور اندھیرے کو صرف کراتا ہی سمجھ سکے گا۔

کراتا مجھ سے بارہ سال بڑا تھا اور وہ سوشلسٹ نظریات کا معتقد اور حامی تھا۔ اور اوسا گی سا کائی کا پیروکار تھا۔ جو بیسویں صدی کے اوائل کے انارکسٹوں میں سے تھا۔ کراتا نے یہ بات اس وقت منہ سے نکالی تھی جب میں اس کو چھوڑ کر ٹوکیو جانے والی تھی۔ تب اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہاں اس سے ضرور ملنا۔ کراتا اگرچہ اپنے منفی رویوں اور مخالفانہ ذہن کی بنا پر گذر جانے والی بات کو ذہن سے جھٹک دینے کا عادی تھا، تاہم مجھے اس بات کا کامل یقین تھا کہ جنگ کے خلاف

جذبات ابھی تک اس کے اندر موجزن ہوں گے۔ اور اس کے خلاف ابھی تک اس کے اندر نفرت کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔

اگر چہ شن کیچی بیوی والا تھا اور کراتا سے الگ اپنے گھر میں رہ رہا تھا، باہم ایک امید سی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ بیٹے سے ملنے ادھر آ نکلے اور اس طرح اس سے آمنا سامنا ہو جائے۔ بہر حال ان ہی سوچوں میں گم میں میانو کے ساتھ بس کے اڈے تک گئی تا کہ اس کو رخصت کر سکوں۔ بس کے انتظار میں جب ہم دونوں انتظار گاہ کی بنچ پر خاموش بیٹھے تھے تو یہ خیال کر کے کہ اب ہمارے پاس بات چیت کا وقت ہی کیا رہ گیا ہے۔ میں نے آہستہ سے کہا

تمہارا معاملہ واقعی بہت پیچیدہ اور صبر آزما ہے۔ اس لئے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کیا ہو جائے۔ اور واقعی ایک معذور شخص کے ساتھ تنہا زندگی گذارنا آسان نہیں۔ لیکن میں تم کو یہی رائے دوں گی کہ اس کی زندگی تک تم اس کے پاس ہی رہو۔''

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔''

''ہاں بات یہ ہے کہ اب کوئی راہ فرار ہے بھی تو نہیں اور اگر حالات سے فرار اختیار کرو گی تو یاد رکھنا پچھتاؤ گی۔'' جب میں میانو کو سمجھا رہی تھی تو مجھے لگ رہا تھا کہ یہ بات میں خود اپنے آپ سے بھی کہہ رہی ہوں۔ میانو چار بجے سہ پہر والی بس سے اپنے گاؤں روانہ ہوگئی۔ تو مجھے شن کیچی کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ چار بجے تک گھر پہنچ جائے گا۔ اب اگر میں دامن کوہ میں واقع شن کیچی کے گھر جاتی جس کے ایک جانب ایک طویل دریا بہتا ہے تو پھر مجھے ٹیکسی لینا پڑتی اور پھر اس سے اتر کر بس پر چڑھنا پڑتا۔ اور اگر میں تیکو کے گھر واپس چلی جاتی تو وہاں سے تو پیدل ہی کا راستہ تھا۔ بس ٹیکسی سے اتر کر سامنے والے کیمپ گراؤنڈ کو ہی پار کرنا تھا لیکن تیکو کے گھر پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ رینگتے ہوئے کیچوؤں سے پھر سابقہ پڑتا۔ اور پھر وہاں سے شن کیچی کے گھر جانے کا خیال بھی بہت پریشان کن تھا۔ ہچکچاتے ہوئے میں نے اس کو بچوں کے لئے کچھ چیزیں خرید ہی لیں۔ دامن کوہ میں ابھی تک بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سورج ڈوبنے ہی کو تھا اور شفق پھوٹ رہی تھی۔ شن کیچی کے صدر دروازے کے ساتھ تین بائیسکلیں پاس پاس کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک خوبصورت تھی جس پر سرخ رنگ کا اینیمل پینٹ کیا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک چھوٹے سے بچہ سائیکل تھی۔ کمرے میں قاعدے کا فرنیچر موجود تھا۔ وسط میں ایک شطرنج کی بساط رکھی تھی پاس ہی کھیل کے قوانین پر کتاب رکھی تھی، بساط کے پاس شن کیچی آلتی پالتی مارے

تنہا بیٹھا، پتھر کی سیاہ اور سفید گوٹیں جما رہا تھا۔ برآمدے کے ایک گوشے میں چھجے تلے کینیری کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ جس میں کینیر پھدک رہی تھی۔ چھوٹے صحن میں کائی اور پتھر ارادتاً جمائے ہوئے تھے۔ مجھے یہ عجیب سی فضا محسوس ہوئی۔

''بھئی تمہارے گھر کا تو سارا ماحول ہی بوڑھا سا نظر آ رہا ہے۔ بہت ہی بڑھاپا طاری کیا ہوا ہے تم نے۔'' میں نے شن کیچی کو بساط پر گوٹیں جماتے دیکھ کر کہا۔

''جی ہاں۔ میں اچانک ہی بڈھا جو ہو گیا۔''

''اچھا......آ......آ......کیا عمر ہے تمہاری پھر؟''

''میں......بتیس سال کا ہو گیا ہوں اور طالبات مجھے چاچا جی کہہ کر بلاتی ہیں؟''

''بس جتنی اس کی اب عمر تھی اسی عمر میں کراتا مجھے ملا تھا۔''

میں نے اس سے کہا ''بتیس سال کی عمر میں تم نے بوڑھوں کے شوق پال لئے ہیں اور وہی طرز زندگی اختیار کر لیا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی......گویا تم ساٹھ سال کے بوڑھے ہو چکے ہو۔''

''ارے ہمارے بڈھن کی اب اس وقت اتنی ہی عمر تو ہے۔''

لیکن بات سنو! بتیس سال کی عمر میں تو تمہارے بڈھن نے یہ شوق پالے نہیں تھے کہ اکیلے بیٹھے بساط پر گوٹیں جما رہے ہیں۔ بالکل تنہا لنڈورے رہ جانے والوں کی طرح۔ اس عمر میں تو وہ چڑ تے تھے بونسائی پودوں وغیرہ کی دیکھ بھال اور پرداخت کے تصور ہی سے۔

''بھئی میں تو یوں بوڑھا ہو گیا کہ مجھے پتہ ہی نہیں کہ کب بیٹھے بٹھائے مر جاؤں۔'' یہ کہتے ہوئے ایک موہوم سا تبسم اس سے کے لبوں پر آیا۔ اور اس وقت میں نے شن کیچی کے چہرے اور آشفتہ مزاجی پر غور کیا۔ اس کا چہرہ اپنی ماں تسورو کو کے خوبصورت چہرے سے بے حد مشابہ تھا۔ جس میں جاذبیت کی کمی تھی۔ اس کا قد و قامت اپنے باپ کے تیکھے البیلے قامت اور بدن پر تھا۔ چوڑے اور دبلے دبلے ہاتھ اور پیر تھے۔ اپنی ماں کی صورت اور باپ کے قامت سے مشابہ یہ لڑکا جو آلتی پالتی مارے میرے سامنے بیٹھا تھا، اندر سے کتنا شکستہ اور نحیف و نزار نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ مجھے بتانے لگا۔

میں تو اپنی موت کا منتظر تھا۔ خیر وہ موت تو آتے آتے کہیں بھٹک گئی اور میرے سر کے سارے بال جھڑ گئے۔ پھر دوبارہ ایک ایک بال جمنا شروع ہوا۔ اب یہ دیکھیں کہ اب کسی طرح سات سال اور جینے کا انتظار کر لیا ہے۔

''دراصل اس شہر میں اب کوئی بھی کسی سے بھی ملے تو اس قسم کے مکالموں سے مفر نہیں۔''
وہ کہتا رہا۔

''میں اسی گھر میں پورے وقت ہی رہا۔لیکن ہمارے بڑھن یو جنیا پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ یاد ہے آپ کو؟ ان کی سالگرہ چھ اگست کو ہوتی ہے۔ میری بیوی نے ان کی سالگرہ منانے کے لئے اوہا گی چاول کے گلچے سویرے سویرے تیار کئے اور کہنے لگی میں تھوڑی دیر میں کلچے لے کر خود او جنیا جاؤں گی۔ ابھی آٹھ نہیں بجے تھے۔ اب گاڑی اسی علاقے سے گذر رہی ہوگی۔ تقریباً آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر شاید اسی علاقے کو ہدف بنائے گی۔ اور گاڑی او جنیا کے قریب پہنچنے کو تھی، جب بم گرا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ ختم ہوگئی جس مقام کو نشانہ بنایا گیا تھا، اسی کے قریب مرگئی ہوگی۔ چنانچہ اگلے دن ہچو بوری سے کامی یا چو تک اس کی تلاش میں گیا ابھی وہاں آگ بھڑک رہی تھی۔ شعلے اٹھ رہے تھے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ اور اتنی مسخ کہ عورت اور مرد کی شناخت بھی ناممکن تھی۔

میں ایک ایک لاش کو الٹتا پلٹتا اور چہرے کو گھور گھور کر شناخت کرتا رہا۔

اس طرح شن کیچی اس علاقے کی تابکاری کے اثرات اور باقیات کی زد میں آ گیا۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ گھوم پھر کر دیکھنے سے پتہ چلا کہ تمام شہر جل کر سوخت ہو چکا ہے اور اس شہر کے گلی کوچوں میں کوئی عورت چل پھر نہیں سکتی۔ کوئی عورت گھر واپس نہیں پہنچی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یہیں کہیں جلی مری ہوگی۔ اور اسی خیال کے تحت تین دن تک میں اسی مسموم علاقے میں گھومتا اور جلی سڑکوں لاشوں کو الٹتا پلٹتا رہا۔

''اور تمہاری بیوی او جنیا میں بیٹھی تھی۔''

جی! اور یہ دیکھئے کہ تین روز بعد چلی آ رہی ہیں بڑے میاں کو ساتھ لئے بالکل معصوم اور بے خبر صورت بنائے۔ وہ دونوں اس حادثے کے چوتھے دن پہنچے اور میں اس وقت تک خون تھوکنے لگا تھا۔

''ہاں جس وقت میں تابکاری کے اثر سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا خیال کرتی ہوں تو ان امریکیوں سے نفرت ہونے لگتی ہے میں ان کو کبھی معاف نہیں کرسکتی۔'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔

''یہ تابکاری اثرات سے پیدا ہونے والی بیماریاں جو ہوتی ہیں نا یہ تو آدمی کی جان کو بھوت

کی طرح چمٹ جاتی ہے۔ زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتیں۔''

ہماری گفتگو کے دوران شن کیچی کی بیوی نے کھانا میز پر لگا دیا تھا۔ گرم کی ہوئی سا کی (شراب) سبو میں بھر کر رکھ دی تھی۔ شن کیچی اس مقابلے میں دبلا پتلا اور نحیف نظر آ رہا تھا۔ اب اس میں رہا ہی کیا تھا سوائے چوڑی ہاڑ اور دراز قامت کے۔ اس کی بیوی کا قد چھوٹا تھا اور گول گول گداز بدن تھا۔ چہرہ کسی نوعمر بچی کی طرح گلابی گلابی۔ میں نے ناؤ کو کی زبانی سنا تھا کہ وہ بڑے اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے دونوں بیٹے خوشی کے مارے میرے اور شن کیچی کے گرد منڈلا رہے تھے۔ کھانے کی میز پر بس دعوت شیراز ہی رکھی تھی سادہ اور کفایت سے تیار کئے ہوئے کھانے تھے۔ ہم دونوں یعنی شن کیچی اور میں اتنے مدہوش ہو چکے تھے۔ کہ اب ہماری زبانیں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں۔

''اچھا! اور کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ وہ اپنے ایٹم بم گرانے کا سبب اور عذر کیا پیش کرتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ ہم نے جنگ کی ہلاکتوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ایٹم بم گرایا تھا'' میں نے شن کیچی سے سوال کیا۔ ''کیا تم یقین کر سکتے ہو۔ ایسی بات پر۔''

''اچھا اب مجھے اتنا احمق نہ سمجھیں۔ کون الو کا پٹھا ان کے ایسے عذر اور بہانہ سازی پر یقین کرے گا۔ ذرا کوئی جے آر اوپن ہیمر سے پوچھے تو کہ کیا اس نے اپنے صدر کو بتایا تھا کہ وہ اس کا تجربہ اس طرح آبادیوں پر کرے گا۔ جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کے لئے۔ یا پھر ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یا صرف آزمانے اور تجربہ کرنے کی خاطر اور یہ احساس دلانے کے واسطے کہ یہ ایٹمی دور ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہروں کو ہدف بنا کر وہ قتل عام کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ آخر کب تک اپنے آپ کو یقین دلانے میں کامیاب ہوسکیں گے اور کب تک اس یقین میں مبتلا رہیں گے کہ یہ تجربہ اور دریافت کر کے انہوں نے تاریخ انسانیت میں ایک روشن اور شاندار باب کا اضافہ کیا ہے؟''

''تمہیں پتہ ہے؟ تم جب اس قسم کی گفتگو کر رہے ہوتے ہو تو تمہارا چہرہ کتنا دلکش اور روشن نظر آتا ہے۔ پھر تم کیوں کسی تارک الدنیا اور گوشہ نشینی کی سی زندگی گذار رہے ہو؟ بولو۔ بولتے رہو۔''

''میری صحت کب اجازت دیتی ہے۔''

''اچھا تمہارے بڈھن کے کیا خیالات ہیں۔ بڑے میاں کیا کہتے ہیں؟''

''ان کا بھی حال تباہ ہے۔''

''کیوں کیا بیمار ہیں وہ؟''

''السر ہیں پیٹ میں۔بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہ اس بے یقینی اور بے بسی کے سمندر میں تیرتی ہوئی دنیا سے دور دور رہ کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔نہ میں اور نہ میرا باپ کسی امن مشن ہونے جوگے رہے ہیں۔نہ ہی وہ اثر رسوخ استعمال کر سکتے ہیں جو آپ کے پاس ہے۔''

''مگر یہ غلط ہے۔تمہارے پاس اثر رسوخ ہے۔بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔اگر پورا معاشرہ ایک مٹھی اور ہم زبان ہو جائے تو اس سے بڑا اثر رسوخ اور کیا ہو سکتا ہے۔''

شن کیچی خاموشی سے ساکی کے گھونٹ حلق سے اتارتا رہا۔اچانک ہی میں پوچھ بیٹھی۔

''سنو تم کو میرے بچے کی بھی کوئی خبر ہے؟ سمجھ رہے ہونا۔میرا بیٹا۔تم کو اس کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہو مجھے بتا دو۔''

''مجھے اس کے حالیہ ماضی کے بارے میں تو کچھ خبر نہیں۔''شین کیچی نے جواب دیا۔مجھے اس کی ابروؤں پر ملال کا ایک خفیف سا شائبہ محسوس ہوا۔دراصل وہ بہت نرم خو اور نیک دل تھا وہ کسی کو کرب اور اذیت میں مبتلا دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔وہ ظریفانہ انداز میں مجھے بتانے لگا کہ جب وہ بہت چھوٹا تھا تو وہ جو اس کے باوا جان ہیں نہ وہ نئے سال کے روز اس کو ہمارے یہاں لایا کرتے تھے ملوانے۔اور ہم بھی اس کو دیکھا کرتے تھے۔جب وہ ان بڑے میاں کو ابو کہہ کر پکارتا تھا تو یہ بات ہمیں بہت مضحکہ خیز لگا کرتی تھی۔ایک دن اس نے ہمارے کھلونے دیکھے تو ان کو لینے کی ضد کرنے لگا۔ہمیں پتہ تھا کہ وہاں اس کے پاس ڈھیروں کھلونے ہیں وہ لوگ اس پہ اپنی جان چھڑکتے تھے لیکن اس کو یہی ضد تھی کہ ہمارے کھلونے لے گا۔وہ میری لمبی تلوار کے پیچھے دیوانہ تھا۔اور بڑی ضد کرتا تھا۔جب وہ ہمارے پاس سے جاتا تو ہماری کئی چیزیں گم ہوتی تھیں۔قصہ یہ تھا کہ ہمارے باوا جان چپکے چپکے وہ سب چیزیں اس کے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔

اب مجھے یہ پوچھتے خوف آ رہا تھا کہ وہ اب زندہ ہے یا مر چکا ہے۔اگر مر گیا تو معلوم کرنے سے فائدہ۔اور اگر زندہ بھی ہے تو اس کی تلاش بے سود اور بے معنی ہے۔میں پھر زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہر سکی۔

''اچھا تمہارے پاپا کو کچھ خبر ہو گی کہ وہ اب کہاں ہیں؟'' کراتا کو بچے اسی نام سے یعنی پاپا کہہ کر پکارتے تھے اور میں نے اس وقت یہی نام لیا تھا۔

''نہیں میرا خیال ہے کہ وہ اب اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ۔ جنگ کے بعد سے انہیں اس کی کوئی خبر نہیں ۔ وہ کبھی اس کے بارے میں بات بھی نہیں کرتے ۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ اس کی گود لینے والی ماں کا بھی لحاظ کرتے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ تو اس خیال سے ہی ہراساں رہتی ہیں کہ آپ کا اور اس کا آمنا سامنا نہ ہو جائے ۔''

اس چیز نے میرے دل میں خطرے کی گھنٹی سی بجائی ۔

''بھلا دیکھو تم مجھ سے ملنے آتے رہے حد یہ کہ ناوکو ملتی رہی بس ایک نہیں ملا تو وہ ہی نہ ملا میرا اپنا بچہ ۔''

میں نے اس کی موت کے بارے میں الفاظ کو منہ سے نکالا ہی نہیں ۔ بس زبان پر آتے آتے رہ گئے ۔

''کراتا کو کچھ بھی معلوم نہیں ؟ یا ہے کچھ پتہ ؟''

چند لمحوں بعد میں اٹھ کھڑی ہوئی ۔

''بہت دیر ہو گئی ۔ اب چلنا چاہئے ۔''

''گھر جا رہی ہیں ؟ مگر آپ جا تو نہیں سکتیں ۔''

''کیوں ؟''

''اس لئے کہ باہر شدید بارش ہو رہی ہے ۔ اور اگر آپ اس بارش میں ہی جانا چاہتی ہیں تو مجھے آپ کو اپنی سائیکل پر لے جانا پڑے گا ۔ لیکن میں نہیں لے جاؤں گا ۔

وہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کرتے وقت بھی میرے ذہن میں کراتا کا تصور تھا ۔ اور یہ تو محض ایک طلسم خیال تھا جو ہمہ وقت میرے اندر خیالوں اور سوچوں کی ایک رو بن کر جاری وساری رہتا تھا ۔ اور میں تو اس کو ہیروشیما کی لاشوں کے درمیان بھی ڈھونڈتی رہی تھی ۔ شن کیچی کی نوخیز بیوی نے دوسرے کمرے میں مچھر دانی لگا دی تھی اپنے بچوں کو بستر میں لٹا کر ۔ مہمان خانے میں میرے لئے بستر تیار کرنے لگی تھی ۔

''یہ گھر بھی تو تباہ ہو گیا تھا ۔ کہ نہیں .....'' میں نے اس سے کہا ۔ ''میرا خیال ہے اس طرف ایسی تباہی نہیں آئی تھی ۔''

''ہاں کیوں نہیں ۔ دیواروں میں اچھا خاصہ جھکاؤ آ گیا ہے اور جگہ جگہ سے پلاستر شق ہو رہا ہے ۔ ہمارے گھر کی آدھی چھت تو اڑ ہی گئی تھی ۔ بارش میں ایسی ٹپکتی تھی جیسے کھلے آسمان کے نیچے

بیٹھے ہیں۔ چھت کی تو ابھی مرمت کرائی ہے۔'' شن کیچی کے ساتھ میں صدر دروازے کے باہر کھڑی ہو کر مچھر دانی لگنے کا انتظار کرنے لگی۔ بارش کے کیچڑ پانی میں کھڑی بائیسکلوں میں سے سرخ لیڈیز سائیکل چمک رہی تھی۔ میں نے ایک اونچی سی ڈیسک سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''تم خوش قسمت ہو کہ تم نے اپنی بیوی کیلئے یہ بائیسکل خرید لی ہے۔ اب دونوں ساتھ ساتھ سائیکلوں پر نکلتے ہو گے اچھی ہوتی ہے نا ایسی زندگی۔''

''میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیوی کو ہر خوشی اور راحت دوں۔''

یہ لفظ سن کر مجھے بالکل یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ اس بات میں اس نے مجھ پر کوئی ڈھکی چھپی چوٹ کی ہے۔ میں نے مڑ کر بے خیالی میں اس دیوار پر نظر ڈالی جس کے سات ڈیسک لگی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک شیکیشی پوئٹری کارڈ لٹکا ہوا تھا جس پر یہ الفاظ خوشخطی سے لکھے ہوئے تھے۔

''انسانی محبت اور عشق کالعدم اور فانی ہے۔''

اچھا تو یہ بات ہے۔ اب میری سمجھ میں شن کیچی کے مزاج میں اس تبدیلی اور گھر کے ماحول پر طاری کیفیت کا سبب سمجھ آ گیا۔ کارڈ کے بائیں طرف کونے میں دستخطی انداز میں تحریر تھا۔ ''ہان سین آن'' جس کا مطلب تھا ''نیم درویش کی کٹیا'' یہ یہ ''درویش کی کٹیا'' کیا ہے۔ میں نے سوال کیا۔ وہ گھر جہاں میرے بڑے میاں رہتے ہیں اس کا نام ہے اور بجائے اس کے وہ عمودی تختی پر گھر کا نام لکھوا کر ٹانگتے انہوں نے افقی انداز میں تختی ٹانگ کر اس پر لکھ رکھا ہے ہان سین آن۔ (نیم درویش کی کٹیا)

مجھے تو ایک دھچکا سا لگا۔ میں تو حیران رہ گئی۔

''ارے یہ شیکیشی تمہارے بڈھن کی ہے۔ انہوں نے لکھی ہے۔''

''بالکل''

اس بات پر میں نے گہری سانس لی اور دم بخود رہ گئی۔ جیسے کبھی گئے دنوں میں کیا کرتی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے پیروں کی جان نکل گئی۔ مایوسی کے اتھاہ عالم میں کراتا کے سلسلے میں عجیب سا یاس انگیز احساس تھا جس نے مجھے مغلوب کر دیا تھا۔ عرصہ ہوا جب میں اس کو چھوڑ کر جا رہی تھی تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں یہ برداشت نہیں کروں گا کہ اب تم کسی اور مرد کی محبت سے خط اور لذت اٹھاؤ اور سنو ایسا کبھی ہو گا بھی نہیں۔ لہٰذا اب تم اپنے کام سے ہی لذت

یاب ہونے کی کوشش کرنا۔ اصل بات یہ تھی کہ جو سوشلسٹ نظریات رکھے یاوجود وہ موسم گرما کے جشن میں میری شرکت پر سیخ پا ہو جاتا تھا اور میرے اس فعل کو آوارگی اور بے ہودگی پر محمول کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اجتماعی رقص اور ایسی ہی تمام تفریحوں کو بے ہودگی کا نام دیتا تھا۔ اس کا تو یہ حال تھا کہ وہ جو لکڑی کی کھڑاووں نما جوتیاں ہوتی ہیں ناجن کو ما گیتا کہتے ہیں، وہ پہننے پر بھی اعتراض کرتا تھا۔ اچھا تو اب جا کر سمجھ میں آیا کہ اس کے خیال اور تصورات کی بنیاد کیا تھی۔ یہی ہان سن آف ولا صوفیانہ فلسفہ اور تصور حیات...... میں مچھر دانی میں گھس کر لیٹ گئی تو شن کیچی نے بجلی کے دو لیمپ بستر کے قریب لا کر رکھ دیئے۔ ارے بھئی میں دو لیمپوں کا کیا کروں گی۔'' ''ایک لیمپ بڑا اور تیز روشنی والا ہے دوسرا مدھم اور چھوٹا ہے۔ آپ شام کا اخبار تو پڑھیں گی نا۔'' شن کیچی نے شام والے ضمیمے کا اکیلا صفحہ مچھر دانی کے اندر رکھ دیا۔ ''شکریہ مگر ایک ہی لیمپ کافی تھا۔ ہاں سنو تمہارے پاس خواب آور گولیاں تو ہوں گی۔ میں ہمیشہ سوتے وقت یہ گولیاں لیتی ہوں۔''

''نہیں! ہم تو خواب آور گولیاں استعمال نہیں کرتے۔ آپ ایسا کریں انڈے کے ساتھ ساکی پی لیں۔''

''اچھا تو پھر اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں تو سو ہی نہیں سکتی۔ ایسی کسی چیز کے بغیر۔ چلو انڈا اور ساکی ہی سہی۔ سن کیچی اپنی بیوی کے ساتھ باورچی خانے میں چلا گیا جہاں سے انڈا اچھنٹنے اور کھڑ پٹر کی آوازیں آتی رہیں۔ کچھ دیر بعد اس کی گدبدی بیوی نے انڈے اور شراب کا پیالہ لا کر پکڑا دیا اور ہنسنے لگی۔ بڑے سفید پیالے میں گرم ساکی اور کچا انڈا الگ الگ نظر آ رہے تھے اور پھر ساکی کی سڑاندی، بساندی سی بو الگ آ رہی تھی۔ آدھی رات تک میری پلک بھی نہ جھپکی اور میں مسلسل جاگتی رہی۔ لیمپ میں نے بجھایا نہیں۔ تیز نیلے رنگ کی مچھر دانی کا پرانی ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ سے رنگ اڑ گیا تھا اور چرمرائی ہوئی جھول سی گئی تھی۔ اس میں ذرا بھی کلف نہ تھا۔ اور مچھر دانی کے خانوں میں کہیں کہیں پھنسے ہوئے سفید بال نظر آ رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا یہ بال کراتا کی والدہ کے تھے یعنی میری ساس کے جو عرصے تک میرے ساتھ رہی تھیں۔ گذشتہ سال ان کا انتقال اسی گھر میں ہوا تھا۔ یقیناً یہ ان ہی کے بال تھے۔ لیکن اب اس وقت ذہن کی خوش فہمی نے یہ تصور کر لیا کہ یہ کراتا کے اپنے بال ہیں۔

میں نے بتی بجھا دی تو محسوس ہوا کہ پو پھٹ رہی ہے۔ اور صبح صادق نمودار ہو رہی ہے۔ میں نے کمبل آنکھوں تک کھینچ لیا۔ جیسے ہی نیند کا غلبہ محسوس ہونے لگتا اسی وقت یاد یں انگڑائی لے

کر بیدار ہونے لگتیں۔ آج سے سات سال پہلے میں ہیروشیما کے شہر سے بھاگی تھی۔ ہیروشیما جواب آتش ہو چکا ہے۔ اور وہاں سے بھاگ کر میں نے ایک پہاڑی گاؤں کے گھر میں پناہ لی تھی۔ وہاں ایک آدمی مستقل سڑکوں پر پھرا کرتا تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا۔ ایک دن میں نے دوسری منزل کے جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر اس کو بغور دیکھا۔ وہ چاروں طرف بے تابی سے گھوم گھوم کر بڑے یقین اور مستقل مزاجی سے افواہ پھیلاتا ہوتا تھا۔ ''میں نے یہ بات سنی ہے کہ ہر وہ شخص جو اس وقت ہیروشیما کے شہر میں موجود تھا مر جائے گا۔'' یہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا اور وہاں کا بڑا رئیس تھا اور ایک سال قبل ہی ہیروشیما سے یہاں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بمباری والے دن اس نے ہیروشیما کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو کچھ بھی بڑبڑاتا تھا، اس کی تردید کرنے کے لئے کسی کے بھی پاس کوئی بنیاد نہ تھی۔ اور آج تک بھی ایسا کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا کہ اسی کی بات کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر اس پر مٹی ڈالی جا سکے۔

اب میرے اوپر جو نیند کا غلبہ ہونے لگا اور میں نے سونے کی کوشش کی تو ایک موہوم سا سفید بڑا سا ہاتھ آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ یہ ہاتھ ہی تو تھا جو مجھے ہمہ وقت پریشان رکھتا تھا۔ یہ اس شخص کا ہاتھ تھا جس نے ایٹم بم چھوڑا تھا۔ یہی تو وہ ہاتھ تھا جس نے ایک بٹن دبایا اور سوئچ کو کھینچا اور جس کے کھینچتے ہی دنیا کا پہلا ایٹم بم کسی بستی پر گرا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر وہ پائلٹ، ہواباز بھی ہوگا جو اس کو اڑا کر یہاں لایا ہوگا۔ اور پھر وہ افسر جس کے حکم پر یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن اس افسر پر بھی تو کسی کا حکم چلتا تھا۔ سیاست دانوں، سرمایہ داروں اور سائنس دانوں کا۔ بہرکیف میں ایک مرتبہ وہ چہرہ دیکھنا چاہتی تھی جو اس ہاتھ کا مالک تھا جس نے فی الواقع وہ ایٹم بم گرایا تھا۔ اب میں اس کی نگاہوں سے اپنے ایک سوال کا جواب چاہتی تھی کہ اب اپنے ملک اور اپنے گھر میں وہ جب شراب نوشی کرتا اور جام پر جام چڑھاتا ہوگا تو کیا وہ شراب اس کو موت سے زیادہ کڑوی کسیلی نہیں لگتی ہوگی۔ اور پھر اس شخص کی روح سے سوال کروں گی جس نے اپنے سفید ہاتھوں سے وہ بٹن دبایا تھا کہ کیا اس کے بعد بھی تمہیں چین سے جینا ملا؟ اور اب کیا تم بالکل مطمئن زندگی گذارتے ہو؟ اسی سفید ہاتھ کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھ اس وقت لگی جب سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا

ہیروشیما میں میرا قیام چند دنوں کے لئے اور بڑھ گیا، اب جولائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس دوران میں نے اقدام خودکشی اور انسانی قتل جیسے خیالات سے کافی نجات حاصل کر لی تھی۔ مجھے

لگتا ہے کہ ان دنوں میں نے ان خطوط پر سوچنا شروع کیا تھا کہ مجھے مرنا نہیں چاہئے۔ مجھے زندہ رہنا چاہئے۔ برسات کا موسم ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ بیٹھے بٹھائے اچانک ہی طوفان بادوباراں شروع ہوجاتا۔ ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگتے۔ ہوا چلنے سے پہلے بارش ہونے لگتی۔ پھر ہوا کے جھکڑ چل پڑتے۔ وہ رکتے تو پھر بارش شروع ہوجاتی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ تیکو کی بڑی بارش میں بھیگتی گھر آئی اس کے ہاتھ میں ایک نئی کونپلوں والی شاخ تھی۔ بانس کی ہر بھری پتیاں گویا پانی میں بھیگ کر جی اٹھی تھیں اور ہلکی ہلکی سانسیں لے رہی تھی۔

''خالہ......خالہ یہ سات تاریخ کی رات کو کیا تیوہار ہوتا ہے؟''

''بھئی وہ ایک ستارہ جو گڈریا کہلاتا ہے ایک رات دوسرے ستارے جولاہن سے ملتا ہے۔ یہ دونوں ستارے سات جولائی کی شب ایک ساتھ ہی ایک برج میں داخل ہوتے ہیں اور پھر ساتھ ہی آسمان کے دودھیا سمندر کے، جسے کہکشاں کہتے ہیں، پار اترتے ہیں، پورے ایک سال بعد ہر سال جولائی کی ساتویں شب یہ موقع آتا ہے۔''

''اچھا تو یہ کل رات ہوگا؟''

''اچھا تو یہ بات ہے اسی لئے تم یہ بانس کی ڈالی لائی ہو؟''

''اور ہاں خالہ مجھے امی کے ساتھ جاکر تیوہار کے لئے سجاوٹ اور آرائش کا سامان بھی تو خریدنا ہے۔ سارے لوگ جارہے ہیں۔''

تیکو دونوں بچیوں کو لے کر آرائش کا سامان خریدنے چلی گئی۔ میری والدہ جو اس سے پہلے دوپہر میں کبھی نہیں سوتی تھیں۔ آج خلاف معمولی چھ چٹائیوں کے فرش والے تتامی کے فرش پر ایک گوشے میں لیٹ کر سوگئی تھیں۔ دراصل رات بھر تو وہ بیٹھی کیچوؤں سے نجات پانے میں لگی رہتی تھیں۔ جوں جوں رات بڑھتی تھی کیچوؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہتا اور اماں تھیں کہ تیکو کو مجھے اور اپنی دونوں نواسیوں کو کیچوؤں کے آشوب سے محفوظ رکھنے کی تدابیر کرتی رہتی تھیں۔ اس طرح رات آنکھوں میں کاٹ دیتی تھیں۔ اور دن کے وقت ان کی یلغار کم ہوجاتی تو تھوڑی دیر کو کمر ٹکاتیں اور تھوڑی بہت نیند پوری کرلیا کرتی تھیں۔ میں بھی وہیں اماں کے قدموں کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ ابھی میری آنکھ ہی لگی تھی کہ تیکو اور بچیاں ہنستی شور مچاتی اور اپنی لکڑی والی کھڑاؤں نما جوتیاں کھڑ کھڑ کرتی واپس آپہنچیں۔

''بھئی میں نے تو اسی ین والی جھنڈیوں اور آرائش کا سیٹ لے لیا۔ اس نے کہا کہ وہ اس

کی قیمت میں کمی کردے گا اب یہ ساٹھ ین میں پڑی ہیں۔''

تیکو نے مجھے اور اماں دونوں ہی کو اٹھا بٹھایا۔ اور سات جولائی کے جشن کی جھنڈیاں اور آرائشی کاغذ یہاں سے وہاں تک پھیلا دیئے۔ تیز بسنتی اور زرد، سرخ اور ارغوانی کاغذ کے چوکور ٹکڑے روپہلے ہنیرے، شیکیشی کے مربع کارڈ پتلے پتلے تزاکو اور گلابی کاغذی ناویں۔ کاغذ سے کاٹے ہوئے ایک پلانٹ (چھوٹے چھوٹے سفید بیگن) اور تونبے، تونبیاں، گول اور تکونی شکلوں کی کاغذی قندیلیں، اور کاغذی غبارے، اور تو اور تیکو اور بچیوں کے ساتھ اماں بھی قندیلوں اور غباروں میں ہوا بھر بھر کے ان کو پھلانے بیٹھ گئیں۔ میں چپ چاپ بیٹھی ایک بعد ایک پھلائے ہوئے غباروں اور قندیلوں کو دیکھتی رہی۔ پھر دوبارہ لیٹ گئی۔

ارے یہ رہی کہکشاں اس نے ایک گلابی اور نیلی پٹی کو آہستگی سے کھینچتے ہوئے بچیوں کو دکھایا جو اس کے ہاتھ پر پھیل گئی تھی۔ اچھا اب ہم اس میں سنہرے روپہلے کاغذ کی جھالر سی کاٹ کر لگا دیں اور ان پر کچھ لکھتے بھی ہیں جو یہ روپہلی سنہری پٹیاں ہیں ''اب پتہ ہم کیا لکھیں گے''

اماں نے بڑی بچی کی بات کے جواب میں کہا، ان پر اپنی خواہشیں اور آرزوئیں لکھی جاتی ہیں اور نظمیں بھی لکھتے ہیں۔

میری ایک دوست کے گھر تو یہ آرائش لگائی بھی جا چکی ہے۔ اس نے پتہ ہے ان پر کیا لکھا ہے؟ اس نے لکھا ہے امی! ابو۔

''باجی آپ بتائیں ہم اپنی سنہری روپہلی پٹیوں پر کیا لکھیں؟''

''بھئی ہم تو جب چھوٹے تھے تو دادی جان مختلف رنگوں کے کپڑوں کی پٹیاں اور چوکور ٹکڑے کاٹ لیا کرتی تھیں۔ ان دنوں ہمارے ملک میں رنگین کاغذ بالکل نہیں ہوتے تھے۔ اور نہ ہی شیکیشی کی وضع کے چوکور کارڈ ہوتے تھے۔ بس انہیں کپڑوں سے کٹی ہوئی پٹیوں اور ٹکڑوں پر لکھا جاتا تھا۔ پتہ نہیں کیا کیا لکھتی ہوں گی۔ بات یہ ہے کہ مجھے سات جولائی والے تیوہار کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں معلوم۔

مجھے بڑی نیند آ رہی تھی۔

''بھئی لکھنا کیا ہے جو تمہاری دلی خواہش ہو وہی لکھ دو۔'' اماں نے کہا۔

تیکو سے اماں کو یہ کہتے سنتے ہی میں فوراً بول پڑی۔

''ارے تم جنگ کے خلاف لکھ دو یا پھر ایسی ہی کوئی بات۔'' اتنا کہتے کہتے میں غافل ہو کر

سوگئی ۔اور جب سو کر اٹھی تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہرے ہرے بانسوں سے لٹکتی ہوئی رنگ برنگی پٹیاں اور جھالیں، قندیلیں، لاتعداد سنہری روپہلی ستاری گلابی گلابی خزانہ کشتیاں اور غبارے آویزاں تھے۔ان تمام آرائشی چیزوں کو دھات کے ہکوں اور پھندوں سے بانس کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔تین چٹائیوں والے کمرے میں نیلی اور گلابی کہکشاں لہر رہی تھی۔جس کو بانس کے اوپری سرے سے باندھا ہوا تھا وہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں کو لہرا رہی تھی۔

''واہ کتنا پیارا لگ رہا ہے آج تو گھر مکمل طور پر آراستہ ہے۔'' میں نے اس انداز میں کہا گویا رنگا رنگی آرائش نے آنکھوں کو طراوٹ دے دی ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ قدیم زراعتی جنتری کے حساب سے سات جولائی کسی اور ہی موسم میں منائی جاتی تھی اور اس تیوہار کا اصل مطلب اور مفہوم ہی یہی ہے کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے دونوں ستاروں جولاہن ارو چرواہے کو ایک ساتھ کہکشاں میں داخل ہوتا دیکھ لیں ورنہ تو اس تیوہار کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس دن کی سجاوٹ نظر نواز جدھر نظر اٹھاؤ اوپر سے نیچے تک رنگوں کی ایک ندی تھی جو اوپر سے نیچے کو چلی آتی تھی۔یہی دیکھتے دیکھتے کسی المیہ شعر کا شائبہ سا محسوس کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ کاغذ کی پتلی پتلی چٹوں اور ٹیپوں پر لکھا

''جنگ مردہ باد...... کہکشاں

یہ وہ الفاظ تھے جو تیکو نے نیلے، گلابی، سرخ، زرد اور ارغوانی تنزاکو شیکیشی اور چٹوں پر لکھے تھے۔

''تم کچھ اور مناسب بات نہیں لکھ سکتی تھیں کیا۔ یہ سب تو مجھے جنگ کے خلاف نظر آ رہا۔ مفہوم تو ہے نہیں کوئی۔''

''ارے بھئی یہ بچیاں اتنا شور مچا رہی تھیں کہ میں بدحواس ہوگئی۔اور پھر یہ کہ مجھے کچھ اور سوجھا بھی نہ تھا۔بس یہ ہی لکھ دیا۔''

''باجی آپ کیوں نہیں لکھ دیتیں کچھ۔''

اس کی بات میرے دل کو لگ گئی۔ میں نے پتھر کے قلمدان میں سے قلم اٹھالیا جو تیکو کے پاس ہی رکھا تھا۔ میں نے زرد اور ہلکے گلابی تنزاکو کی ٹیپوں پر لکھنا شروع کیا۔ایک پر لکھا امن، اور دوسری پر آزادی حریت اور ایک پر محبت کے ستارو ہماری شانتی اور امن کو تحفظ دو۔ پھر اس طرح لکھتی گئی ہم نے اس کو بنس کی ٹہنیوں کے ساتھ ڈوری سے باندھ دیا۔شام تک میں نے اور

تیکو نے ڈھیر ساری پٹیوں اور تنزا کوؤں پر خلوص، جرات اور ستاروں ہماری شانتی کو تحفظ دو، لکھ لکھ کر بانس کی ٹہنیوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ اس تمام سجاوٹ اور آرائش کے بعد سات جولائی کی رات بھی کیچوے رینگتے رینگتے آرائشی بانس کے آس پاس پہنچے اور رینگ رینگ کر اس پر چڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور اماں نے وہی نا قابل استعمال چوپس اسٹکس سنبھال لیں جن سے پکڑ پکڑ کو وہ ان کو نمک کے پانی میں ڈالتی رہیں۔ کوئی کچھ بھی کہے میں تو اس وقت یہی سوچ رہی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کیچوے ان فوجی سپاہیوں کے آسیب اور روحیں ہوں، جو پریڈ گراؤنڈ میں مر گئے تھے۔

اماں نے تھک کر نمکین پانی کا ڈبہ اور چاپ اسٹکس ایک طرف رکھ دیں اور بلا تمہید ہی کہنا شروع کر دیا۔

''اب جو دوسری بار لڑائی ہوگی تو ہم سب بھاگ کر میانو کے پاس چلے جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ میں نے سنا ہے اب پھر بہت بڑی جنگ ہونے والی ہے۔''

میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ ایک عجیب سا کرب میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ کتنے دکھ کی بات تھی کہ میری چوہتر سال کی بوڑھی ماں کو ایک اور لڑائی کا غم کھائے جا رہا ہے اور وہ اس کی ہولنا کیوں سے فرار کے بارے میں سوچ رہی ہے۔

''اماں اب میانو کے پاس جانے کا نہ سوچئے۔ اب دنیا میں کبھی عالمی جنگ نہ ہوگی۔''

''واقعی کیا اب کبھی جنگ نہیں ہوگی۔''

''نہیں اگر کچھ لوگ چاہیں تو پھر بھی نہیں ہو سکے گی۔''

میری بہن جو سات جولائی کے آرائشی سامان کے تلے بیٹھی تھی۔ بڑی افسردگی اور فکرمندی سے بولی ''اگر بارش بند بھی ہو جاتی ہے اور مطلع صاف ہو بھی جاتا ہے تو بھی میرا خیال ہے کہ میں یہ خوبصورت سجا سجایا بانس لے کر باہر نہ نکل سکوں گی۔ بات یہ ہے کہ میں اب نروس ہو رہی ہوں کہ ہم نے اپنی تنزا کو پر جس قسم کی باتیں لکھی ہیں وہ دوسروں سے بالکل مختلف لگیں گی۔ اگلے دن شام تک مطلع صاف ہو گیا۔ جنوب مغربی آسمان پر شفاف نیلا رنگ پھیلا ہوا تھا۔ تیکو اپنے بچوں کے ساتھ گلی گلی کوچے کوچے پھرتی رہی۔ جہاں ہزاروں سینکڑوں لوگوں کے سوختہ اور آتش زدہ گھر مل کر ایک قصبہ اور بڑی بستی بن گئے تھے۔ گھوم پھر کر تیکو ہانپتی ہوئی واپس آئی اور کہنے لگی

''باجی! ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے!''

''کیا مطلب! کیا ٹھیک ہے؟''

''ارے ہر طرف! یہاں وہاں ہر جگہ میں نے یہی کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے۔ چلو پھر ہم، بھی اپنا والا لے کر چلتے ہیں۔ با جی چلو نا تم بھی اٹھو نا۔''

میں پیر میں کوما گیتا ڈالتی ہوئی تیکو کے ساتھ چل پڑی۔ ہر سو جلے ہوئے خراب وخستہ گھروں کی قطاروں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ اور تیکو کا گھر بھی اسی صف میں شامل تھا۔ یہ انوکھی سی بھیڑ تھی۔ لوگوں کا عجیب وغریب اجتماع تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایٹم بم کی ہلاکتوں کا مزا چکھنے کے بعد بھی جی بچے تھے۔ اور وہ لوگ جو محاذ پر سے واپس آئے تھے۔ اور اب یہاں آباد تھے۔ اور ان خستہ حال گھروں کے درمیان میں جو خالی قطعات اور کچی گلیاں تھیں وہاں سبزیاں اگ رہی تھیں۔ اور موسم گرما کے پھول کھل رہے تھے۔ اور یہاں وہاں گھروں کی اولتیوں اور چھجوں سے عقبی کوچوں کے ساتھ سات جولائی والے سبز بانس جھنڈیوں، ٹیپوں اور ستاروں سے آراستہ کھڑے نظر آتے تھے۔ شاید ان سبھوں نے ایک ہی اسٹور سے خریداری کی تھی۔ وہی گلابی خزانہ کشتیاں، وہی روپہلے سنہرے گول اور چوکور غبارے اور ویسی ہی قندیلیں ہوا کے جھونکوں سے ادھر ادھر لہراتی ہوئی بالکل وہی تیکو کے کنبے والا رنگ برنگی تنزاکو چند چوکور بغیر کاٹے ہوئے۔ کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے نعرے۔ کسی پر لکھا تھا ''جنگ کے خلاف'' کسی پر امن، حریت آزادی۔ ایک بچے کی لکھائی میں تحریر تھا۔ ''ابا'' دوسرے پر ''اماں'' ایک تنزاکو پر کہکشاں تحریر تھا۔ کسی پر جشن (تانابانا) لکھا ہوا تھا۔ ایک گھر پر چسپاں زرد کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔

پتھر نیز دور افتادہ اور بعید دن کا

کندہ کیا ہوا کتبہ

ریت پر پڑتے ہوئے سائے

اس کاغذ پر لکھی ہوئی یہ نظم شاعر کی قبر کے کتبہ پر کندہ تھی۔ اور وہ اسی شہر کا باسی تھا جس نے خودکشی کر لی تھی اور اب وہ کاغذ بانس کی سبز پتیوں کی ڈنڈی سے بندھا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر اس گھر کے سامنے خاموش کھڑی رہی۔ اگرچہ ہر شخص کے ذاتی تجربات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے اس وقت عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے ان خراب وخستہ مکانوں کے درمیان گلیاروں میں بے شمار دلوں کی دھڑکنوں کی ایک رو اور موج ہے۔ جو یکساں طور پر ایک ہی سمت کو بہتی چلی جاتی ہے۔ چار یا پانچ مکانوں کے بعد ایک تنزاکو پر لکھا ہوا تھا۔

آہ! محبت! اور یگانگت کے ستارو

پھر بے شمار غباروں کے درمیاں سے جھانکتا ہوا ایک غبارہ تھا جو بہت باریک زنجیر سے اٹکا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف سنہری روپہلے، نیلے اور سرخ ستارے جھلملاتے تھے اور اس پر فقط ایک لفظ تحریر تھا ''امن'' سات جولائی 1951ء کا دن ڈھل رہا تھا۔ اور شام کے سائے جھک آئے۔

ساتا اینیکو

یاد ایک شب رفتہ کی

یہ انیس سو اکیاون کی گرما کی بات ہے جو دوران سفر پیش آئی۔ اور اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ ایسے تو بے شمار خیال دوران سفر اور لوگوں کے ذہن میں آتے ہوں گے۔ اب اس کو خیال کیا کہنا بس ایک تجربہ ہی کہیئے جو اسے اپنے سفر کے دوران حاصل ہوا۔ اس بات کا تعلق پارٹی سے ہے۔ ہاں میرا مطلب یقیناً کمیونسٹ پارٹی ہی ہے وہ پارٹی کی باقاعدہ رکن تھی بلکہ بزعم خویش وہ اسی کا ایک حصہ تھی۔ اور اس پر مستزاد یہ اس کا اہل قلم ہونا بھی تھا۔

موسم گرما میں اس کو مزدوروں کی ایک انجمن کی طرف سے بلاوا ملا تھا کہ گرما کی ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں اس کو ایک ٹی پر فیکچر فیکٹری میں جا کر لیکچر دینا تھا اور وہ اسی سلسلے میں ٹوکیو جا رہی تھی۔ یونین والوں کی ہدایت کے مطابق اس کو دریائے جاپان کے ساحلی سرے سے ریل پکڑنا اور آگے جا کر بدلنا تھی۔ اسی پلیٹ فارم پر دوسری آگے جانے والی ٹرین بالکل تیار کھڑی تھی۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے یہ فرض کر لیا کہ یہی وہ گاڑی ہے جو اس کو منزل مقصود تک پہنچائے گی۔ یہ پیسنجر ٹرین تھی۔ ہر اسٹیشن پر رکتی اور مسافروں کو اتارتی چڑھاتی ہوئی سفر جاری رکھتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کے اردگرد کی سیٹیں مسافروں سے خالی ہوتی گئیں۔ گاڑی کو چھوٹے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گذر چکے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ وقت ہو چکا تھا لیکن ابھی تک ریلوے لائن کے ساتھ چلنے والے متوقع منظر کے سوا اور کوئی آثار نظر نہ آ رہے تھے۔ اور اب وہ کچھ مشتبہ نظروں سے علاقے پر نگاہ ڈال رہی تھی اس لئے کہ اس کا تو خیال تھا کہ کھڑکی سے باہر نظر ڈالے گی تو سفید جھاگ سا مواج سمندر نظر آئے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ابھی تک ٹرین ساحل کے

قریب سے بھی نہ گذری تھی۔ ضرور کچھ گڑبڑ تھی۔ نیل جیسے گہرے نیلے رنگ کے سوتی بلاؤز اور آنکھوں پر چشمہ والی ادھیڑ عمر خاتون ان تمام مسافروں سے منفرد نظر آ رہی تھی جو ہر اسٹیشن پر چڑھ اور اتر رہے تھے۔ خیال سے پیدا ہونے والی بے چینی اور اضطراب کے سبب وہ اب تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ جیسے کوئی نا آشنا اجنبی ہو۔ کچھ دیر تک بوکھلانے کے بعد اس نے پریشانی کے عالم میں یونین کی طرف سے آنے والے خط کو کھول کر دیکھا کہ آیا وہ ان کے بتائے ہوئے راستہ ہی کے مطابق سفر کر رہی ہے۔ یہ ایک کاروباری خط کی کاربن کاپی تھا۔ اور جیسا کہ ایسے خطوط کا طریقہ ہوتا ہے کہ مقررہ اوقات کے مطابق چلنے والی گاڑیوں کے روٹ اور اوقات واضح طور پر دیئے ہوتے ہیں۔ اس خط میں اسی طرح درج تھا اور اس نے اسی کے مطابق گاڑی پکڑی تھی۔ لیکن خط کے اندراجات کو گھور گھور کر دیکھنے پر اس نے ایک غلطی پکڑ ہی لی تھی۔ اس نے گاڑی ناگا ساکی کے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لکھے ہوئے اسٹیشن کا نام دیکھ کر پکڑی تھی۔ لیکن ہوا یہ تھا کہ اسٹیشن کے نام کا ایک حرف اس نام سے مختلف تھا جو اصل میں اس کی منزل مقصود تھی اور جہاں سے اسے ریل پکڑنا تھی۔ اس نے عجلت میں جس جگہ سے یہ گاڑی پکڑی وہ وہاں سے بالکل ہی مختلف سمت کو جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ریل کو ساحل سمندر تک نہ پہنچنا تھا نہ پہنچی۔

اگلے پڑاؤ پر وہ عجلت سے اتر پڑی۔ یہ ایک چھوٹا سا سنسان اسٹیشن تھا۔ اس نے ٹکٹ کے گیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان سے اپنی پریشانی اور غلطی بیان کی۔ پہلے تو وہ عدم توجہی سے اس کی بات سنتا اور دوسرے مسافروں کو گذارتا رہا۔ پھر اس نے فرصت سے ایک گہری سانس لی۔ اس انداز سے کہ کوئی بھاری نقصان ہو گیا ہو۔ اس نے بتایا کہ آج اب کوئی اور گاڑی اس طرف نہیں جا رہی ہے جو اس کی منزل تک پہنچا سکے۔ اب صرف ایک ہی صورت کہ آپ واپس ناگا ساکی اسٹیشن چلی جائیں اور وہاں سے اگلی صبح پہلی گاڑی پکڑ لیں۔'' خوش قسمتی سے اس شام وہ کسی پروگرام میں شامل نہ تھی۔ بہر حال اب کوئی اور راستہ بھی تو نہ تھا۔ بجز اس کے وہ واپس ناگا ساکی چلی جائے۔ ناگا ساکی جانے والی ٹرین کے لئے تقریباً پچاس منٹ انتظار کرنا تھا۔ ابھی دن نہیں ڈھلا تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ یہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہ تھی کہ اسٹیشن سے باہر جا کر گھوم پھر ہی آئے۔ اسٹیشن کے عین مقابل ایک نیچی سی پہاڑی نظارے کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ البتہ پگڈنڈیوں کے اس طرف ایک فارم نظر آ رہا تھا جو سورج کی الوداعی کرنوں میں نہایا ہوا ایک دم پیلا نظر آتا تھا۔ ہوا کچھ اسی طرح رکی ہوئی تھی جیسے فضا اور ماحول دم بخود ہو گیا ہو۔ فطرتاً وہ

خاموشی اور صبر سے کسی بھی چیز کا انتظار کرنے کی عادی تھی۔ اس لئے بڑے اطمینان سے وقت گذار سکتی تھی۔ اس کو کسی قسم کی گھبراہٹ نہ تھی۔ البتہ ایک بات ضرور تھی کہ اس کو اس خیال سے شرمندگی ہوئی کہ وہ اپنی ہی غلطی سے غلط جگہ پہنچ گئی ہے۔ یعنی ایسی جگہ جس سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت دور افتادہ مقام پر پہنچ گئی ہے۔ خیر پھر بھی یہ اطمینان تھا کہ صرف تین گھنٹے ہی کی تو بات ہے اتنی دیر میں وہ ناگاساکی شہر پہنچ جائے گی۔ وہاں وہ ایک کنبہ سے واقف تھی جو اسٹیشن کے بالکل قریب ہی رہتا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ رات ان کے گھر گذار لے یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اسٹیشن کے سامنے جو سرائے تھی، رات بھر کے لئے وہاں ٹھیر جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ ناگاساکی کی ٹرین پر سوار ہوگئی اور اس وقت بھی وہ سرائے کے قیام کے بارے ہی میں سوچتی رہی۔

گاڑی ناگاساکی پہنچی تو تقریباً رات ہو رہی تھی۔ اس کو شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بلا ارادہ ہی اتنا وقت ضائع کر دیا۔ اس کے علاوہ وہاں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ باوجود اس کے کہ ناگاساکی اچھا خاصا بڑا شہر تھا، لیکن اسٹیشن کے سامنے والا علاقہ روایتی اور بے رونق سا تھا۔ یہاں سیاحوں کی آمد و رفت کی رونق اور گہما گہمی نظر نہ آتی تھی۔ شہر کا مرکزی حصہ تنگ سے چوک کے بہت آگے تھا جہاں قطار در قطار دکانیں نظر آتی تھیں۔ اس نے اسٹیشن کے آگے کھڑے ہو کر دیکھا تو چوک کے داہنی طرف سرائے نظر آئی یہ بہت معقول جگہ تھی۔ اور اس سے کچھ اور آگے ایک معمولی سا مسافر خانہ بھی تھا۔

''ارے ایک رات ہی تو بسر کرنی ہے کہیں بھی گذاری جاسکتی ہے۔'' لیکن اگر وہ اس سڑک پر تھوڑی دور چلے جو عموداً اسٹیشن کے رخ سے آگے گذرتی تھی جو وہ دو مرتبہ یہاں آئی تو انہی کے گھر ٹھہری تھی۔ ہوسکتا ہے اس مرتبہ اس کا قیام گھر والوں کے لئے زحمت کا باعث ہو۔ تو کیا وہ میاں بیوی ٹھیرانے سے انکار کر دیں گے۔ دراصل انکار کا نہ تو یقین تھا نہ ہی اتنا خیال تھا۔ البتہ ان کی زحمت کے خیال سے ہچکچا رہی تھی۔ دراصل خاوند کی ملازمت تخفیف میں آگئی تھی۔ وہ محنت کش قسم کا شخص تھا اور بے حد سنجیدہ قسم کا انسان تھا۔ بیوی کا یہ تھا کہ تن و توش میں میاں سے زیادہ نظر آتی تھی۔ اور اس طرح اس کا ایک خاص رویہ اور انداز تھا۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس کا رویہ عام مروجہ نسوانی طور طریق سے مختلف تھا۔ یعنی وہ روایتی انداز میں مسکرا کر پیش آنے والی خاتون نہ تھی۔ بلکہ بڑی دوٹوک اور کاروباری مزاج کی خاتون تھی۔ اس کی عقل اور فراست عام

غیب محنت کشوں جیسی نہ تھی بلکہ جن سے اس کا معاملہ پڑتا وہ اندازہ بھی نہ کر سکتے تھے وہ ایک معمولی سخت کوش طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ان کے پانچ بچے تھے۔ بڑی لڑکی نے اپنے بال بہت اونچے اونچے ترشوار کھے تھے۔ خاوند اور بیوی دونوں ہی پارٹی کے ممبر تھے باوجود مزاجوں کے اختلاف کے پورے گھر کا ماحول پارٹی کی فضا سے معمور تھا۔

پتہ نہیں ان کی سبزی کی دکان ابھی چل رہی ہے کہ نہیں۔ پچھلی مرتبہ جب وہ دوسری بار ان کے یہاں ٹھہری تھی تو وہ لوگ سبزیوں کے علاوہ خشک غذاؤں اور ڈبوں میں بند کھانے کا کاروبار بھی چلا رہے تھے۔ باپ اور ماں جب سبزیوں کی ریڑی نکال کر نکلتے تو بڑی لڑکی جو ان کی دست راست تھی۔ دکان پر بیٹھنے کے ساتھ ساتھ بھائی بہنوں کی دیکھ کر بھال بھی کرتی تھی۔ اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ لڑکی یہ دونوں کام کس صبر وسکون سے انجام دے رہی ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح کم گو اور خاموش تھی۔ اس کی آنکھیں اس کی لمبی لمبی پلکوں میں جھکی رہتی تھیں۔ اس لڑکی نے پارٹی کی روح اور ماحول کو بڑی خاموشی سے اپنے اندر جذب کیا تھا۔ اور وہ اسی روح اور جذبے کے تحت چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی لکھتی رہتی تھی۔

اس گھرانے کی یہی بات اس کو پسند تھی کہ دوسرے کسی گھر میں پارٹی سے رابطہ آہنگ کی یہ کیفیت اور صورت موجود نہ تھی۔ دوسروں کے یہاں بسا اوقات محسوس ہوتا تھا کہ وہ پارٹی سے مکمل طور پر اتفاق نہ رکھتے تھے۔ بات بات پر ناک بھوں چڑھانا اور اختلافات ان کا شعار تھا۔ اس لئے ان گھروں میں وہ اشتراک عمل اور خیال مفقود تھا جو اس گھر کا خاصہ تھا۔ شوہر کی بے روزگاری پانچ بچوں کی موجودگی میں معمولی بات نہ تھی۔ تاہم پورا کنبہ سخت کوش حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے والا تھا۔ اس طرح اگر ان کے طرز زیست میں کوئی جھول یا خرابی نظر بھی آتی تھی تو یہ محنت کشوں کی زندگی کا ایک فطری پہلو تھا۔

چنانچہ اس کو یقین تھا کہ بلاشبہ وہ اپنے سبزیوں کے کاروبار کے ساتھ ساتھ پارٹی کے ساتھ مکمل رابطہ وآہنگ بھی قائم کئے ہوئے ہوں گے۔ لہٰذا وہ یہ سوچنے کا خیال نہیں کر سکتی تھی گھر میں اس کی آمد ان پر گراں گذرے گی۔ اور پھر یہ کہ وہ دو مرتبہ ان کے یہاں ٹھہری تھی۔ اب وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اسی علاقے کی سرائے میں قیام کر کے چلی جائے اور ان کے گھر جھانکے بھی نہیں۔ کیوں بھئی یہ کیا حرکت ہوگی اور کیسی بات ہوگی؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور جواب میں اپنا سوٹ کیس سنبھال کر اس گھر کی طرف چل پڑی۔ جہاں محبت تھی، اعتماد اور

گرم جوشی تھی۔

............................(2)............................

اگر چہ شیشے کے دروازے نیم وا تھے۔تاہم دکان میں ابھی روشنیاں تھیں۔دروازے کے ساتھ والی سیڑھی پر وہ جھجکی ہوئی کھڑی تھی۔

''ارے!'' بیوی نے دھیرے سے گہری آواز میں کہا۔وہ اس کوغور سے دیکھ رہی تھی۔گویا اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔

''ارے مجھے تو یقین نہیں آرہا ہے۔خیر تو ہے؟''

''بھئی معاف کرنا۔بالکل ہی اچانک اور بےارادہ آنا پڑ گیا۔''

''ارے تو اندر آئیں نا۔بھئی ہمارا گھر تو بس ایسی الٹ پلٹ حالت میں رہتا ہے۔ایسا ہی الٹا سیدھا۔''

دکان اور باورچی خانے کو ملانے والا فرش کچا تھا۔اور اس کے سیڑھی تک نہ بنی ہوئی تھی۔اور پیسے کے حساب کتاب کا کھاتا بھی وہیں کھانے والے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔اس کے اندر داخل ہوتے ہی سارے بچے دوڑ پڑے اور اس کو گھیر لیا۔بڑی لڑکی باورچی خانے کے کچے فرش پر بیٹھی کچھ کر رہی تھی۔اس کو دیکھ دیکھ کر دھیرے سے مسکراتی ہوئی اس کے آگے جھک گئی۔وہ صدر دروازے کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور ان کو آج کے واقعہ کے بارے میں بتانے لگی جس کی وجہ سے وہ اس وقت یہاں ان کے پاس بیٹھی تھی۔

''بھئی معاف کرنا۔شاید یوں اس طرح ناوقت آجانا مناسب نہیں ہو۔لیکن مجھے یہ بھئی اچھا نہ لگا کہ میں نے تم لوگوں سے ملے بغیر ہی چلی جاؤں۔احساس ہے کہ میں نے تم لوگوں کو زحمت دی ہے۔کوئی بات نہیں۔تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی جاؤں گی۔آپ کو پتہ ہے نا آپ لوگ تو مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔پہچان لیا ہے کہ نہیں؟''

''ہاں۔ہاں'' لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس طرح آنے کا کیا مطلب ہے۔کیا وجہ ہے۔

وہ آنکھیں نیچی کیئے پیالوں میں چائے ڈال رہی تھی۔کہنے لگی ''دیکھیں۔ان کے باپ تو

مال لینے آج ہی گئی ہیں اور کل سے پہلے نہیں آئیں گے۔ لیکن خیر آپ اتنی دور سے آ گئی ہیں تو......''

اس کا دم گھٹ سا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی جھجکتے جھجکتے آئی تھی اوپر گھر والی کی بے اعتنائی بے رخی اور خشک رویئے سے اور بھی خفقان ہونے لگا۔ گھر والی مہمان سے زیادہ پارٹی کے بارے میں اشتیاق اور فکر کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی

''مجھے احساس ہے کہ میں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے آپ لوگوں کو ناحق تکلیف ہوئی۔ بس میں تو ملاقات کے خیال سے آ گئی ہوں۔''

''ارے یہ بات نہیں آپ ہمارے لئے کوئی غیر تو نہیں لیکن بات یہ ہے کہ ہمارے گھر کمیٹی کا ایک نوجوان ممبر ٹھہرا ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں وہ کیا سوچے اور کیا محسوس کرے۔ خیر اب اگر آپ آ ہی گئی ہیں تو اب میں بھی نہ کہوں گی کہ چلی جائیں۔''

جس وقت گھر والی اس بے رخی سے بات کر رہی تھی اسی وقت پڑوس کی ایک عورت صبح کے ناشتے کے لئے میسو پاستے لینے آ گئی۔ اور اس کے ساتھ ایک کنوارا نوجوان ڈبے میں محفوظ کھانا خریدنے آیا۔ لڑکی ان کو مطلوبہ سامان پکڑا تو رہی تھی مگر اس کے کان ہماری باتوں ہی کی طرف لگے تھے۔ وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کا انجام کیا نکلتا ہے۔ یہ بات کچے فرش پر اس کی چال ڈھال سے ہویدا تھی۔ وہ بہت مضطرب سی نظر آتی تھی۔

اس نے پھر کہا

''کوئی بات نہیں میں وہاں آپ لوگوں کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں گی۔ واقعی میں نے غلطی کی آ کر آپ لوگوں کو تکلیف ہوئی میرے ٹھہرنے سے۔ اچھا تو پھر میں چلتی ہوں۔'' اب اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کسی گھسے پٹے میلو ڈرامے کے مکالمے ہیں۔

قصہ یہ تھا کہ دونوں ہی سیدھی طرح اپنا مافی الضمیر ی ادا نہ کر پا رہی تھیں۔ وہ عورت تو جیسے کسی اندرونی خیال اور خدشے کو چھپانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ لیکن اس کا سبب آنے والی سے نفرت نہیں تھی۔ لیکن بات یہ تھی کہ وہ اس کنبے کے لئے ایک نرم گوشہ اور جذباتی تعلق اپنے اندر رکھتی تھی۔

گھر والی نے پھر کہنا شروع کیا۔

''یہ آپ کی محبت اور خیال ہے کہ آپ آئیں۔ مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے۔ لیکن...... خیر...... پھر بھی بعض وقت اس قسم کی باتیں میرے جیسے لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ آپ اس وقت رک کیوں نہیں جاتیں اور اگر کوئی خاص بات ہے تو سرائے تو یہاں سے بہت نزدیک ہے۔''

''ٹھیک ہے! پتہ نہیں کیوں وہاں ٹھہرنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔''

''نہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جب میرا گھر موجود ہے تو کہیں جانے کیا ضرورت ہے۔ کھانا کھالیا ہے؟''

''میرے پاس لنچ باکس تھا۔ وہ......''

''اچھا تو اب پھر چائے جو پی لیں۔ یاسوکو! اسٹور سے ذرا ایک سیب تو لاکر ان کے لئے چھیل دو۔''

ایسا لگتا تھا جیسے بڑی لڑکی کو اس بات سے بڑا سکون محسوس ہوا اور وہ جلدی سے کوئی جواب دیئے بغیر ہی پھل نکالنے چلی گئی۔

''اچھا پھر آپ آرام سے بیٹھیں۔ مجھے جا کر گاجریں دھونا ہیں۔''

''یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ دکان میں اضافہ ہو گیا ہے۔''

''بس آپ کو تو معلوم ہے اتنے بڑے کنبے میں گذارا کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے باپ پارٹی کے لئے اتنا زیادہ کام بھی نہیں کر سکتے۔''

''واقعی بہت مشکل ہی ہوتا ہوگا۔ میں سمجھتی ہوں۔''

''اور یہ بات میرے ساتھ بھی ہے عورتوں کی تنظیم کی بات چل رہی تھی۔ لیکن یہ کام زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا جارہا ہے۔ اب تحریک چلانا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ خیر میں تو اتنا کام بھی نہیں کر پاتی ہوں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتی ہی ہوں۔ وہ کھڑی ہو گئی اور باورچی خانے کی طرف جاتے جاتے پوچھنے لگی۔ کیا بتایا تھا آپ نے؟ کہاں جانا ہے آپ کو۔''

''میں ایک دھاگا بنانے والی فیکٹری میں مدعو ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ میرے لئے بھی ایک قیمتی تجربہ ہوگا۔ نوجوان دھاگا بنانے والوں سے مل کر اور ان سے بات چیت کر کے خود میری معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔''

''اچھا...... تو آپ بھی کافی مصروف رہتی ہیں۔ آپ نوجوان دھاگا بنانے والوں کو خوب

سمجھائیں اوران کی تربیت کریں۔''''نہیں بھئی میں توان میں سے ہوں جو یہ چاہیں گے کہ ان کی بات اور معلوم کریں کہ ان کی ضروریات اور خواہشات کیا ہیں۔ چنانچہ میں تو اس کی بات سننا پسند کروں گی۔''

''چلو پھر بھی وہ آپ کا لیکچر تو سنیں گے اور آپ کے علاوہ ٹوکیو سے آئے ہوئے دوسرے لوگوں کی تقریریں بھی۔ مقامی لوگوں پر ان باتوں کا بڑا اچھا اثر ہوتا ہے۔آپ پچھلی مرتبہ تو ثقافتی لیکچروں کے سلسلے میں آئی تھیں۔''

چونکہ گھر والی نے طے کرلیا تھا کہ وہ مہمان کو اپنے ہی گھر ٹھہرائے گی۔اور مہمان بھی اپنے قیام کے بارے میں مطمئن ہوگئی تھی تو وہ اب دونوں بڑی بے تکلفی اور یگانت سے سر جوڑے باتیں کرر ہی تھیں۔اب اس کے اندر کی بے چینی اور اضطراب ختم ہو چکا تھا۔اور وہ بڑی لڑکی کے چھیلے ہوئے سیب بچوں کے ساتھ مل کر کھار ہی تھی۔ پچھلی مرتبہ وہ آئی تھی تو سب سے چھوٹا والا گود میں تھا۔ وہ اب تقریباً تین یا چار سال کا تھا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پورے تین سال بعد ادھر آئی تھی۔لڑکا نہ باپ پر تھا نہ ہی ماں پر۔ وہ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ابھی اتنی باتیں تو نہیں کر پاتا تھا لیکن مہمان کی آمد پر اپنی خوشی کا اظہار اس کے چاروں طرف دوڑ دوڑ کر کر رہا تھا۔

''واقعی یہ بات بری ہے کہ میں بچوں کے لئے کوئی چیز بھی نہ لائی۔''اس نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ابلا ہوا آخری انڈا نکالا۔ وہ اس نے لے لیا۔اور بڑی حیرت سے اس کو دیکھا پھر اپنی دوسری منجھلی بہن کو دکھانے لگا جو کسی ابتدائی جماعت کی طالبہ تھی۔اور اس وقت اپنی کتاب گود میں رکھے بیٹھی تھی۔اس سے بڑی اس بہن نے انڈا اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کہنے لگی آؤ اسے ہم سب مل کر کھاتے ہیں۔ لاؤ میں اس کے قتلے کاٹ دوں۔ بڑا بھائی بھی جو پڑھنے میں مصروف انکھیوں سے انڈے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چھوٹا بچہ اپنی بونوں جیسی گول گول پیاری پیاری آنکھیں پھاڑے اپنی بہن کو انڈا چھیلتے دیکھ رہا تھا۔اس نے اپنے ہاتھوں سے ڈیسک کو پکڑ رکھا تھا۔اپنے ننھے ننھے پیر مسلسل زمین پر مار رہا تھا۔منجھلی لڑکی نے بڑی احتیاط سے انڈا چھیلا۔ پھر ایک چھری لا کر انڈے کے گول گول قتلے بنانے لگی۔کل چار قتلے بنے تھے۔اگلے اور پچھلے قتلوں میں زردی والا حصہ کم تھا۔ جو بھی ہو اب وہ اکیلا انڈا چار بچے کھا سکتے تھے۔

دیکھو میں نے قتلے کاٹ دیئے۔

بڑے بچے نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ان میں سے ہر بچے نے ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں

رکھ لیا۔ اور سب سے چھوٹا والا اپنی انگلیوں سے چمٹے ہوئے انڈے کے ذروں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی بڑا قیمتی خزانہ ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے۔ وہ کبھی انڈے کے ریزوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور کبھی مہمان کی طرف دیکھ کر۔ منجھلی لڑکی نے انڈے کا ٹکڑا منہ میں ڈال کر دوبارہ اسکول کی پڑھائی شروع کر دی۔ وہ بڑی مطمئن نظر آ رہی تھی کہ اس نے ایک واحد انڈا چار بچوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور کسی کو کوئی گلہ بھی نہ رہا تھا۔ ایک سیکنڈ کے اندر ہی وہ انڈا منہ ہی منہ میں گھل گیا۔ انڈے کی طرف سے مطمئن ہو کر بڑے بچے تو پڑھنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ البتہ چھوٹا ابھی تک مہمان کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اس کی پیٹھ کی طرف جا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے بازوؤں کے گرد اس طرح کر دیئے گویا وہ اس کے گلے میں حمائل کر کے اس کو اپنے ساتھ چمٹا لینا چاہتا ہو۔ تھوڑی دیر تو وہ ہچکچاتا اور جھجکتا رہا۔ گویا وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے ایسا کرنا چاہئے یا نہیں۔ پھر اس نے اس کی چہرے کی طرف تاکا اور مسکرا دیا۔ بڑی لڑکی اسٹور میں سجانے کے لئے ماں کے ساتھ بیٹھی گاجریں دھو رہی تھی۔ وہ گاہکوں کو بھی بنٹا رہی تھی۔ جیسے ہی کوئی گاہک آتا وہ اٹھ کر دکان میں چلی جاتی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ جناب بہت بہت شکریہ۔''

اگرچہ وہ بالکل اجڈ سی تھی لیکن گاہکوں کے سات نرمی اور اخلاق سے پیش آتی تھی اور ہر بار شکریئے کے الفاظ دہراتی......انڈے ان کے اسٹور میں بھی موجود تھے......اس کی ماں ابھی کچھ دیر پہلے عورتوں کو منظم کرنے کی بات کر رہی تھی۔ اور اب وہ گاجروں کی مٹی دھو دھو کر صاف کر رہی تھی۔ اس نے اپنی آستینیں الٹ لی تھیں۔ اور ران میں سے اس کے گول گول بازو نظر آ رہے تھے۔ گاجریں دھونے اور بیٹی کو دکان کے بارے میں ہدایتیں دیتے وہ آئے گئے کی موجودگی میں پارٹی کی مختلف میٹنگوں کے بارے میں بھی بتاتی جا رہی تھی۔

کیا اس کو اس طرح اپنے گھر ٹھہرانے پر لوگ اعتراض نہیں کریں گے؟ مہمان کو کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا آج ہی شام تک۔ تاہم وہ اس وقت یہاں اس کنبہ کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس لئے اس کو یہاں محبت اور اعتماد ملا اور خود بھی ان لوگوں سے محبت اور ان پر بھروسہ کرتی تھی۔ لیکن اس کا مطلب کیا تھا۔ یہی نہ کہ وہ بولنے کی جرات رکھتی تھی۔ اور اس کے یہاں اس وقت بیٹھنے کا مطلب یہی تھا کہ اس کو اس خاندان سے محبت تھی اور اس پر بھرپور اعتماد رکھتی تھی۔ اس بھروسے اور محبت کے بغیر اس کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ گھر اسے

خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ صرف کنبے کے رہنے ہی کے کام نہیں آتا تھا بلکہ پارٹی کے سرگرم کارکنوں کے لئے جائے قیام بھی تھا۔ اوراس طرح رفتہ رفتہ یہ پارٹی تحریکوں کا ایک مرکز بنتا جارہا تھا۔

اس کے اندر ایک عجیب سی خوف اور خوشی کی ملی جلی لہر تھی۔ جو اس وقت اس کے پورے جسم میں بجلی کی رو کی طرح اوپر سے نیچے تک دوڑ رہی تھی۔ اوراس احساس کے ساتھ وہ لمحات یاد آ گئے تھے۔ جسے ایسی ہی ایک رو نے اس کے پورے جسم کو جیسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ ٹوکیو کے مضافات میں تھی۔ اور رات خوب بھیگ گئی تھی۔ یہ علاقہ جہاں کھیت اور جنگلات ابھی باقی تھے، وہ جنگل کے کنارے کنارے سنسان سڑک پر سہمی جارہی تھی۔ سڑک سے آگے کچھ اپارٹمنٹ تھے۔ اور وہیں سے وہ ابھی ابھی نکل کر باہر آئی تھی لیکن باہر نکل آنے کے باوجود وہ اچھی طرح چلنے کے قابل نہ تھی۔ اور گرتی پڑتی سکڑی سکڑائی سڑک پر چلی جارہی تھی۔ اوراس کا سبب محض تھکاوٹ نہ تھی بلکہ وجہ دوسری تھی۔ دراصل جس اپارٹمنٹ سے وہ نکل کر باہر آئی تھی۔ وہاں ابھی بہت سے لوگ تھے۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ تقریباً تمام رات کے بحث مباحثہ کے بعد یہ طے پایا تھا کہ اس کو خفیہ کارروائیوں کے مرکز سے خارج کر دیا جائے۔ چنانچہ اس اخراج کے بعد وہ لڑکھڑاتی گھسٹتی سست قدموں سے چلی جارہی تھی۔ وہ اب گھر بھی واپس نہیں جاسکتی تھی۔ اور یہ جنگل کے متوازی سڑک ایسی ویران تھی کہ دن کے وقت بھی اکادکا راہگیر ہی چلتا نظر آتا تھا۔ تو اس وقت تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کسی راہگیر کے ادھر سے گذرنے کا۔ وہ چند اپارٹمنٹ بھی اندھیرے میں چھپ گئے۔ اور صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ رات کی تاریکی کے اس پہر میں کسی عورت کا یوں سنسان ویرانی سڑک پر ڈولنا بہت عجیب لگ رہا تھا۔ یہی سڑک اگر چلتی ہوتی اور بارونق ہوتی تب بھی ایک بات تھی۔ آخر اپریل کی سہانی سہانی نرم نرم ہوا کے چلنے والے جھونکوں کے ساتھ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو چلی آتی تھی۔

اچھا تو مجھے زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ندامت اور رنج کے اثر سے اس کے کندھے آگے کو جھول گئے تھے۔ یہ ایسا غم نہ تھا کہ جس کے سبب وہ رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ تاہم غم اور ملال ایک برقی رو کی طرح اس کے سینے کی گہرائی سے اٹھا اور وہ مکمل طور پر لرزہ براندام ہوگئی۔ اس روز میٹنگ میں خفیہ اڈے کے جو لوگ موجود تھے وہ ان سے واقف تھی اور گاہے گاہے ان سے ملتی رہی تھی۔ ان کے علاوہ ایک ایسا نوجوان کاشتکار بھی تھا جس سے وہ پہلے

کبھی نہیں ملی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور شخص خاص طور پر اس کی سزا کے سلسلے میں وہاں پر آیا ہوا تھا۔ اور وہ ان دو ضلعی ممبران سے پہلی مرتبہ ملی تھی۔ پارٹی سے اس کا اخراج ایک مخصوص فرقہ واریت کے تحت عمل میں آیا تھا۔ جوان دنوں عام تھی۔ تاہم اس کے معاملے میں توجہ اور سبب فقط ایک نظریاتی اختلاف تھا۔ اب معاملہ یہ تھا کہ محض ایک نظریاتی اختلاف کے تحت کسی کو پارٹی سے خارج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور اس اقدام کے لئے ماحول سازگار نہ تھا۔ ڈسٹرکٹ کمیٹی کے نوجوان ممبر نے گویا یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اس کو سزا دلوا کر رہے گا۔ اور یہ بات اس کے اس خبیث رویہ اور طرز اظہار سے عیاں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے خیالات کا انداز پوری چھان پھٹک کے بعد کرنے کے بعد اس کو سزا دی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ ''یہ تو قابل نفرت حد تک فرقہ واریت کی انتہا ہے اور علاوہ ازیں یہ بات بھی نظر انداز نہیں جا سکتی کہ وہ شخص ایک انتہائی گستاخ اور ڈھیٹ ناول نگار ہے۔ دراصل وہ بے حد ذاتی اور داخلی عصبیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اور اسی سبب سے وہ بہت زیادہ تند خوئی کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا زرد رو اوپر کو اٹھے ہوئے رخسار، اس نے اپنا ہاتھ اس کی جانب پھیلا کر اشارہ کرتے ہوئے اس کے بارے میں سخت اور نازیبا الفاظ کہنے کے لئے منہ کھولا تو کسی مرض کے باعث سیاہ ہو جانے والے منہ کے اندر سے اس کے ٹیڑھے میڑھے دانت نظر آنے لگے۔ اس نے اس کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ اور اس کے اس طرح دانت نکال کر ہنسنے پر جھڑکیاں بھی دیں۔ دراصل وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بارے میں یہ مباحثہ طول کھینچے اور اس کے علاوہ بات یہ تھی کہ وہ ان سب باتوں پر ناراض اور بے حد رنجیدہ تھی۔ لیکن کمیٹی کا وہ ممبر اپنی ناراضگی اور مخالف کو ہوا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اچانک ہی چلانا شروع کر دیا

''دیکھا، دیکھا وہ اب ہماری بات پر ہنس رہی ہے اور تمسخر اڑا رہی ہے۔'' پورے کمرے کی فضا دم بخود تھی۔ البتہ خفیہ اڈے کا نوجوان قائد ڈسٹرکٹ کمیٹی کے ممبر کی ہاں میں ہاں ملانے بیٹھ گیا اور چن چن کر اس کی تقصیریں اور کوتاہیاں بیان کرنے لگا تھا۔ مثلاً ایک بات یہ کہ وہ میٹنگوں میں بہت کم آتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ سیل کو مطلع کئے بغیر اس نے ادبی اجتماعات اور انجمنوں میں باقاعدہ شرکت شروع کر دی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب یہ تمام دلائل پھس پھسے اور بے بنیاد تھے۔ ان باتوں نے میٹنگ کی فضا مکدر کر دی تھی۔ دراصل تمام دلائل جو اس کے پارٹی سے اخراج کے حق میں دیئے جا رہے تھے، اس قسم کے فیصلہ اور اقدام کے لئے ناکافی تھے۔ حتیٰ کہ میٹنگ میں شریک ایک تاریخ دان نے مداخلت کرتے ہوئے ایک بہت واضح بات کی

''بھئی کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم یہ بات ثابت کر دیں کہ اس نے کچھ غبن وغیرہ کر دیا ہے۔ جو سزا کا جواز بن جائے۔''

یہ بات نہ صرف ہتک آمیز تھی بلکہ اتنی غیر متوقع تھی کہ سب دم بخود رہ گئے۔حتیٰ کہ کسی نے کسی سے سرگوشی بھی نہ کی۔ان بڑوں نے دو تین مرتبہ پارٹی ممبروں سے اپنے نقطہ نظر بیان کرنے کے لئے کہا۔مگر کوئی نہ بولا۔سب سر نیہوڑائے بیٹھے رہے۔اس کے بعد ڈسٹرکٹ کمیٹی کے ممبر نے دو تین بار ہر ممبر سے سے اظہار خیال کے لیے درخواست کی۔ بلکہ ان پر دباؤ ڈالا اور اس طرح جب وہ باری باری اٹھ کر اپنا ووٹ دینے کھڑے ہوئے تو یکا یک فیصلے کی مخالفت کرنے والوں کی تعداد گھٹنے لگی۔اس لئے کہ ان کی خاموشی اور عدم تعاون کے رویے پر ان کو لعنت ملامت کی جارہی تھی۔اور وہ سخت تنقید کا ہدف بن گئے تھے۔اخیر میں اس کے حق میں بولنے والے اور فیصلے کی مخالفت کرنے والے صرف تین لوگ رہ گئے۔اور یہ اس کے مقربین میں سے تھے۔غرضیکہ ووٹوں کی بھاری تعداد حاصل کر کے اس کو پارٹی سے نکال دیا گیا۔

''میں اس فیصلے کو تسلیم نہیں کر سکتی۔کبھی نہیں، قطعی نہیں۔''

اس کو اس فیصلے پر اپنے حق میں کچھ کہنے کا جو وقت ملنا تھا اس میں خود ڈسٹرکٹ کمیٹی کے ممبر نے بولنا شروع کر دیا اور ممبران کے سامنے اس کو بے نقاب کرنے کے لئے پورا زور لگا دیا لیکن وہ بھی اس کو گستاخ، ڈھیٹ اور فرقہ واریت کی حد تک مذہبی ثابت کرنے میں ناکام رہی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تمام کارروائی کو حیرانی سے دیکھتی رہی۔اس کے اندر بس ایک ہی احساس کارفرما تھا کہ اسے اس قسم کی حماقتوں سے دل کی گہرائیوں سے نفرت تھی۔بس پورے مناظرے اور مباحثے کے آخر میں اس نے ایک ہی بات کہی کہ

''میں نے اس فیصلے کو قبول کیا ہے اور نہ کر سکتی ہوں۔''

''خیر'' ڈسٹرکٹ کمیٹی کے ممبر نے حقارت سے کہا۔آپ اپنا معاملہ جنرل میٹنگ کے سامنے رکھ سکتی ہیں۔''

چنانچہ اس کو بیک بنی اور دو گوش فوری طور پر پارٹی سے نکال باہر کئے جانے کا حکم صادر کر دیا گیا۔اس کے بعد سکڑ سمٹ کر اسی گھر کے ساتھ والی نچلی پہاڑی پر اس کا بیٹھ جانا بھی اسی بات کا ثبوت تھا کہ اس نے یہ فیصلہ قبول ہی نہیں کیا۔اب وہ اپنی ٹھوڑی اپنی ہتھیلی پر ٹکائے اڑی بیٹھی تھی۔اس کے اندر رہ رہ کر ایک سوچ سر اٹھا رہی تھی کہ ضرور کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔جو

کچھ بھی ہوا ہے اس میں کہیں نہ کہیں گڑ بڑ ضرور ہوگئی ہے۔اس کے ذہن میں بار بار اپنی مذمت پر گمبھیر خاموشی کا خیال سر اٹھا رہا تھا کہ کس طرح لوگ دم بخود بیٹھے تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اسے کچھ کچھ اپنے حال پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔اور یقین بھی نہ آ رہا تھا کہ واقعی اس کے ساتھ کوئی ایسا بھی واقعہ ہوا ہے۔لیکن بات جو بھی ہو اس میں کلام نہیں کہ کوئی بہت بڑی گڑ بڑ ضرور ہے کہیں نہ کہیں۔

اس نے کنکھیوں سے ان کتوں کی طرف دیکھا جو اسٹریٹ لیمپ کے نیچے غول کے غول آ کر جمع ہو رہے تھے۔ جیسے وہ سنسان سڑکوں پر آدھی رات کے اس سناٹے میں جشن آزادی منانے نکلے ہوں۔تقریباً دس کتے تو آپس میں چہلیں اور دل لگی کرتے ہوئے اس کے بالکل قریب ہی آ گئے تھے انہوں نے سڑک پر سکڑی سکڑائی بیٹھی ہوئی اس انسانی ہستی کی طرف کوئی توجہ دی ہی نہیں۔اس کے برعکس اس کو وہم ہو رہا تھا کہ اس کا اس طرح یہاں بیٹھنا مشکوک اور مشتبہ بھی ہو سکتا ہے خصوصاً کتوں کے نزدیک چنانچہ وہ ان کی مزاحمت کے لئے پورے طور پر تیار اور چوکس بیٹھ گئی۔اس نے ان کی طرف تاک لگا رکھی تھی۔ اب وہ کھیل ہی کھیل میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔کسی نے اس کی طرف تو نہ دی حتیٰ کہ دوڑ بھاگ کرتا ہوا ایک اس کے گھٹنوں سے آ لگا اور خود ہی دبک گیا۔پھر اس پر نگاہ ڈالتے ہی گھبرا کر پیچھے کو ہٹ گیا۔گویا کہتا ہو بھئی واہ کتنی عجیب بات ہے، ایک انسانی وجود اور یہاں۔خیر کوئی بات نہیں اس احساس کے ساتھ کہ یہ کچھ نہیں فقط ایک انسان ہی تو ہے۔وہ مطمئن اور مسرور ہو کر ایک اور کتے پر لپکا۔

ایک کتے نے اس کو نظر انداز کر دیا تو دوسرے کتوں نے بھی توجہ نہ دی۔ بلکہ ایک غول کی شکل میں آگے کو بڑھ گئے اور اس طرح مختلف سائزوں اور تن و توش والے کتوں کے قدموں کی چاپ مل کر چوپائے کے قدموں سے نکل کر آنے والی دھیمی دھیمی آوازوں میں تبدیل ہوگئی۔کافی دیر تک یہ تمام کتے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ بھاگ کرتے رہے۔آس پاس یا جنگل کی طرف سے ایک بھی آواز نہ آ رہی تھی۔بجز چوپایوں کے قدموں کے۔اچانک ہی اس کو اپنے حال پر رنج ہونے لگا۔ وہ ان کے درمیان سے اس طرح سے سمٹی اٹھی کہ ان سے ٹکرا نہ جائے اور آگے چل پڑی۔

(3)

بچوں کوسونے کے لئے لٹا دیا گیا اور اسٹور کے شیشوں والے دروازے پر پردہ پھیلا دیا گیا۔تو گھر والی نے اس سے کہا

''آپ بھی اب سو جائیں۔ اس لئے کہ ہم لوگ بہت سویرے سویرے جاگ جاتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں ذرا اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''......اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی گھر والی بول پڑی۔''بہت اچھا'' یہ کہتے کہتے اس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

''ڈسٹرکٹ کمیٹی کا ممبر اوپر بالا خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور اس کی واپسی بہت دیر سے ہونا تھی......اتنی بات کہنے کے بعد وہ سونے کے لئے اوپر چلی گئی جہاں اس کے لئے بستر لگا دیا گیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ ان تلخ یادوں کو دبانے کی کوشش کرتی رہی۔ اور اس کیفیت کو بھلانے کی بھی جس نے اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ اوپر کی منزل میں صرف ایک ہی کمرہ تھا اور اس میں داخل ہوتے ہی اس کے اندر کے سوئے ہوئے اس فتنے کو جگا دیا تھا۔ اس اکیلے کمرے میں فقط ایک ڈیسک رکھا تھا۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ اس کا بستر کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اپنے گذشتہ تجربے کی بنا پر وہ جانتی تھی کہ اول یہاں ٹھہرنا بجائے خود ایک مسئلہ تھا اور پھر یہ کہ اس منحوس ضلعی کمیٹی کے ممبر کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سونا۔ وہ اس کی واپسی کا تصور کر کے سوچ رہی تھی کہ ڈسٹرکٹ کمیٹی کا یہ ممبر یقیناً ایک کڑوا کسیلا اور جھگڑالو شخص ہوگا۔ پھر وہ اس کا منہ کھول کر چلا کر بولنے کا انداز، اس کے رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں اور کھلا ہوا منہ اندر سے کسی بیماری کے سبب سیاہ نظر آتا تھا۔ منہ کے اندر کی سیاہی کے خیال کے ساتھ ہی اس کو یہ خیال آیا کہ کہیں اس کے پھیپھڑے تو خراب نہیں ہیں۔ ہوں گے ضرور۔ لیکن یہ اس طرح کے انسان ہوتے ہی کیوں ہیں۔ ایک خاص انداز کے کمزور ڈھانچے جیسے دبلے، زردرو، بدزبان۔ جیسے استرے پر سان چڑھی ہو۔ عجیب سا سطحی پن اور چھچھورا پن۔ اور جیسے لمبا سوکھا سا بازو اس طرح پھیلا کر اشارہ کرنے میں بڑی لذت ملتی ہو۔ گویا وہ کسی کو کچل ہی توڑالے گا۔

اس کو افسوس ہو رہا تھا کہ وہ فقط اس کی ذات سے نفرت کرنے کے بجائے اس قسم کے لوگوں کے خلاف نفرت رکھتی ہے۔ اگر چہ جہاں تک اس وقت کی یادوں سے متعلق جذبے کی بات ہے وہ اس کو ایک مخصوص ٹائپ کے طور پر لے رہی تھی۔ اس کو تو یہ بھی یقین نہ تھا کہ وہ اس

کو ٹھیک سے پہچان بھی سکتی ہے کہ نہیں۔ یقیناً اگر وہ یہاں کے بجائے کسی اور جگہ اس سے ملتی تو ہر گز نہ پہچان پاتی۔ اور اب وہ اس کی ذات خاص کے بجائے اس قسم کے لوگوں کے خلاف نفرت کا جذبہ رکھتی تھی۔

دھیرے دھیرے نیند نے اس پر غلبہ پایا۔ اور وہ اونگھنے لگی۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔ پھر نیچے سے آنے والی آوازوں سے اس کی آنکھ کھلی۔ یقیناً وہ اس کے ہی متعلق بات کر رہے ہوں گے۔ اس لئے کہ گھر والی کی آواز بھاری اور گھٹی گھٹی سی تھی۔ اور جس مرد سے وہ بات کر رہی تھی اس کی آواز سے بھی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوشش سے نیچی آواز میں بات کر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مجھے نیچے طلب کیا جائے گا۔ اس نے سوچا اور ساتھ ہی کسی کے زینہ چڑھنے کی آواز آئی

''میں نے کہا آپ جاگ رہی ہیں نا؟'' گھر والی جھجکتے ہوئے بولی'' مجھے افسوس ہے آپ کو زحمت کرنا پڑے گی لیکن انہوں نے آپ کو نیچے بلایا ہے۔''

''تم چلو میں آتی ہوں ابھی۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کو اندازہ تھا کہ اس کو نیچے کیوں بلوایا گیا ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور نیچے آ گئی۔ زینہ اتر کر اس نے دیکھا کہ آخری سیڑھی پر ایک نوجوان منہ لٹکائے بیٹھا ہے۔ اس کی آہٹ سن کر اس نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی'' وہ اس کے روبرو جا کر اس سے مخاطب ہوئی۔

اس نے بغیر تمہید کے ہی بات شروع کر دی۔ ''میں نے آپ کو اس وقت یہ کہنے کے لئے بلایا ہے کہ آپ کا اس گھر میں قیام مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ اول تو گھر نجی رہائش گاہ ہے ہی نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس سلسلے میں آپ کا خیال کیا ہے۔ البتہ ہمارے نقطہ نظر سے آپ کا یہاں ٹھہرنا پریشانی اور زحمت کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔''

ڈسٹرکٹ کمیٹی کے نوجوان ممبر کی اس بات کو معاملے کی نوعیت کے پیش نظر معاندانہ اور مخاصمت پر محمول کیا جا سکتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ متکبر اور خود پسند ہر گز نہ تھا۔ وہ خود غربت اور مفلسی میں پلا بڑھا تھا۔ اب وہ ایک کارکن بن گیا تھا۔ اس نے جو کچھ اس سے کہا وہ اس کے فرائض بہت خلوص اور دیانت سے نبھانا چاہتا تھا۔ بغیر یہ دیکھے کہ اس کا اثر گردوپیش پر کیا اور کس طرح پڑتا ہے۔ اس نے اسی خلوص سے یہ بات اس کے گوش گذار کر دی۔ ان کو باتیں کرتا چھوڑ کر گھر والی اپنے بچوں کے پاس چلی گئی۔

''جب مجھ سے میرے خیال اور نقطہ نظر کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ البتہ میں نے خود بھی سوچا تھا کہ یہاں ٹھہرنا قابل اعتراض ہوسکتا ہے۔'' اس کا جواب قطعی غیر تسلی بخش تھا۔ نوجوان نے اس کی طرف یوں دیکھا گویا وہ اس کے اصل موقف اور مطلب کو سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔

''جو کچھ بھی ہو آپ یہ تو جانتی ہیں کہ آپ ہم سے بالکل مختلف راہ پر گامزن ہیں۔ اور آپ خود سوچیں کہ اگر کوئی ایسا منحرف شخص اس مکان میں قیام کرتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوسکتا ہے اور نتیجہ کیا ہوگا اس کا؟''

''کون سی مختلف راہ؟ میں کسی مختلف راستے پر گامزن نہیں ہوں۔''

''خیر یہ تو ہے کہ آپ لوگ ایسی کاروائیوں سے منسلک ہو چکے۔ جو پارٹی کے بالکل خلاف ہیں۔ کیا آپ اس سے انکار کرسکتی ہیں۔

''پارٹی کے خلاف؟۔''

''اس نے منہ اٹھا کر یوں کہا گویا اس سے سوال کر رہی ہو۔ میرا تو خیال ہے کہ ہم لوگ پارٹی کے خلاف معاندانہ کاروائیوں میں ملوث ہیں۔

البتہ اس میں کئی اور معاملات اور کئی عناصر ایسے ہیں جن پر توجہ دینا پڑتی ہے۔''

''دیکھیں! میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے کہ میں کسی نظریاتی یا اصولی بحث ومباحثہ میں آپ کو الجھاؤں۔ خیر وہ جو کچھ بھی ہو آخر آپ کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟''

اس سوال کا مقصد کچھ نہ تھا بجز تجسس کے۔ اس کے نزدیک یہ ہوسکتا تھا کہ وہ دشمن کی جاسوس ہو۔ چنانچہ جب اس نے اپنے اس سفر کا مقصد بیان کر دیا تو وہ بھی مشکوک ہی رہا وہ اس کا یہی خیال تھا کہ اس کا یہ سفر تحریک سے کوئی براہ راست تعلق اور واسطہ رکھتا ہے۔

''اچھا تو پھر آپ فیکٹری جائیں گی اور وہاں سے واپسی پر پارٹی کی اعلیٰ کمان کو اپنی رپورٹ پیش کریں گی۔''

''نہیں بھئی۔ پارٹی کی ہائی کمان کو رپورٹ کرنے والی کوئی خاص بات ہے ہی نہیں۔ میرے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اکثر مواقع پر مجھے بلاوے ملتے رہتے ہیں کہ میں جا کر اپنے نظریات اور خیالات پر مبنی لیکچر دوں۔ اور اپنی ہی نقطہ نظر سے بات کرتی ہوں۔''

''اوہ۔ اچھا تو واقعی۔ یہ بات ہے۔''

وہ کسی گہری سوچ میں نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخراس نے کہا" دیکھیں بات جو کچھ بھی ہو لیکن اتنی رات گئے تو میں آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اپنا سامان اٹھائیں اور اسی وقت یہ جگہ چھوڑ دیں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ علی الصبح آپ یہاں سے ضرور چلی جائیں۔"

"شکریہ۔ بڑی مہربانی مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی۔"

گھر والی جو اپنے بچوں کے پاس جا کر لیٹ گئی تھی۔ یقیناً اس نے پہلے ہی اس فیصلے کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اور یقیناً اس نے اپنے کان ادھر ہی لگا رکھے ہوں گے......اوپر لیٹنے کے لئے جاتے ہوئے زینہ چڑھتے وقت وہ نوجوان ممبر کی سادہ دلی اور فیصلہ تک پہنچنے والی اس بات کو دل ہی دل میں سراہ رہی تھی۔ اور ایک طرح سے اس کی ممنون بھی تھی۔ بستر میں لیٹ کر جب اس نے لحاف منہ پر ڈالا تو وہ سوچتی رہی تھی کہ اس وقت اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ اس کی اپنی حرکت کا منطقی نتیجہ ہی تھا۔ لیکن اب اس کا کیا مطلب کہ اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے طور پر ان سب کو ہی ایک تکلیف دہ تجربہ اور آزمائش سے گذرنا پڑا۔ یعنی اس کے اپنے علاوہ نوجوان کمیٹی ممبر، گھر والی، سب ہی کو ایک تکلیف دہ آزمائش درپیش تھی۔ اپنی اپنی جگہ ہاں واقعی کہیں نہ کہیں ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ اسی قدر سوچ سکتی تھی۔ زینہ پر سے کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کمیٹی کا نوجوان ممبر، گھر والی، سب ہی کو ایک تکلیف دہ آزمائش درپیش تھی۔ اپنی اپنی جگہ ہاں واقعی کہیں نہ کہیں ضرور کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ اسی قدر سوچ سکتی تھی۔ زینہ پر سے کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کمیٹی کا نوجوان ممبر چونکہ اسی کمرے میں سوتا تھا وہ اوپر آرہا تھا۔ اس کے لئے اور کوئی جگہ تھی ہی نہیں۔ مجبوراً اسی کمرے میں آکر اس نے اپنا بستر تیار کیا۔ لحاف کے اندر منہ دیئے ہی دیئے وہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہ اپنا بستر لگا رہا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر ہی سونے کی تیاریوں میں مصروف ہے......بہت جلد اسکی آنکھ لگ گئی اور وہ غافل ہو کر سوگئی۔

علی الصبح وہ خاموشی سے بیدار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیچے گھر والی اور بڑی لڑکی بیدار ہو چکی تھیں۔ ناشتہ تیار تھا۔ اس کو دیکھ کر اس نے کہا

"ارے نہیں میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جانے سے پہلے تھوڑا سا تو کچھ کھالیں۔" ناشتے کی میز پر انڈے تھے۔ بڑی بیٹی بار بار مسکرانے لگتی تھی۔ ایسا لگتا کہ چاہنے کے باوجود وہ مہمان سے

باتیں کرتے ہچکچا رہی ہے۔اس کو پارٹی کے واقعات اور مسائل کا علم تھا۔

اس کی میزبان منع کرنے کے باوجود اس کو اسٹیشن تک چھوڑنے گئی۔اس نے کہا'' اتنا تو نزدیک ہے اسٹیشن ۔دور ہوتا تو کوئی بات بھی تھی۔'' راستے میں رات کے واقعات کے بارے میں معذرت کے طور پر وہ کہنے لگی

'' آپ کو تو پتہ ہے یہ نوجوان لوگ سر پھرے ہوتے ہیں جو دماغ میں آجائے وہی کرتے ہیں۔''

''نہیں بھئی۔اس کا جو فرض تھا اس نے وہی کہا۔میں نے بالکل برا نہیں مانا اس کی باتوں کا بلکہ مجھے افسوس ہے کہ اس کو میری وجہ سے پریشانی اٹھانی پڑی۔'' اس نے جواب دیا۔سامنے اسٹیشن کی طرف سیزن ٹکٹ پر سفر کرنے والے فیکٹری کے ملازمین عجلت میں گاڑی پکڑنے چلے جا رہے تھے۔اسٹیشن کے اسٹال اور دکانیں کھلنا شروع ہوگئی تھیں۔

''ایک بات کا افسوس ہے مجھے۔تمہارے شوہر گھر پر موجود نہ تھے۔اچھا میرا اسلام کہنا ان سے۔''

''اسٹیشن پر آپ سے ان کی ملاقات ہوگی۔وہ اسی ٹرین سے آرہے ہیں۔جس سے آپ جا رہے ہیں۔''

جیسا کہ اس کی میزبان کا ارادہ تھا وہ اس کے ساتھ اسٹیشن کے اندر داخل ہوگئی اور اس کے ہمراہ پلیٹ فارم پر جا کھڑی ہوئی۔چند لمحوں بعد ہی ٹرین پہنچ گئی اور وہ گاڑی میں چڑھ گئی۔اسی وقت میزبان اپنے شوہر سمیت اس کے ڈبہ کی کھڑکی پر آ کھڑی ہوئی۔ایسا لگتا تھا کہ وہاں تک آتے آتے وہ سارا واقعہ اس کے گوش گزار چکی تھی۔اس لئے کہ جب اس نے اس کو سلام کیا تو جواب میں وہ کہنے لگا''ہاں! ہاں!'' اور ذرا فاصلے ہی سے کھڑا رہا۔وہ اپنی دکان کے لئے سبزیوں کی خریداری کرنے ان ہی کپڑوں میں چلا گیا تھا جن کو پہن کر وہ گڈا چلاتا تھا۔گاڑی چھوٹنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔دونوں میاں بیوی اس کی کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے۔لیکن خاوند بالکل خاموش اور گم سم کھڑا تھا۔جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔بالکل گم سم اس کی شکل سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خاتون کی نازک پوزیشن سمجھ رہا تھا۔بیوی بھی صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔پھر وہ کھڑکی کی طرف منہ اٹھا کر یوں بولی گویا وہ اپنے شوہر اور مہمان دونوں ہی سے بیک وقت مخاطب ہو۔''بات یہ ہے کہ ہم تو آپ کو بحیثیت انسان پسند کرتے ہیں۔کیوں بھئی

ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ لہٰذا آپ کا جب بھی ادھر آنا ہو۔ ہمارے پاس ضرور ٹھہریں۔''

یہ بات شاید اس نے اطمینان اور تسلی کے ساتھ کہی ہوگی کیونکہ مہمان تو بہر حال رخصت ہو ہی رہی تھی۔ چنانچہ گھر والی کے یہ الفاظ کہ ہم آپ کو بحیثیت انسان تو پسند ہی کرتے ہیں۔ایک عجیب ملے جلے احساس کے ساتھ اس کے کانوں میں اترے تھے۔ جواب میں وہ بولی تھی۔

'' آپ لوگوں کا بہت شکریہ اور اگر میرے جانے کے بعد میری وجہ سے آپ کو کسی قسم کی پریشانی یا گڑبڑ کا سامنا کرنا پڑے تو اس کے لئے مجھے معاف کر دیجئے گا۔''

''نہیں مجھے تو یقین ہے کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہوگا۔'' گھر والی نے جواب دیا۔اتنے میں گاڑی چھوٹنے کا گھنٹہ بج گیا۔ گاڑی چل پڑی تو عورت کے خاوند نے چلتی گاڑی کے قدرے قریب ہو کر کھلی ہوئی صاف آواز میں کہا'' اچھا اب اپنا خیال رکھیں۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ جب گاڑی چل ہی پڑی تو اس نے پارٹی سے متعلق جذبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے جذبے کا اظہار کر ہی دیا۔ایسا کر کے وہ بہت مطمئن اور ہلکا پھلکا نظر آ رہا تھا۔ ناگاساکی شہر کے اندر کام کرنے والے محنت کشوں اور مزدوروں کے اتر جانے کے بعد ڈبہ خالی ہوا تو یکا یک مقامی لوگوں کی ملی جلی آوازوں سے بھر گیا۔ان لوگوں اور آوازوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے اس پر ان لوگوں کی جن سے وہ ابھی ابھی جدا ہوئی تھی، نازک نفسیاتی کیفیت کا احساس ان کے لئے محبت کی گرمی اور ہمدردی کا جذبہ بن کر ابھرا۔لیکن پھر اسی نقطہ پر پہنچ کر رفتہ رفتہ ایک کرب میں تبدیل ہونے لگا۔ وہ اب اپنے اندر ایک تناؤ اور بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ گذشتہ رات سے اس وقت تک کے واقعات ایک مضحکہ خیز اور لامعنی ڈراما لگ رہے تھے جنہوں نے اس سمیت اس میں شریک تمام کرداروں کو عجیب بھونڈی اور احمقانہ سی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

آج جب اس آن ریل جاپان کے ساحل سمندر کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔تو اس نے سامنے پھیلے ہوئے سمندر کی طرف دیکھا۔سمندر کا اور ابر آلود آسمانوں کا رنگ یکساں نظر آ رہا تھا۔ آسمان وزمین کی اس یکسانیت میں عجیب سی افسردگی اور ملال تھا۔ ہر شے ایک ڈھونگ اور ڈھکوسلا ہی تو ہے۔یہ سوچتے ہوئے خیال کے جبر اور تسلط سے مجبور ہو کر اس نے ایک نظر سمندر پر ڈالی۔سمندر کا رنگ گہرے ملال اور افسردگی سے مملو تھا۔

اِنچی فیومیکو

محبت کے حصول کی خاطر

میں نے جھک جھک کر کھلے برآمدے میں شوجی اسکرین کے اس طرف پکارا ''پروفیسر، میں اندر آسکتی ہوں۔'' شوجی اسکرین کا پردہ مرمت اور پیوند کاری کی وجہ سے بدرنگ نظر آرہا تھا۔

اندر سے جواب میں ایک گھٹی گھٹی سی مبہم آواز سنائی دی تھی۔نہیں معلوم جواب اثبات میں تھا یا نفی میں۔ میں نے لحاف سرکنے کی آواز سی سنی۔شاید انہوں نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی تھی۔ چونکہ اپنے سوال کے جواب میں میں نے کوئی آواز ضرور سنی تھی اس لئے میں نے آہستہ سے شوجی کو سرکایا۔اور اوورکوٹ پہنے ہی پہنے اندر داخل ہوگئی۔

ٹھیک اسی طرح جیسے میں نے انداز لگایا تھا۔ پروفیسر نینو کا وانصاب کی کتاب کا ایک نظر ثانی ایڈیشن تلاش کر رہے تھے۔ پتلے اور بڑے حجم کی یہ کتاب ان کے بستر کے قریب ہی پڑی تھی۔ اور وہ اپنا سفید اور اجاڑ بالوں والا سر داغ دار میلے تکئے سے اونچا اٹھائے ہوئے اس کو اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ میں جب بھی ان کا مسودہ نقل کرنے آتی تو مجھے ان کی میلی

چادریں اور لحافوں پر چڑھے ہوئے سفید لٹھے کے میلے غلاف دیکھ کر سخت کوفت ہوتی تھی۔ لیکن ان کی خادمہ مینکو جوان کی اور ان کے گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس کا کوئی ارادہ نہ تھا کہ ان گندی میلی چادروں کو تبدیل کردے۔ بات یہ ہے گندا بستر کسی مریض کے لئے خواہ وہ مریض کتنا ہی جوان کیوں ہو نہ ہو، ایک وبال بن جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک ضعیف العمر مریض شخص کے غصہ اور شدید پریشانی میں تبدیل ہوتی جارہی تھی۔ خصوصاً ان کے کمرے میں پھیلی ہوئی چھچھوندروں والی بدبو سے تو میرا خون کھول ہی کھول اٹھتا تھا۔ میں نے ان کے قریب رکھی بے رنگ وروغن ڈیسک پر اپنی نوٹ بک رکھی۔ پھر اسے کھولتے ہوئے بہت نرم آواز میں ان کی مزاج پرسی کی۔ یہ ڈیسک بھی شاید مونیکو بازار جانے سے قبل ان کے بستر کے قریب لگا گئی تھی۔ اور بستر گرم کرنے والا ہیٹر بستر میں رکھ گئی تھی۔ ان کے آتش دان میں ہمیشہ ادھ جلے کوئلے ہی پڑے نظر آتے تھے۔ آگ تو خیر کبھی روشن نظر ہی نہ آتی تھی۔ آج کا دن تو خصوصیت سے سرد تھا۔ کہ بارش کے ساتھ ہی برف باری بھی شروع ہوگئی تھی کمرہ ٹھنڈا یخ ہورہا تھا گویا برف خانہ ہی بنا ہوا تھا۔ پروفیسر نینو کاوا نے بڑی شفقت سے مجھے دیکھتے ہی تنبیہ کی ''دیکھوتم اپنا کوٹ ہرگز نہ اتارنا۔'' انہوں نے یہ نصیحت اس وقت کی تھی جب میں پہلی مرتبہ ان کی کتاب پر کام کرنے آئی تھی۔ اور اب یہ میری عادت بن چکی تھی کہ کوٹ پہنے ہی پہنے ان کے قریب بیٹھ جایا کرتی تھی۔ انہوں نے کبھی مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ (بیٹھ جاؤ)

''بھئی آج ہمیں دو جنموں کے نچوڑ اور ماحصل محبت پر کام کرنا ہے۔''

پروفیسر نے مزاج پرسی کے جواب میں موضوع گفتگو بدل دیا۔ یعنی وہ اپنی صحت اور حالت کے بارے میں کسی قسم کی بات چیت سے گریز چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے سینے پر رکھی ہوئی پتلی سی کتاب کو ایک ہاتھ سے پکڑا۔ سرخ پنسل اپنے سیدھے ہاتھ میں لی اور پھر دور کی نظر والے چشمے کے شیشوں کے اندر اپنی آنکھوں کو گھماتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ڈیسک پر اسی نظر ثانی شدہ نسخے کے صفحات کھولتے ہوئے میں نے کہا۔

''صفحہ انسٹھ۔ دو جنم کی محبت! جناب شروع ہی سے کرنا ہے نا۔ دراصل میں نے پروفیسر نینو کاوا کے زبانی ترجمے کو لکھنے کے لئے اپنی خدمات پیش کر ہوئی تھیں۔ وہ اوایدا کیناری کی کہانیوں کا ترجمہ کر رہے تھے۔ جس کا نام تھا

''بارش، چاند اور فصل بہار کی بارش کی کہانیاں''

وجہ یہ تھی کہ وہ بے حد بیمار اور ناتواں ہو گئے تھے۔ ان کے لئے خود لکھنا قریب ناممکن تھا۔ میں جس پبلشر کے ساتھ کام کر رہی تھی اس کا خیال تھا کہ ان قدیم کہانیوں کا جدید جاپانی اسالیب اور زبان میں ایک ساتھ ہی مجموعہ چھاپ دے۔ باوجود شدید علالت کے پروفیسر نے اس پیش کش کو بڑی گرم جوشی اور خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ اس کا ایک سبب شاید ان کی معاشی ضرورت بھی تھی۔ میں نے اپنے حصہ کا کام فصل بہار کی بارش کی کہانیاں تو مکمل کر لیا تھا۔ یعنی پہلے چار قصوں کا ترجمہ جو وہ اپنے کانپتے اور لرزتے ہونٹوں اور ناہموار ٹوٹے پھوٹے دانتوں کے درمیان سے نکلتے ہوئے الفاظ سے کر چکے تھے۔ وہ الفاظ کیا تھے بس الفاظ کے ریشمی تسلسل کی ایک ڈور تھی لگتا تھا کہ ریشم کے کوئے کے اندر سے ایک ریشمی تار تھا جو نکلتا ہی چلا جاتا تھا اور میں اس کو قلم بند کرتی رہتی تھی۔

''فصل بہار کی بارش آج بھی مسلسل برس رہی ہے۔ میں نے لکھنے کے لئے روشنائی کی عام ٹکیہ نکال تو لی لیکن چند لمحوں تک سوچنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ میرے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں۔ چنانچہ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ قدیم کہانیاں جنہیں مونو گتاری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسی قدیم انداز میں لکھ ڈالوں۔ اب یہ ہے کہ میری ذاتی زندگی تو اتنی کھوکھلی اور سطحی ہے جیسی کسی پہاڑی دہقان کی ہو۔ مجھ جیسا انسان بھلا وہ قدرت اظہار اور قوت بیان بھی کیسے کر سکتا ہے جو اس صنف ادب کا مخصوص اسلوب اور طرز ادا ہے۔ چنانچہ اب سوچا یہ ہے کہ جو بھی اسلوب بیان پچھلوں کا تھا، اور جو آج کے دور میں ہے، ان دونوں کے امتزاج ہی سے میں سادہ اور سچے انداز میں لکھوں۔ اور اب میری باری آئی ہے کہ میں دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر انہیں وہی کچھ دیکھتے سننے پر مجبور کر دوں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ لکھ رہا ہوں۔ اس وقت یہ سطور لکھتے وقت بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ آخر پہلے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنے دل و دماغ اور سوچ کی کہانیاں بنا کر لوگوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان کو تاریخ کا حصہ ہی گردانیں۔''

ایک ناری نے مونو گتاری کے قدیم اسالیب کو مسترد کر کے اس صنف ادب کی میں ایک انقلاب کی بنیاد ڈال کر اس ابتدائی اور نوآموز طرز بیان کے بجائے ایک ایسا دلکش اور لطیف پیرایہ اختیار کیا جو بارش اور چاند کی کہانیوں کے تانے بانے میں بنت بن کر ایسا تحلیل ہوا کہ یوں لگتا ہے کہ یہ قصہ کہانیوں کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ جذبات کا منہ زور دھارا ہے۔ جو پوری روانی اور آزادی سے تاریخ اور لوگ داستانوں کے کرداروں اور شخصیت کے قالب میں ڈھلتا چلا جاتا

ہے۔اور ساتھ ہی اس کا نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ قدیم جاگیردارانہ عہد کی مروجہ اخلاقی حدود سے بالاتر محسوس ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہی سبب رہا ہوگا وہ کہانیاں نہ تو کبھی شائع ہو سکیں اور نہ ہی لوگوں نے نجی طور پر ان کی نقول اور مخطوطے تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی۔آخر عمر میں اکیناری ، جو لاولد تھا، بیوی کی موت کی وجہ سے اکیلا رہ گیا۔اس کی بائیں آنکھ کی بصارت بھی ختم ہوگئی تھی۔اور پھر ایک روز اس دھندلی دھندلی نیم تاریک دنیا سے وہ خود بھی رخصت ہوگیا۔تاہم مرنے سے قبل مفلسی میں ایک طویل مدت جھیلنی پڑی تھی۔

اگر دیکھا جائے تو پروفیسر نینو کاوا کے بھی جو ایڈوا ادب (ماقبل تاریخ) کے معروف عالم شمار ہوتے تھے، حالات وکوائف بڑی حد تک اکیناری سے مشابہ تھے۔یعنی ان کا بیٹا جنگ میں مارا گیا اور بیوی نے ان کو چھوڑ دیا تھا۔اگرچہ ان کی ایک شادی شدہ بیٹی بھی تھی لیکن وہ ان کے غیر مصالحانہ رویے اور مائیکو کی موجودگی اور طرز عمل سے شدید بیزاری کے سبب کبھی کبھار ہی ان کے گھر میں قدم رکھتی تھی۔ چونکہ پروفیسر کو نہ تو کسی پنشن کا آسرا تھا نہ ہی کوئی بڑھاپے اور ریٹائرمنٹ کے بعد گذر اوقات کا کوئی وسیلہ تھا، اس لئے ان کے چند طلبا ان کی گذر بسر کے لئے کچھ نہ کچھ تصنیفی اور تالیفی نوعیت کے کام، مثلاً کسی نصابی کتاب کی تدوین اور تالیف یا پھر ایسے ہی ترجمے کا کام دلوا دیا کرتے جس کا وہ زبانی ترجمہ کر سکیں۔اگرچہ اس بات کا اندازہ مجھے بارش اور چاند کی کہانیوں کے ترجمے کے دوران ہو سکا تھا۔تاہم جب ہم فصل بہار کی بارشوں پر کام کر رہے تھے تو مجھے محسوس ہوا کہ پروفیسر اور اکیناری کی زندگی میں ایک قریبی رشتہ اور تعلق ہے، یعنی دونوں ہی کی آخری عمر شب و روز اور حالات میں یکسانیت اور مشابہت ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے اکثر محسوس ہوتا تھا، وہ الفاظ جو میں پروفیسر نیو نیو کاوا کے منہ سے سنتی ہوں وہ درحقیقت وہ باز گشت ہے جو قدیم داستانوں کے بطون کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے۔

پروفیسر نینو کاوا نے آہستہ آہستہ دھیمی اور دبی ہوئی آواز میں بیان کرنا شروع کیا۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ مقدس سیوتہ کی تلاوت کر رہے ہوں۔ان کا طریق کار یہ تھا کہ بستر پر چت پڑے ہیں۔سینے پر کتاب دھری ہے اور پڑھ پڑھ کر زبانی ترجمہ بولتے جا رہے ہیں چنانچہ انہوں نے ترجمہ بولنا شروع کر دیا۔

''یاماشرو کے دیہات میں پت جھڑ کے دن تھے۔تاکت سوکی کے پیڑوں کا پتہ پتہ جھڑ گیا تھا اور وہ لنڈ منڈ کھڑے تھے۔چار سو سناٹے اور ویرانی کا عالم تھا، خزاں کی ہوائیں گاؤں گاؤں

سائیں سائیں کرتی پھرتی تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب کوسونے کے گاؤں میں ایک امیر وکبیر زمیندار رہتا تھا۔ وہ اس علاقے میں عرصہ دراز سے بسا ہوا تھا۔ بے شمار زمین اور پہاڑوں پہاڑ پر پھیلی ہوئی کھیتیاں اس کی ملکیت تھیں۔ اور اس فکر اور اندیشے سے بے نیاز تھا کہ اس سال فصل کیسی اٹھی ہے۔ خراب ہے یا خوب، وہ زندگی بے فکری اور چین سے بسر کر رہا تھا۔ ظاہر ہے فراغت اور فرحت کی کمی نہ تھی وقت گذاری کے خیال سے اس نے مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ صبح سے رات گئے تک کتابوں کے مطالعہ ہی میں منہمک رہتا تھا۔ وہ کسی سے ملتا جلتا بھی نہ تھا۔ کثرت مطالعہ نے اس کو دوستی اور رفاقت کے خیال سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ اس پہاڑی گاؤں پر وہ کسی سے ملنے جلنے کی زحمت ہی نہ کرتا تھا۔ اسکی ماں بھی اس کے رات رات بھر جاگنے پڑھتے رہنے سے عاجز تھی۔ اس نے بار ہا اس سے کہا تھا۔

''خدا کے واسطے اب بس بھی کرو اور سو جاؤ۔ اب تو آدھی رات کا گھڑیال بھی بج چکا ہے۔ تمہارے باپ کہا کرتے تھے۔ یہ آدھی آدھی رات تک جاگ جاگ کر پڑھنے والے بالکل ختم ہو جاتے ہیں اور ان کو روگ لگ جاتے ہیں۔ زندگی بھر کر لئے ،اور ایک بات کہوں، وہ لوگ جو ہر بات کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ بالاخر ایک دن ان کی یہی حرکت عمر بھر کا پچھتاوا بن جائے گی۔''

ہوا یوں کہ زمیندار نے اپنی ماں کی محبت اور احترام کے جذبے سے مغلوب ہو کر اس کی نصیحت پر عمل کیا۔ وہ کوشش یہ کرنے لگا کہ دس بجے کے بعد تک مطالعہ بند کر کے سو جائے۔ ایک رات یوں ہوا کہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ فضا میں بوندا باندی کے تسلسل کے علاوہ مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مکمل سناٹے اور اتھاہ خاموشی میں اسے وقت گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ وہ پھڑتا گیا پڑھتا گیا یہاں تک کہ وقت گزر گیا۔ اور جب اس کو احساس ہوا تو اس نے سوچا کہ اپنی والدہ کی بات تو یاد ہی نہ رہی مجھے اور اب تو دو بجے سے بھی زیادہ وقت ہو رہا ہوگا۔ اس خیال کے سات ہی اس نے دریچہ کھول کر باہر کی طرف دیکھا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ سر شام سے برستی بارش تھم چکی ہے۔ ساتھ ہی ہواؤں کا زور بھی ٹوٹ گیا ہے اور آخر شب کا چاند شفاف آسمان کے بیچوں بیچ چمک رہا ہے بھیگتی رات میں یہ خاموش نظارہ۔ اچانک ہی اس کے جی میں آئی کہ کیوں نہ میں اس منظر کو شاعری کے قالب میں محفوظ کرلوں۔ چنانچہ اس نے اپنے جذبات کو شعر کا جامہ پہنانے

کے لئے جاپان کی مخصوص نظم ''واکا'' کی ہیئت کا سہارا لیا۔اس کے ذہن میں ''واکا'' کے ایک دو مصرعے ہی آئے تھے اور وہ اپنے برش اور روشنائی درست ہی کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک عجیب سی صدا آئی جیسے کوئی جرس پر چوب مارتا ہو۔دھیمی دھیمی سی اس آواز میں ملی جلی ایک اور آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔غور سے سننے پر اس کو احساس ہوا کہ آواز کی جس نحیف باج کو وہ جھینگر کی آواز تصور کرتا رہا تھا، وہ آج ہی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر راتوں کی تاریکی میں اس کے کانوں میں آیا کرتی تھی۔ہاں اب خیال آیا یہ جرس کی صدا بھی اس کے کانوں میں ٹکراتی رہی تھی۔لیکن اسے تعجب یہ ہوا کہ اس نے آج سے پہلے کبھی اس آواز پر غور کیوں نہیں کیا۔توجہ کیوں نہیں دی۔یقیناً یہ آواز کانوں میں تو بارہا پڑی ہوگی۔یعنی ان راتوں کی تنہائی میں جب وہ دیر دیر تک مطالعہ میں مصروف ہوتا تھا تو ہر رات ہی یہ آواز آئی ہوگی۔اب اس وقت اس آواز کی کھوج میں وہ باہر باغ میں نکل آیا اور جس سمت سے آواز آرہی تھی، ادھر کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ آواز تو باغ کے اس گوشے سے آتی ہے جہاں اونچی اونچی گھاس کھڑی ہے اور مدت سے کاٹی ہی نہیں گئی۔ہاں بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا۔اسی گھاس کے درمیان پتھر تلے سے یہ آواز آرہی ہے۔آواز کے اس مرکز کا سراغ لگا تو وہ مطمئن ہو کر اندر واپس جا کر اپنی خواب گاہ میں سو گیا۔

اگلی صبح اس نے اپنے تمام ملازموں کو جمع کر کے حکم دیا کہ اس پتھر تلے کھدائی کرو۔اب سنو، جب ملازموں نے تین فٹ کی گہرائی کر لی تو ایک شخص کی کدال کسی بڑے سے پتھر سے ٹکرائی۔پتھر ہٹا تو پتہ چلا کہ نیچے ایک تابوت ہے، جس پر پتھر ڈھانک دیا گیا ہے۔جب وہ سنگی ڈھکن ہٹایا گیا تو اندر جو بھی شے تھی وہ بالکل ناقابل شناخت تھی۔البتہ ایک ہاتھ میں چوب تھی، جو مسلسل جرس پر ضرب لگاتی تھی۔ڈرتے ڈرتے مالک تابوت کے نزدیک آیا اور تابوت کے اندر موجود شے پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایک انسانی لاش ہے۔دیکھنے میں وہ اتنی انسانی بھی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔بس ایک ڈھانچہ تھا، جلد ایسے جیسے خشک سامن مچھلی پڑی ہو۔البتہ سر کے بال اور داڑھی بڑھتے بڑھتے گھٹنوں تک پہنچ گئے تھے۔یہ دیکھ کر ایک ہٹے کٹے تنومند ملازم کو تابوت میں اتارا گیا کہ اس ڈھانچے کو بہت احتیاط اور حفاظت سے باہر نکال لائے۔ملازم نیچے اترا تو تابوت کے اندر سے اس نے پکار کر کہا۔یہ تو بہت ہی ہلکا ہے۔بالکل ہی ہلکا۔ایک ناتواں اور ضعیف بوڑھے جتنا بھی تو وزن نہیں۔

مزے کی بات یہ تھی کہ جب لوگ تابوت کے گرد کھڑے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے

اور لاش کو تابوت سے باہر نکال لانے میں مصروف تھے، اس وقت بھی وہ ہاتھ بار بار اٹھ کر جرس بجانے میں مصروف تھا۔ یہ دیکھ کر آقا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر احتراماً اس کو پرنام کیا۔ اور کہا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ہستی نے موت کا راستہ 'جو' کے ذریعے تلاش کیا ہے اور جو ایک ایسی موت ہوتی ہے جو گیان دھیان کی راہ سے زندگی کو فنا سے ہمکنار کرتی ہے اور زین مسلک میں اس کا تصور موجود ہے۔ اور زین بدھ مت کی وہ منزل ہے جہاں انسان کو نروان مل جاتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ نروان کا متلاشی شخص تابوت میں زندہ لیٹ کر خیالی مرگ وفنا کو اپنے آپ پر طاری کر لینا ہے۔ یقیناً تابوت میں لیٹے ہوئے شخص نے ایسی ہی موت کے حصول کی خاطر زین کا راستہ تلاش کیا ہے اور چونکہ میں نے کبھی اپنے خاندان کے کسی بھی فرد کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ ہمارے آباؤ اجداد میں کسی شخص ایسی موت حاصل کی ہو، اور ہمارا خاندان اس جگہ سو سال سے بھی کچھ زیادہ عرصے سے مقیم چلا آتا ہے اس لئے یقیناً یہ ان کے یہاں آباد ہونے سے بھی بہت پہلے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اور اب تو اس کی روح بھی یقیناً سورگ کو پہنچ چکی ہوگی۔ البتہ اس کا بے روح جسم سڑنے گلنے اور خاک ہونے کے بجائے امانت کی طرح محفوظ رہ گیا۔ لاش کا ہاتھ جو متواتر ہل رہا ہے اور جرس بجا رہا ہے جیسا کہ اس وقت یعنی تابوت میں لیٹتے وقت وہ مصروف تھا وہ اس کے عقیدے اور خیال کے ایک بے اختیار عمل کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اب چونکہ ہم نے اس کو کھود کر نکال ہی لیا ہے تو اس کو زندگی میں واپس لانا بھی ہمارا ہی فرض ہے۔''

آقا نے اتنا کہہ کر اس چوب خشک کی طرح سخت جسم کو تابوت سے نکال کر گھر کے اندر لے جانے میں اپنے خادموں کی مدد کی۔ وہ برابر ہدایتیں دیتا رہا۔

''دیکھو! احتیاط سے دیکھ بھال کر لے جاؤ کہیں ستون سے ٹکر کر توڑ پھوڑ ہی نہ دینا۔'' وہ سب مل کر اس کو ایک آبگینے کی طرح اٹھا کر اندر لے گئے۔ اندر لے جا کر اسے ایک کمرے میں لٹا دیا۔ آقا نے اس پر رضائی ڈال دی۔ پھر اس کے لبوں کو تر کرنے کے لئے ایک پیالی میں گرم پانی ٹپکانا شروع کیا۔ کچھ دیر اسی طرح کرنے سے زبان سے ملتی جلتی ایک کالی سیاہ چیز اس کے ہونٹوں کے درمیان لپلپانے لگی اور باہر نکل کر ہونٹوں کو چوسنے لگی۔

یہ منظر دیکھ کر عورتوں اور بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ''اف توبہ...... یہ تو کوئی پریت ہے بھوت بھوت......'' وہ تو ایسا بھاگیں کہ پھر اس کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ البتہ آقا کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ زیادہ توجہ سے اس چوب خشک کی سیوا اور دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ اس کے انہماک

اور عقیدت کو دیکھ کر ماں بھی اس کے ساتھ ساتھ اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر پورے وقت شوفر دی کے مقدس بولوں کا ورد کرتی رہتی۔ خصوصاً اس وقت وہ گرم پانی سے اس کے لبوں کو تر کرتی ہوتی تھی۔

پچاس سے بھی کچھ دن اوپر ہی گذر گئے۔ اس کا وہ نمک چڑھی خشک سامن مچھلی کا سا چہرہ اور اعضا اب دھیرے دھیرے تر نظر آنے لگے تھے اور لکڑی کی سی سختی اور خشکی میں نرمی کے آثار پیدا ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا اس کے سرد اور خوابیدہ بدن میں اب حدت اور حرکت عود کر رہی ہے۔

''یقیناً رفتہ رفتہ اس کو ہوش آ ہی جائے گا۔''

جوں جوں آقا کا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔ اس کی توجہ اور دیکھ بھال میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس لاش نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں پر روشنی پڑتی تو وہ انہیں تیزی سے چلانے لگا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی نظر صاف نہیں ہوئی اور وہ کسی چیز کو واضح طور پر دیکھنے سے قاصر تھا۔ اب تو یہاں تک ہو گیا تھا کہ منہ میں دلیہ ڈالا جاتا تو زبان ہلا ہلا کر وہ سب چاٹ لیتا۔ بالکل عام آدمیوں کی طرح۔ درخت کی خشک چھال جیسی کھال میں اب نمی اور ہمواری پیدا ہو رہی تھی۔ اور اعضا پر گوشت آنے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب وہ سن بھی سکتا ہے۔ اس لئے کہ شمالی ہواؤں کے جھکڑوں کی آواز آتی تو اس کا برہنہ بدن کانپنے لگتا تھا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا۔

ایک دن آقا نے اس کو پہننے کے لئے کپڑے دیئے تو وہ بے حد خوش ہوا۔ اور اب تو وہ بہت اچھی طرح کھانے پینے لگا تھا۔ ابتدا میں آقا نے اس کا گوشت اور مچھلی سے پرہیز ہی رکھا تھا۔ یہ سوچ کر کہ یہ شخص تو قدیم پجاریوں کی ایک جیتی جاگتی تصویر اور زندہ مثال ہے۔ یقیناً اس قسم کی ممنوعہ اشیا کو منہ لگانا پسند نہ کرے گا۔ تاہم اب اس نے یہ اندازہ لگایا کہ اوروں کو مچھلی گوشت کھاتے دیکھ کر اس کے نتھنے اس انداز میں پھڑکنے لگتے ہیں جیسے وہ ان کو کھانا چاہتا ہو۔ چنانچہ اب اسے گوشت اور مچھلی دی جانے لگی۔ ہڈیاں تک چبا ڈالتا وہ مچھلی کا سر چبا چبا کر ایک دم پیس ڈالتا تو آقا کو بڑی تسکین ہوتی۔

ایک دن آقا نے بڑے ادب اور احترام سے سوال کیا۔

''جناب! آپ تو ایک خاص مقصد اور مرتبے کے اہل ہیں کہ آپ نے زین فلسفہ کے تحت عدم اور فنا کی راہ تلاش کی اور اسی راستے سے موت کی وادی میں داخل ہوئے اور پھر از سر نو ایک

نئی زندگی پائی ہے۔ آپ ہمیں بتائیں کہ آخر وہ کیا اسرار ہے، جس کے تحت اتنے لمبے عرصے تک مدفون رہنے کے بعد بھی آپ زندہ وسلامت رہے۔''

اس نے سر ہلایا اور جواب دیا ''مجھے کچھ نہیں معلوم''

پھر وہ آقا کو خالی خالی نگاہوں سے تکنے لگا۔

''اچھا تو دفن ہونے سے قبل کی کچھ باتیں ہمیں بتائیں، آخر وہ کون سا عہد اور زمانہ تھا۔ اور آپ کس نام سے پکارے جاتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ واقعی کچھ بھی تو نہ جانتا تھا۔ وہ بالکل ہی بوکھلا گیا تھا۔ نروس ہو کر اپنی انگلیوں کو چاٹنے لگا تھا۔ دیکھنے میں بھی وہ ایک بدھوا اور اجڈ دہقان ہی لگتا تھا۔ اس مشاہدے نے آقا کو بہت ہی مایوس کر دیا۔ یوں کہ اس نے تو اپنے خیال میں ایک عظیم اور عالی مرتبت اوتار اور مقدس دینی پیشوا کو حیات نو سے دوبارہ ہمکنار کرنے کی انتھک کوشش کی ہے اور اس کی سیوا میں تن من سے لگا رہا ہے۔ اور یہ ہے کہ ہونقوں کی طرح بیٹھا ہے۔ کچھ بھی تو بتانے جوگا نہیں ہے۔ اب اس کا یہی مصرف تھا کہ دوسرے ملازموں کے ساتھ کام پر لگا دیا جائے۔ چنانچہ اس کو باغ کی صفائی جھاڑو بہار واور پانی چھڑکنے پر لگا دیا گیا اور وہ یہ سب فرائض بڑی خوشی سے انجام دیتا رہا۔ کبھی اس نے کسی قسم کی ناگواری کا اظہار بھی نہ کیا۔

''بھئی واہ یہ مہاتما بدھ کی تعلیمات اور فلسفہ تو نرا ڈھونگ ہی نکلے کہ جس مذہبی عقیدے سے سرشار ہو کر اس نے زین فلسفے کو اختیار کیا اور اس کی وساطت سے راہ عدم کی منزل کی تلاش میں زندہ دفن ہوا، اور تقریباً سو سال تک اس عالم میں گھنٹہ بجا بجا کر اپنے ہونے کا ثبوت دیا۔ اس سے اسے ملا کیا۔ ساری عقل اور شعور مٹی میں مل گئی۔ اب تہہ خاک سے برآمد ہوا تو کیا فقط ایک پنجر اور فانی بدن۔ آخر اس سب سے حاصل کیا ہوا؟ یہ صرف آقا ہی نہیں بلکہ گاؤں کے تمام دانا اور نابینا لوگوں کی رائے تھی۔ جس کا ذکر وہ ناک بھوں چڑھا کر کرنے لگے تھے۔

اچھا اب یہاں پر ہم توقف کرتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے رک جائیں۔ پروفیسر نے کروٹ لے لی تھی۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ کس وقت انہوں نے کتاب سینے پر سے ہٹا کر نیچے بستر پر ڈال دی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ تھک گئے ہیں۔

''آپ تھک گئے ہیں آپ کہیں تو چائے بنا دوں۔''

''نہیں''

انہوں نے ایسا برا سا منہ بنایا گویا کوئی نہایت کڑوی چیز منہ کے اندر چلی گئی ہے۔

میں جلدی سے اٹھی کاغذی دروازہ کھول کر میں نے بلند آواز میں مانیکو کو پکارا۔ معلوم ہوتا تھا مانیکو باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی۔ بازار سے واپس آ کر سیدھی وہیں چلی گئی ہوگی۔

''مانیکو ساں، مانیکو ساں، ذرا سنیں انہیں بیت الخلا جانا ہے جلدی آئیں۔''

گردوں کی خرابی اور مثانے کی تکلیف کے باعث پروفیسر نینو کا واصحیح طور سے پیشاب نہ کر پاتے تھے۔ ایک خاص نلکی کی مدد سے پیشاب خارج کرنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ترجمہ لکھواتے لکھواتے کسی غلطی کے باعث وہ شدید حاجت پر قابو نہ پا سکے تھے یہ واقعہ یاد کر کے میں بوکھلا گئی تھی۔

گوری چٹی گدبدے سے بھاری جسم والی مانیکو کا پیار کا نام ''اوسومی'' تھا یعنی کھنچی کھنچی نیم وا آنکھوں والی شہزادی۔ یہ نام اس کی آنکھوں کی مناسبت سے پروفیسر ہی کا دیا ہوا تھا۔ چنانچہ نیم وا نشیلی آنکھوں والی شہزادی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اور میں برابر والے کمرے میں اٹھ کر چلی گئی۔ جس کے بعد مانیکو نے پیشاب کا برتن پروفیسر کے نیچے لگا دیا۔ اس طرف سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

آئے۔ ہاں ایک ذرا اور...... اچھا ذرا اپنے کولہے اٹھائیں...... ہاں بس ٹھیک...... مانیکو نے اس مشقت کے دباؤ سے ہانپتے ہوئے اجڈپن سے سوال کیا'' کیوں پروفیسر اب تو کافی وقت ہوگیا مسز نوری تا کے کو جانے دیں...... وقت تو ہوگیا ہے۔''

''نہیں نہیں۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو ہم نے کام روک دیا ہے۔ وقفہ کیا ہے ابھی ہمیں اسے ختم کرنا ہے۔''

میں نے وہیں سے آواز دے کر کہا۔

''پروفیسر صاحب اب آپ آرام کریں۔ بس آج جہاں تک کام کر لیا ہے وہیں تک رہنے دیں۔ میں واپس چلی جاتی ہوں۔''

پروفیسر نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن ایسا لگا جیسے اس بات سے انہیں دکھ پہنچا ہے۔ جس وقت پیشاب کی نلکی لگائی جا رہی تھی تو ان کی کراہٹیں اور جھڑکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اوہ...... ہائے...... ارے بھئی ذرا نرمی سے۔ آہستہ۔ پھر جب ان کی چیخیں اور آوازیں رکیں تو پھر نلکی سے پیشاب کی بوتل میں پیشاب کے گرنے کی آواز مجھ تک آ رہی تھی۔ میرے پورے جسم میں سردی سی دوڑ گئی۔ جیسے کوئی اشارہ دے رہا ہو کہ اب ان کی زندگی کے گنے چنے دن

ہی رہ گئے ہیں۔''

یہ دس سال پہلے کی بات ہے ان ہی دنوں میں نے لڑکیوں کے ایک کالج سے نیا نیا گریجوایشن کیا تھا۔ پروفیسر میرے اوپر خصوصیت سے مہربانی اور شفقت کی نظر رکھتے اکثر اپنی کتابیں پڑھنے کے لئے مستعار دے دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے تحقیقی کام میں مجھ سے مددگار کے طور پر کام بھی لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے بڑی ڈھٹائی سے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی میں تو حیران ہی رہ گئی تھی۔ انہوں نے صرف میرے دونوں ہاتھ ہی نہیں پکڑے تھے بلکہ بے حد ناروا انداز میں کچھ زیادہ ہی بے تکلفی اور قربت کا مطالبہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن ان دنوں میری اپنے مرحوم شوہر سے منگنی ہو چکی تھی۔ جو بعد میں جنگ میں مارے گئے۔ ٹھیک اسی دن جس دن ہماری شادی کی سالگرہ ہونا تھی۔ اس وقت مجھے ادھیڑ عمر میں اس حرکت سے سخت کراہیت اور نفرت ہوئی تھی۔ اور اب اس وقت کو جب کبھی میں سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب اس وقت عمر کی اس منزل میں تھے جسے کسی مرد کی زندگی کا عہد شباب کہا جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب اپنی ان حرکات کی وجہ سے خاصے بدنام تھے۔ اور لوگ یہاں تک باتیں بناتے تھے کہ وہ استادی کے پیشے کے قابل نہیں۔

ان دنوں پروفیسر صاحب مجھے شہزادی تما کتورا کہا کرتے تھے۔ شہزادی تما کتورا ایک ایسا کردار ہے جو ان چند شہزادیوں میں سے تھی جو اپنی ذہانت اور بالغ نظری کے حسن سے مالا مال تھی۔ اور اس نے اپنے بانکے اور تیکھے عاشق شہزادہ جنجی کی محبت کو ٹھکرا کر شادی سے انکار کر دیا تھا۔ خیر پھر میری شادی ہوگئی اور تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد میں بیوہ ہوگئی۔ میرے شوہر بحریہ میں ٹیکنیکل آفیسر تھے اور ان کی وفات ہوائی اڈے پر حملے کے دوران ہوئی تھی۔ میں نے تقریباً دس سال جنگی بیوہ کے طور پر گذار دیئے۔ جنگ کے بعد اخلاقی انحطاط کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی ملازمت کرنے والی تنہا عورت کے ایسے اخلاق باختہ معاشرے میں کام کرنا اور زندہ رہنا محال تھا۔ یعنی لوگوں کو ایسی خواتین پر کھلم کھلا دراز دستیاں کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ وہ تو پروفیسر سے بھی زیادہ بھونڈے پن سے یہ حرکتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ جو ایک مثل ہے نا ہمارے یہاں کہ جو عورت بیس کے پیٹے میں بیوہ ہوتی ہے وہی بیوگی کاٹ سکتی ہے۔ تو میرا بھی یہی ہوا۔ عمر کے اس دور میں خاوند کے اختلاط اور رفاقت میں ڈیڑھ سال گذار لینے سے یہ ہوا کہ میں ایک تر و تازہ پھول کی طرح شاداب رہی۔ میری خوش قسمتی یا بد قسمتی یہ ہوئی کہ میں بیوگی کے بعد کسی دوسرے آدمی کے

نزدیک بھی نہ گئی۔ اوراس طرح جب میں عمر کے تیسویں سال میں تھی تو اس وقت بھی میرا حال ان دوسری عورتوں سے بالکل مختلف تھا یعنی جیسا کہ وہ صبح شام دفتر اور ملازمت کی چکی میں پس کر بالکل مردہ اور پژمردہ نظر آتی تھیں، اندر سے ویسی ہی خراب وخستہ جیسا اس کہانی والا شخص سوکھ کر کھانکڑ ہوگیا اور خشک سامن مچھلی کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ میرے ساتھ تو قصہ ہی دوسرا تھا۔ یعنی معجزاتی سا۔ میں خواب میں اپنے شوہر سے ملتی اور اس کی الفت سے مسرور ہوتی رہتی تھی۔ پھر میرے بیٹے کی صورت اپنے باپ سے اتنی مشابہ تھی، اس کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اس کے باپ سے ملاقات ہوگئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ایسے بے قابو جذبات سے مغلوب مردوں سے اپنا دفاع کرنا میرے لئے ناممکن نہ تھا۔ بلکہ ان کی ایسی حرکتیں خود مجھے افسردہ کر دیا کرتی تھیں۔ بہرحال اس وقت میں عجب احساس سے دوچار تھی۔ ماضی میں پروفیسر نینوکاوا کی منہ زور اور چڑھی ندی کی جیسی تند جوانی اور ان واہیات حرکات کا خیال کر کے اور پھر آج اس کی بے چارگی اور ناتوانی کا خیال کر کے کہ پیشاب تک کے لئے کسی کے سہارے اور مدد کی ضرورت ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں ان کے کمرے میں واپس آئی تو مانیکو پیشاب کی بوتل اٹھائے، کاغذی دروازہ کھول کر باہر نکل رہی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میرا خیال ہی ہو، لیکن اس وقت ان کے چہرے پر تازگی اور بحالی کے آثار نظر آرہے تھے۔ کہنی کو تکیہ پر ٹکائے وہ اپنا چہرہ ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے

''کیوں بھئی! کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہے نا دلچسپ؟''

''ہاں واقعی! اچھا! مجھے معلوم نہ تھا کہ ''فصل بہار کی برسات'' میں یہ بھی شامل ہے۔ کہانی تو قدیم ہی لگتی ہے۔''

''بالکل۔ قطعی''

اس کے بعد فاضل پروفیسر نے مجھے ایک اور کہانی سنائی جس کا نام تھا ''غلبہ آشفتہ خیالی کا براستہ مراقبہ'' دراصل کہانیوں کا ایک اور مجموعہ ہے جو ''بڑی بی کی چائے کہانیاں'' کے نام سے مشہور ہے۔ اور پروفیسر کی یہ کہانی اسی مجموعے کی ایک کہانی پر مبنی ہے۔ جو اکیناری نے لکھی ہے۔ وہ ایک پجاری کیتا تسو کے بارے میں ہے جو یاماتو کے صوبے کے شہر مائیوتسوزان میں سیکان مندر کا پجاری تھا۔ یہ واقعہ شو کے پہلے سال میں ہی رونما ہوا تھا۔ جوں ہی اس پجاری نے زین

مراقبہ کا آغاز کیا اسی دم وہ کسی حسینہ کی محبت میں گرفتار ہو کر نروان کے حصول سے محروم رہا۔ دراصل ہوا یوں کہ روح بدن کا ساتھ نہ چھوڑ سکی اور وہ اگلے سال پچپن سال تک جرس بجاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کا یہ عمل ہونن کے تیسرے سال تک جاری رہا......

اب چونکہ ''بڑی بی کی چائے کہانیاں'' کا پیش لفظ کیمپو عہد کے ابتدائی زمانے میں لکھا گیا تھا اس لحاظ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت اکیناری ایک بہت چھوٹا بچہ رہا ہوگا۔ اور پھر اس زمانے کے حالات کے پیش نظر یہ گمان غالب بھی نظر آتا ہے کہ اکیناری ان کہانیوں کو چند عشروں کے بعد ہی پڑھ سکا ہوگا۔ اور اکیناری کی بارش اور چاند یقیناً ایک خاص جذبے اور خیال کے تحت بڑی جزئیات اور تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ خصوصاً وہ جس میں ایک مہ جمال سے عشق اور وابستگی کی امرتا اور ابدیت بیان کی گئی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس وقت یہ الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپے اس کے اپنے جذبے کے ترجمان ہیں، میں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

''اسی کہانی کو میجی کے عہد میں ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس دور میں ایک اور کتاب دریافت ہوئی ہے جس کا نام ''داستان نگاری کی تاریخ اور مصنفین کی سوانح'' ہے۔ یہ تصنیف دو مصنفوں تسوباؤچی شویو اور مینوتانی فیوتو کی مشترک قلمی کاوشوں کا ثمر ہے۔ اس میں اکیبا کوسون نامی ایک شخص کا بیان ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اکیناری کی ایک کہانی کا مسودہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے ''برسات کی ایک رات کا قصہ'' یہ قصہ بالکل اسی کہانی ''دوجنموں کا ماحصل محبت'' کی طرح ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا خاتمہ مختلف ہے یعنی جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے کہ مدفون اور بظاہر مردہ شخص کا ہاتھ مسلسل جرس پر ضرب لگا رہا ہے وہ بالکل اس طرح ہے۔ فرق یہ ہے دوسری کہانی میں جو شخص اس گھنٹے کی آواز سنتا ہے وہ خود ہی اس مقام پر کھدائی کرتا ہے۔ اور وہاں ایک پجاری کو مسلسل میوتر دن کا ورد کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور پھر اس کہانی میں یہ بھی ہے کہ جب وہ اس کو کھود کر نکال لیتا ہے تو وہ دونوں چاندنی میں بیٹھ کر جی بھر کر باتیں کرتے ہیں۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ اکیناری نے یقیناً ایک لمبا مذہبی مکالمہ بھی وعظ اور فلسفہ پر مبنی لکھ مارا ہوگا۔''

''لیکن ایک بات ہے۔ یہ بتائیے کہ کہانی کی یہ جدید شکل اور ماحول اکیناری سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔'' میں نے اعتراض کیا۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اکیناری نے تو اصل حقیقت

اور خیال کی بنیادی حیثیت کو برقرار رکھا، اس طرح کہ جب اس کا مدفون کردار باہر نکلتا ہے تو اس کے لبوں پر سوتروں کا ورد ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جنون کی حد تک نے عقیدت کی اس شدت سے یقیناً اکنیاری کا دل موہ لیا ہوگا۔ اور اس نے اپنی کہانی میں واقعہ کی اس چول کو اپنی جگہ سے ہلایا بھی نہ ہوگا۔ اور مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر نینوکاوا نے اپنے ترجمہ میں جو تبدیلی پیدا کر کے صورت حال میں دہشت اور بے بسی کے ساتھ اس کے المیے اور فسردگی کو بھی دوچند کر دیا ہے۔

''ہا............ہا............ہا''

میری بات کی معنویت کا اندازہ لگا کر پروفیسر ناتوانی سے ہنسنے لگا اور ہنسنے میں اس کے رخسار کا گڑھا نمایاں نظر آ رہا تھا۔

''حقیقتاً یہ تو تمہاری بھی خواہش ہوگی کہ اگلے جنم میں بچھڑی ہوئی محبت سے ہمکنار ہو سکو۔ یہ تو بالکل فطری بات ہے۔''

یہ تو خیر پروفیسر کی عادت تھی کہ ان میں ذرا بھی جان پڑ جاتی اور ناتوانی میں کمی آتی تو ایسے چھچھورے مذاق کرنے سے چوکتے نہ تھے۔ میں لکھنے کی میز کی طرف چلی گئی۔

''ابھی ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ اگر آپ زیادہ نہ تھک گئے ہوں تو ہم یہ کہانی ختم ہی کر لیں۔''

''ہاں بالکل! کر ہی لیں۔ اس طرح کام ذرا ہلکا پھلکا اور سہل ہو جائے گا۔''

چنانچہ چت لیٹ کر پروفیسر نے کتاب سینے پر رکھی اور اس کے صفحات کھول لئے۔ میں نے کہانی کا سلسلہ جوڑنے کے لئے پڑھا۔ جی تو ''یقیناً'' مہاتما بدھ کی تعلیمات ناقابل عمل اور ناقابل اعتماد ہیں۔ اب ذرا دیکھنے کی بات ہے کہ ان کی ہدایات اور فلسفے کے مطابق ایک شخص زندہ زمین میں دفن ہوا اور اس نے پورے سو سال تہہ خاک گذار دیئے۔ ایک ہی دھن اور لگن سے متواتر جرس پر ضرب لگا لگا کر۔ اور سو سال بعد نکلا تو روح کا کوئی پتہ نشان نہ تھا۔ بس ایک جسد خاکی تھا جو باقی رہا۔'' ہم نے یہیں سے چھوڑا تھا۔

''ہاں بالکل یہیں پر سے شروع کرتے ہیں۔''

''اب یہ ہوا کہ اس آدمی کی احمقانہ حرکتوں اور بدھو پن کو دیکھ دیکھ کر لوگوں کے چہرے سے بھی نقابیں اٹھنے لگیں۔ سب سے پہلے تو آقا کی ماں کے تیور بدلنے لگے۔ اور آخر ایک دن وہ دل

کی بات زبان پر لے ہی آئی ۔اور کہنے لگی

برسہا برس میں خیر خیرات کر رہی ہوں کتنا دن پن کیا ہے اور زندگی بھر سوتروں کے شبد دھراتی رہی ہوں ۔ یہ ساری تبدیلیاں میں نے صرف اس لئے کی کہ مجھے کرموں کے جنم بھوگ کا ڈر لگا رہتا تھا اور یہ نہیں چاہتی تھی کہ اگلے جنم میں اپنے کسی باپ کا بھوگ پاؤں ۔لیکن اس آدمی کو دیکھ کر تو میری توبہ ہے، ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی لومڑی یا بجو کے جال میں پھنس گئی ہوں ۔'' ان خیالات کا علی الاعلان اظہار کرنے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کا ڈھنگ بدل دیا وہ پرانے راہبانہ طور وطریق چھوڑ کر زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار اور لطف اندوز ہونے لگی ۔ وہ اپنی بہو اور پوتا پوتی کو لے کر کھیتوں اور باغوں میں نکل جاتی ۔ اور ان کے ساتھ مل کر لہلاتے سبزے اور مہکتے پھولوں کا نظارہ کرتی ۔فطرت اور زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا یہ انداز بے ضرر اور معصومانہ تھا۔ جو کسی کی بھی نگاہوں میں کھٹکتا نہ تھا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے خاوند اور دیگر اقربا کی برسیوں کے موقع پر ان کی قبروں پر حاضری دینا بھی کبھی نہ بھولتی تھی ۔

آقا کی ماں مسرت آمیز لہجہ میں لوگوں کو بتاتی تھی کہ زندگی میں اپنے پرائے لوگوں سے سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے اور اپنے قریبی عزیزوں اور ملازموں سے محبت اور نرمی سے پیش آ کر جو روحانی سکون اور راحت مجھے ملتی ہے وہ ہر وقت سیوترا کے منتر اور شبد دہرانے سے حاصل نہیں ہوتی ۔ وہ ایسی مسرت اور راحت کے احساس کے ساتھ یہ سب کہتی گویا وہ کسی قید سے آزاد ہوگئی اور کسی بھاری بوجھ تلے سے نکل آئی ہو۔

''اچھا،اس زمین کو کھود کر نکالے جانے والے آدمی کے ساتھ لوگوں کا برتاؤ بھی بدلتا گیا۔ ایک تو وہ ہمیشہ غائب دماغ رہتا۔اس کے علاوہ جب اس کو محسوس ہوتا کہ اس کو کھانا کم دیا گیا ہے تو بگڑ جاتا۔اور بد دماغی کرتا۔اسی طرح اس کو جھڑکیوں اور ڈانٹ ڈپٹ کی بھی سہار نہ تھی۔فوراً بگڑ جاتا۔ بڑی غضب ناک آنکھوں سے گھورنا شروع کر دیتا۔ اب تو پڑوسیوں اور گھر کے ملازموں تک کے دلوں میں بھی اس کے لئے ذرہ برابر احترام یا محبت باقی نہ تھی۔اب سب اس کو جوسوکی کے نام سے پکارتے تھے۔حالانکہ وہ 'جو' میں داخل ہو چکا تھا۔اور 'جو' کا مطلب تھا۔زین مراقبے اور گیان دھیان کے راستے موت کی وادی میں اترنا۔غرض اسی طرح روتے دھوتے گھر والوں کی خدمت کرتے پانچ سال گذر گئے ۔

اسی گاؤں میں ایک غریب بیوہ بھی رہا کرتی تھی ۔ یہ بیوہ شروع ہی سے کم عقل مشہور تھی۔

لیکن رفتہ رفتہ جوجسو کی کے بہت قریب ہوگئی تھی۔ پہلے پہل تو گاؤں والوں کوعلم ہی نہ ہوا۔ پھر ایک دم ہی وہ دونوں ان کی نظروں میں آنا شروع ہوگئے۔ وہ دیکھتے کہ وہ اس کے کھیتوں میں جوت رہا ہے۔اس قدر مشقت سے وہ کھیت جو بلی کے ماتھے کی طرح تنگ تھے'اس کی محنت سے نرم ہوگئے۔کبھی دیکھے کہ چشمے کی پچھلی طرف بیٹھا وہ اس کے برتن بھانڈے دھو مانجھ رہا ہے۔اب یہ تھا کہ آقا تو اس سے پہلے ہی بیزار تھے،بس ایک گلے پڑے ڈھول کی طرح رکھے ہوئے تھے۔ادھر لوگوں نے دبی دبی طنزیہ مسکراہٹوں کے ساتھ چہ دینا شروع کر دی کہ اس نے تو اس عورت سے شادی کر لی ہے۔غرض کہ دونوں کے تعلق کا چرچا عام ہونے لگا تو آخر وہ اس کا شوہر بن ہی بیٹھا۔

یوں تو اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنا نام تک بھول چکا ہے لیکن عالمی تعلقات کا اسے خوب علم تھا۔

درحقیقت اس اواگون یا زندگی میں دوبارہ عملی طور پر واپسی کا ایک ہی جواز ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے اندر کی امتم یا مہان آتما کہ جس کو نفس علوی یا ملکی بھی کہا جا سکتا ہے، اس بات کی متمنی تھی کہ وہ مہاتما بدھ کے نقش قدم پر چل کر وہ مقام حاصل کر لے جس کو نروان کہا جاتا ہے۔تاہم جیسا ہر آدمی کے اندر روح کا ایک سفلی درجہ بھی ہوتا ہے، جسے نفس امارہ کہا جائے، وہ اس کے اندر بھی زندہ اور محفوظ تھا۔اور جب اس نے زین کا راستہ اختیار کیا تو زندہ دفن ہو کر وہ متواتر، اضطراری اور انتھک طور پر جرس پر موگری بھی چلاتا رہا۔لیکن نفس امارہ کی تشنگی ایک شدید آرزو میں ڈھل گئی کہ ایک بار دنیا کی زندگی میں واپس جا کر عائلی اور متاہلانہ زندگی کا بھی مزا چکھے۔غرض لوگوں کو ایک بات مل گئی تھی اور اس قسم کی قیاس آرائیاں کرتے رہتے۔

گاؤں کے نوجوانوں کو اپنی ہی لگی رہتی تھی وہ یہ جاننے کے لئے مرے جاتے تھے کہ آخر وہ اپنی بیوی سے معاملات محبت اور ازدواج کس طرح نبھاتا ہے۔ان کے اشتیاق اور تجسس کا یہ عالم تھا کہ وہ بند کواڑوں کی جھریوں میں سے تانک جھانک کر کے ٹوہ لیتے کہ دیکھیں تو سہی وہ کیا کر رہا ہے۔وہاں کچھ بھی تو نظر نہ آتا۔آنا کیا تھا، کوئی جن بھوت تو تھا نہیں اک بشر ہی تو تھا۔اور جب خلاف توقع خاص بات نظر نہ آتی تو منہ لٹکائے واپس آجاتے۔ناراض اور نا آسودہ سے۔

اب گاؤں کے لوگوں نے یہ بھی کہنا شروع کیا کہ بھئی اس کو دیکھ کر میرا تو دھرم ہی بھرشٹ ہوگیا کہ مندروں میں کیا کیا تلقین کی جاتی ہے اور جب بندہ اپنی ان دونوں آنکھوں سے اس کی حالت دیکھتا ہے تو پھر کیا کہنے کو رہ جاتا۔اس قسم کی باتیں بڑھتے بڑھتے آس پاس کے دوسرے

دیہاتوں میں بھی پھیلیں۔ بات فقط ایسے چرچوں تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ مندروں میں لوگوں کی حاضری اور چڑھاوے بھی رفتہ رفتہ گھٹنے لگے۔

اس صورت حال سے ایک بڑے مندر کا پروہت بہت فکر مند ہوا۔ اگرچہ اس انحطاط اور روحانی زوال کے عہد میں یہ بات ایک عام انسان کی دسترس سے باہر ہے کہ مہاتمابدھ کے دور رس اور بلند پرواز طریقوں سے نجات اور مکتی کے حصول پر کامل طور پر عمل درآمد ہو سکے۔ تاہم ان کی تعلیمات کی کلیتاً نفی کرنا انہیں یوں نظر انداز کر دینا یا ان کو بے وقعت قرار دینا بھی مناسب نہیں۔ اب اس نے ایک ایسی راہ کی کھوج لگانے کا فیصلہ کیا جو تیاگ، فاقہ کشی اور اس راستہ سے جو سوکی نے گیان دھیان کے ذریعہ پانے کی کوشش کی تھی، اس سے ہٹ کر روحانی ارتقا کی کسی اور راہ کا سراغ لگائے۔ چنانچہ اس نے ازمنہ قدیم کے تاریخی شواہد اور دستاویزوں کو کھنگال ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک قریبی علاقے کے ہر ضعیف اور عمر رسیدہ عالم سے جا کر گفتگو بھی کی۔ غرض اس نے ہر وہ کوشش کی جس کے ذریعہ وہ صدیوں پرانے اور وقت کے قدموں کی دھول تلے مدفون سچائیوں کا کھوج پا سکے۔ اس سلسلے میں وہ اتنا سرگرم ہوا کہ وہ فرائض منصبی جو ایک پروہت بھینٹ کے استھان پر انجام دیتا ہے، وہ ان سے بھی صرف نظر آنے لگا۔ اور دن رات اسے ایک ہی دھن تھی، سوئے اتفاق سے یہ گاؤں تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک سیلاب کی زد میں ایسا آیا کہ انسانی زندگی کے آثار تک باقی نہ رہے۔ اور یہ سیلاب تھا کہ طوفان، کہ اس کے بعد دریا کی نئی شاخیں وجود میں آ گئیں اور اس علاقے کا جغرافیہ ہی تبدیل ہو گیا۔ پانی کی اس نئی تقسیم اور بہاؤ کے ساتھ ہی پانی کے ذرائع آمد و رفت میں اضافہ ہوا اور بہتری بھی ہو گئی تو دوسرے علاقوں کے لوگ یہاں پہنچنے اور آباد ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ موجودہ گاؤں بس گیا۔ اور سیلاب سے پہلے جو گاؤں اس جگہ آباد تھا، وہ دریا کی نذر ہو گیا۔ اب جبکہ اس حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا۔ کوسوبے گاؤں میں موجود آبادی جس جگہ پر آ کر بسی وہ محض ایک غیر آباد ریتلا ساحل تھا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ تابوت یہاں لا کر کیسے دفن کی گیا۔ سیلاب کی طوفانی موجیں اس راہ سے گذری ہوں گی تو یقیناً اس عظیم المرتبت پروہت کی آنکھوں، کانوں اور ناک کے راستے سب کچھ بہتا ہوا گذر گیا ہو گیا۔ چنانچہ اس طرح اندر کی ہر شے پانی کی لپیٹ میں آ کر کھوکھلی ہوئی اور یہ ایک احمق کی صورت باقی رہ گی۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

اس معاملے میں لوگوں کی رائے اور نظریات مختلف اور بٹے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ جو بڑی

سنجیدگی سے یہ بات کہتے تھے اور کچھ تمسخر سے اور خوب ہنستے بھی تھے،

بہرحال جوسوکی کا ماضی، ایک سربستہ راز ہی رہا۔

اس زمانے میں جب ہر خاص وعام کی زبان پر یہ چرچے تھے، تو گاؤں کے مکھیا کی ماں بیمار پڑ گئی۔ اس وقت اس کی عمر اسی برس سے اوپر تھی۔ بیماری کی شدت سے اس کو احساس ہو گیا کہ اس کی موت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ اس نے اپنے معالج کو بلا کر کہا

''اس مرتبہ یہ بیماری مجھے لے کر ہی جائے گی۔ ابھی تک تو مجھے یہ پتہ ہی نہ تھا کہ موت کب آ جائے گی۔ اور میں اب تک تمہاری دواؤں کے زور پر زندہ ہوں۔ تم نے اب تک میرا بہت خیال رکھا ہے۔ اب میرے بعد اس خاندان کا بھی خیال رکھنا۔ میرا بیٹا اس وقت ساٹھ سے اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن اس عمر میں بھی وہ اتنا بے دست وپا ہے کہ مجھے اس کی بہت فکر ہے۔ اتنی عنایت کرنا کہ اس سے گاہے بگاہے ملتے اور سمجھاتے رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ اپنی خاندانی دولت اور جائیداد لٹا بیٹھے۔''

یہ سن کر اس کا مکھیا بیٹا کھسیا کر ہنستے ہوئے بولا

''ارے اب تو میرے بھی بال سفید ہو رہے ہیں۔ اگرچہ فطرتاً میں بہت تیز اور چالاک شروع ہی سے نہ تھا، تاہم میں کبھی آپ کی تربیت اور سکھائی ہوئی باتوں کو نہیں بھولوں گا۔ اور میں اپنے خاندانی کاروبار کا تحفظ کروں گا۔ اس لئے ماں جی آپ اب سکون سے دسوترا کا ورد کرتی ہوئی موت سے ہمکنار ہوں۔ میری فکر نہ کریں۔''

ماں نے فوراً ڈاکٹر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا

''دیکھا......ڈاکٹر سنا تم نے، یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بھلا اس کو اتنی بھی عقل نہیں کہ میں آخری وقت میں یہ باتیں اس لئے کر رہی ہوں کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ مرتے وقت میرے لبوں پر سوترا کے شبد ہوں اور میں بدھ سے التجائیں کر کے سورگ میں داخل نہیں ہونا چاہتی۔ نہ ہی میں دوسرے جنم میں کرموں کے بھوگ بھرنے کے لئے جانوروں میں پیدا ہونے سے خوف محسوس کر رہی ہوں۔ اس لئے کہ اب تک اتنی زندگی میں میں نے جانوروں کی زندگی کا بہت قریب سے جو مشاہدہ کیا ہے، اور یہی محسوس کیا ہے کہ یہ گھوڑے گائے بیل وغیرہ اتنے تو دکھی نہیں جتنے بدھ مت کی رو سے بیان کئے گئے ہیں۔ نہ وہ اتنی شدید مشقت اور سختی سے گذرتے ہیں۔ زیادہ تر تو وہ موج ہی کرتے ہیں۔ زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں، بےفکری اور فراغت کے ساتھ۔ اور انسان جو

دنیا جہان سے برتر اور بہتر مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اس کی زندگی میں خوشی اور فراغت کے لمحات کی مدت کتنی مختصر ہوتی ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا ہے اس کی مصروفیت سختی اور دکھوں اور فکروں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ارے انسان تو سالہا سال صبح سے شام تک نت نئے کاموں میں جتا رہتا ہے۔ متواتر کچھ نہیں تو بار بار کپڑے دھو رہے ہیں۔ بار بار کپڑے رنگ رہے ہیں۔ پھر جیسے تیسے ایک سال ختم کرتا ہے تو نئی فکریں ٹیکسوں اور لگان کی ادائیگی کے چکروں سے بھی بھلا ملتی ہے نجات کبھی کسی کو۔ بلکہ یہ ٹیکس اور لگان تو زندگی اور موت کا سوال بن کر آتے ہیں۔ اچھا اپنے تفکرات ایک طرف اور پھر یہ ہمارے مزارعے الگ جان کھانے کو سر پر سوار رہتے ہیں۔ یہ بات وہ بات، ہزاروں دکھڑے، ہزاروں شکایتیں ...... اب ایسے میں کوئی سورگ جانے کا سوچ بھی سکتا ہے؟ کم از کم میں تو نہیں جا سکتی۔

اچھا میری آخری وصیت یہ ہے کہ مرنے کے بعد مجھ زمین میں دفن کرنا اس لئے کہ میں اپنی موت کے بعد جوسوکی بننا نہیں چاہتی۔ بس مجھے پہاڑوں پر رکھ کر تابوت کو نذر آتش کر دینا۔ سنوڈاکٹر تم کو گواہ بنا کر میں یہ وصیت کر رہی ہوں۔ بس یہی میری آخری خواہش ہے۔ آہ اب ہر چیز بہت تکلیف دہ لگ رہی ہے۔ اب تو بولنے کی بھی جی نہیں چاہتا۔''

یہ کہتے کہتے اس نے آنکھیں موندلیں۔ اور دنیا سے رخصت ہوئی۔ اس کی خواہش اور وصیت کے مطابق پہاڑ کی چوٹی پر چتا تیار کی گئی اور اس کو جلا دیا گیا۔ جوسوکی جس نے 'جوٗ' کے ذریعہ موت کی راہ تلاش کی تھی، ان مزدوروں اور مزارعوں میں شامل تھا جو تابوت اپنے کاندھوں پر اٹھا کر لائے تھے جسے آگ لگا کر جلا دیا گیا اور لاش جل کر بھسم ہو گئی تھی۔ چونکہ چتا کو آگ دینے والا جوسوکی ہی تھا۔ اس لئے وہ چتا کے پاس اس وقت تک موجود رہا جب تک کہ لاش جل کر راکھ نہ ہو گئی اور سوگوار خاندان نے اس راکھ میں سے ہڈیاں نہ چن لیں۔ ہڈیاں چونے کی طرح سفید اور درخت کی ننھی ننھی ٹہنیوں کی مانند پتلی اور باریک تھیں۔ پھر انہوں نے ان کو ایک منقش خاکدان میں محفوظ کر لیا۔ اور جب گھر والوں کو پتہ چلا کر وہ چتا کے پاس دیر تک اس لئے ٹھہرا رہا تھا کہ ایسا کرنے سے اس کو ڈھیر سارے چاولوں پر سیم کے کالے بیجوں کا سالن ملے گا، جو مردے کی روح کی نجات کے لئے تقسیم کئے جاتے ہیں تو جس نے بھی سنا اس نے اس حرکت پر نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا۔

بعض لوگوں نے اپنے بچوں کو اس کے ندیدے پن کی بات بتاتے ہوئے اس کے جنم میں

تھوکا تھا۔

''خیراس کا آواگون اوراس جنم میں شادی کرنا بدھ بھگوان کی رضا اور حکم سے ہی ہوا ہوگا۔ اور مہاتما کا یہ جو وعدہ ہے کہ محبت اور الفت بعد مرگ بھی باقی رہے گی، اس لئے کہ محبت زندگی اور موت سے ماورا ہے۔سواب وہ وعدہ اسی طرح پورا ہوا ہے۔''

تو جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔تاہم جوسوکی کی بیوی کا اپنا ہی انداز اور نظریہ تھا۔یعنی کہ وہ اس سے خوب خم، ٹھونک ٹھونک کر لڑتی تھی۔اور وہ ہنگامہ کرتی کہ محلے والے تو کیا بیچ بچاؤ کرتے۔ محلے کے کتے تک دم دبا کر بھاگ لیتے تھے اور وہ تھی کہ سر پیٹ پیٹ کر روتی اور بین کرتی جاتی۔

''ارے کاہے کو اس نکھٹو مورکھ کے پلے بندھ گئی۔ہائے میں تو اس دن کو روتی ہوں جب میں اکیلی جان فصلوں کی بالیوں سے گرا ہوا اناج چنا کرتی تھی۔ارے اگر میرے نصیب میں مرن ہارا یہ آواگون ہی لکھا تھا، تو میرا وہ سور گباشی پہلا خاوند ہی دوسرا جنم پا کر مل جاتا مجھے۔ارے جو وہی دوسرا جنم پالیتا تو ہم کاہے کو ایسے مربھکے ہوکر رہتے۔نا گھر میں چاول، گیہوں کے دانے نہیں کھانے کو، تن پر لتے نہیں، بدن ڈھانکنے کو وغیرہ وغیرہ۔''

''واقعی اس دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔سب ہی کچھ ممکن ہے۔''

ترجمہ ختم ہوگیا تو اس کے ساتھ ہی جاڑے کا بوند برابر دن بھی تمام ہوا اور شام کی سیاہی پھیلنے لگی۔پروفیسر واقعی بولتے بولتے تھک کر چور ہوگیا تھا۔اب وہ کتاب سینے پر دھرے بے سدھ پڑا بلب کی ہلکی ہلکی پیلی روشنی میں برابر آنکھیں جھپک رہا تھا۔ترجمے اور کتاب کے بارے میں ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نکلا۔یعنی جس قسم کی تنقیدی گفتگو کی میں توقع کر رہی تھی۔ میرے گھر کا راستہ یہاں سے گھنٹہ بھر کا تھا۔اور مجھے اس خیال سے بے چینی سی ہو رہی تھی مگر میں پروفیسر سے کہے بغیر ہی وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔

پروفیسر نیونوکا کا واحد گھر ضلع نیریما میں ایسی جگہ پر واقع تھا، جہاں بے شمار پیڑ کھڑے تھے جن کے سرخ سرخ پتے پت جھڑ کے دنوں میں بے تحاشہ گرتے تھے۔یہ علاقہ ایسا تھا کہ جس کو دیکھ کر موساشینو کے اس علاقے کا خیال آتا۔وسطی ٹوکیو کے رہنے والوں کو یہاں پہنچ کر گھر کی یاد ستانے لگتی اس لئے کہ یہ علاقہ اس سے گہری مناسبت رکھتا تھا۔پروفیسر کا گھر مین روڈ سے ہٹ کر ایسی جگہ پر تھا جہاں سے صرف بس جاتی تھی۔یہاں سے اسٹیشن تک پہنچنا جاڑے اور گرمی دونوں

ہی موسموں میں دشوار تھا۔ اس لئے کہ کوئی دوسری سواری ہی نہیں ملتی تھی۔ وہاں سے اسٹیشن تک پہنچنے کے لئے پیدل چل کر جانا پڑتا تھا۔ درمیانی سڑک جنگل سے گذر کر جاتی تھی جہاں بانسوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ اب میں اگر مین اسٹریٹ کے مخالف سمت کو جاتی تو ایک صاف ستھری روشنیوں سے جگمگاتی سڑک سے گذر کر اسٹیشن تک پہنچتی اگر چہ یہ لمبا راستہ تھا۔ میں عام طور پر کھیتوں کے درمیان والی سڑک سے جانے کی عادی تھی۔ اس وقت شام پڑ چکی تھی۔ اس لئے میں نے وہی چھوٹا راستہ اختیار کیا۔ سنسان اندھیری سڑک پر چلتے چلتے بارش سے بچاؤ کے لئے میں نے چھتری کھول لی تھی اس لئے کہ بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔ میں نے اپنا چہرا اوور کوٹ کے کالر میں چھپالیا تھا۔

چونکہ میں ترجمہ ختم کرتے ہی پروفیسر سے کچھ کہے سنے بغیر اٹھ کر چلی آئی تھی اس لئے میرے دماغ میں جوسوکی کا خیال سائے کی طرح ساتھ لگا آیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کہانی کا کردار نہیں واقعی جیتا جاگتا حقیقی انسان ہے۔ اس کہانی میں جوسوکی کے دھیان اور مراقبے کی راہ سے موت کی وادی میں داخل ہونے سے پہلے کا ماضی مذکور نہ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس سے قبل کون تھا، کیا تھا۔ کہانی کا یہ حصہ ایک سربستہ راز ہی رہ گیا تھا۔ لیکن چونکہ اسی کہانی پر مبنی ایک اور نئی کہانی کے مصنف اکیناری کی حالت مجھ پر عیاں تھی، تو میں نے یہ محسوس کیا کہ اس نے ماضی قدیم کے کسی معروف قصہ کو بنیاد بنا کر یہ کہانی اپنے طور پر لکھی ہے اور اس میں جو کردار جوسوکی کا ہے، وہ خود اکیناری کی نفسیاتی گھٹن اور جذباتی دباؤ اور اڑ کی پیداوار ہے۔ اور یہ اس کا نیا جنم (آواز گون) ایک سادہ لوح فاتر العقل دیہاتی اکیناری کے ذہن کی تخلیق اور اختراع ہے۔ خود اکیناری کا ذہن اور مزاج اس سے بہت مختلف تھا۔ یعنی پروفیسر نیونو کاوا کے پیش لفظ کے حوالے سے جو انہوں نے بارش اور چاند کی ابتدا میں لکھا ہے: ''اکیناری ایک مختلف اور خوبصورت ذہن کا مالک ہے۔ اس نے ایک راہب کی کہانی جس طرح لکھی ہے اور خوب روخوش جمال حسینہ کی ایک نگاہ مسحور کن کشش کا جو بیان دیا ہے، اور جس انداز میں یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ایک نظر نے اس رشی کے سارے ریاض اور تپسیا پر پانی پھیر دیا کہ وہ کبھی کایا اور کالبد کے ابدی چکر کو توڑ ہی نہ سکا۔ اور نروان کی منزل کو نہ پاسکا تو کیا وہی اکیناری ''جنموں کی محبت کے حصول کی خاطر'' میں اس کہانی اور اس کے کردار کو بہتر طریقے پر پیش نہ کر سکتا تھا کہ اس کردار کے اندر کہیں کوئی گہرائی، کوئی اسرار مل سکتا ہے۔ اس کے بجائے جتنا بھی گھما پھرا کر دیکھو وہ نرا

احمق اور فاتر العقل ہی نظر آتا ہے۔اور یہ محض ایک ایسی مسخری سی کہانی بن کر رہ گئی ہے جیسے بچوں کے لئے لکھی گئی ہو۔اب اس کا یہی تجزیہ کیا جاسکتا ہے کہ اکیناری نے جب یہ کہانی لکھی ہے تو وہ تقریباً بصارت سے محروم ہو چکا ہے۔اس نے اپنی بیوی کورین سے یوں ہاتھ دھوئے کہ وہ ایک دیوداسی یعنی راہبہ بن کر اس سے بچھڑ گئی۔اب عمر کے آخری حصہ میں افلاس، تنہائی اور تقریباً نیم تاریک زندگی کے باعث اس کے اندر محرومی اور جنسی ناآسودگی کا احساس پروان چڑھتا رہا۔اور پھر کچھ جنسی خواہشات کی رہ رہ کر حملے والی لو کہ جیسے بجھتے دیئے کہ شعلے کی لپک۔اسی کی دہشت میں یہ خواہش اور نفسیاتی بھوک بھی بھوبل میں دبی چنگاری کی طرح رہ رہ کر چمکی ہوگی اور اس پر مستزاد کچھ لکھنے اور تخلیق کرنے کا جذبہ جس کے دباؤ کے تحت ایک ایسا کردار تخلیق ہوگیا جس نے اپنی پچھلی زندگی جنسی محرومی میں گذار دی تھی۔دوسرے جنم میں ایک جاہل احمق کا قالب مستعار لے کر اس نے اپنی اس خواہش کی تکمیل کی اور اس خیال سے مجھے وہ جذبہ اور خواہش ایک ایسے پراسرار مہیب اور مکروہ کیڑے کی مانند محسوس ہوئے جو اس جسم کے مردہ اور بے حس ہوجانے کے بعد بھی زندہ ہے۔اس کہانی کا ایک پہلو اور بھی ہے یعنی اکیناری کی بے دینی اور جدھا جو اس کہانی میں دو موقعوں پر ابھری ہے۔یعنی ایک مرتبہ تو کہانی کے مرکزی کردار ایک بے نام بھکشو یا پروہت کی لاحاصل تپسیا اور ریاض کا حاصل پھر وہی شہوانیت اور جنسی خواہش کی موجودگی اور امرتا کہ جس سے وہ بھاگا اور نجات چاہی۔یہ چیز مرنے کے بعد بھی اور حیات بعدممات میں بھی اس کی جان نہ چھوڑ سکی......ایسا ہی دہریت کا اظہار ایک دوسرے مقام پر ہے، مہاتما بدھ کی تعلیمات نروان، آواگون اور کرموں کے بھوگ کے فلسفے پر خط تنسیخ پھیر دیتی ہے۔یہی وہ دو مقامات ہیں جن کی روشنی میں کہانی کے مصنف اکیناری، کی نفسیاتی اور دینی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔تنہا، نیم تاریک اور دھندلائی ہوئی زندگی گذارنے والا مفلوک الحال بوڑھا ہر طرف سے ٹوٹ رہا ہے تو ایک دم ہی زندگی کی ساری محرومیاں، جنسی خواہش میں ڈھل کر اس کے دل ودماغ پر مرکوز اور مسلط ہوجاتی ہیں۔اسی سیاق وسباق میں اچانک ہی میرے ذہن میں پروفیسر نیونو کا واکا خیال ابھرا۔یقیناً اس کے اور مانیکو کے درمیان تعلق کی نوعیت وہ نہ ہوگی جو جوسوکی اور اس بیوہ نے قائم کر لئے تھے۔مانیکو تو پروفیسر سے عمر میں بہت چھوٹی تھی اور یہ کہ پروفیسر کی حالت کے پیش نظر کہ وہ اب زیادہ دن زندہ نہ رہیں گے، وہ یہ مکان بھی اپنے نام منتقل کروا چکی تھی۔

ان ہی سوچوں کے تسلسل سے اپنے شوہر کی ناگہانی موت سے ایک رات قبل کا تصور میرے ذہن اور حواسوں پر چھا گیا۔ جب وہ مجھ سے ہمکنار تھا۔ ان ہی خیالوں میں میرا پاؤں رپٹا اور پھسل کر گھٹنوں کے بل گر گئی۔

''ارے دیکھنا سنبھل کر۔'' اندھیرے اور بدحواسی میں میرے کانوں میں ایک مردانہ آواز آئی اور کسی نے لپک کر میرا چھتری والا بازو مضبوطی سے تھام لیا اور مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

''شکریہ، بہت بہت۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''یہاں چاروں طرف بانس ہی بانس ہیں اور کبھی کبھی ان کی جڑیں زمین کے اوپر آتی ہیں۔'' مبہم سی آواز میں بہت دھیرے سے اس نے کہا۔ اور پھر فوراً ہی جھک کر کچھ تلاش کرتے ہوئے بولا۔ ''کوئی چیز تو نہیں گر گئی۔''

اب مجھے محسوس ہوا کہ واقعی میں تو بانسوں سے گھری کھڑی ہوں۔ یہ وہ جگہ تھی جو پروفیسر کے گھر اور اسٹیشن کے درمیان آدھوں آدھ کے فاصلے پر تھی۔ زمیندار کے گھر سے ایک ٹمٹماتی سی روشنی کی کرن بانس جھاڑ کے عقب سے آ رہی تھی۔ لیکن سامنے کی طرف مکمل اندھیرا مجھے اس شخص کا چہرہ قطعی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن چونکہ وہ بے چھتری کے تھا، اور اس کا کوٹ بھیگا بھیگا سا لگ رہا تھا اس لئے میں نے چھتری والا ہاتھ اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا'' آپ چھتری کے نیچے آ جائیں ورنہ بھیگ جائیں گے۔'' میری یہ دعوت اس نے فوراً قبول کر لی۔ اور میری مرضی معلوم کئے بغیر ایک دم مجھ سے بھڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''افوہ بارش کی وجہ سے کتنی سردی ہو گئی ہے۔''

یہ کہتے کہتے بغیر دستانے کے برف کی طرح ٹھنڈے یخ ہاتھ سے اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اگرچہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، لیکن اس کی آواز اور سراپا پھٹیچر اور ادھیڑ عمر لوگوں کی طرح ڈھیلا ڈھالا تھا۔ لیکن میں نے اپنے ہاتھ کے دستانے کے باوجود یہ محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ عورت کے ہاتھ کی طرح ملائم تھا۔ مجھے اس کا ہاتھ بے حد لجلجا لگا۔ مجھے اس ہاتھ کی نرمی سے کراہت سی محسوس ہوئی۔ تاہم نامعلوم سبب سے میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا نہیں۔ اس نے ایک ہاتھ سے چھتری کو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے میرے کندھوں کو جکڑ لیا۔ اور اب میں اس کے بازوؤں کی گرفت میں جکڑی لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ میری ہر لغزش پر وہ مجھے کچھ اور جکڑ لیتا۔ اندھیرے میں بھی میں یہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہ افسردگی سے مسکرا رہا ہے۔

اب مجھے کچھ کچھ شک ہو رہا تھا کہ یہ آدمی پاگل ہے۔لیکن اس خیال کے باوجود میں اس کیفیت سے محفوظ بھی ہو رہی تھی۔ایک مخمور سی غنودگی کے عالم میں لڑکھڑاتی زبان سے میں نے کہا ''پتہ ہے جب میں پھسل کر گری تو اس وقت میں کیا سوچ رہی تھی؟''

میری بات کے جواب میں اس نے مجھے اور بھینچ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

''میں اپنے میاں کے متعلق سوچ رہی تھی۔میرے شوہر کیورے میں ایک ہوائی حملے میں ہلاک ہوئے تھے اور وہ اس وقت بمباری سے پناہ گاہ میں تھے۔اور میں اس وقت اپنے بیٹے کے ساتھ فوجی بارک میں تھی جو اس جگہ سے چار پانچ بلاک کے فاصلے پر تھی۔میں یہی سوچ رہی تھی کہ کیا مرتے وقت ان کے دل میں میرا خیال آیا ہوگا۔چونکہ وہ فوجی تھے اس لئے ان کا کہنا یہی تھا کہ محبت اپنی جگہ ہے اور تنہا مرجانا اپنی جگہ پر۔یہ دو مختلف باتیں ہیں۔لیکن میں ابھی تک یہی معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ کسی عورت سے محبت کرنا پھر تنہا مر جانا دو متضاد باتیں نہیں ہیں۔''

میری بات کا جواب دینے کے بجائے وہ تو مجھ پر ٹوٹ پڑا اور ہر قسم کی دراز دستیوں پر اتر آیا۔میں بوکھلاہٹ کے عالم میں تھی حتیٰ کہ اس نے مجھے دھکیل کر زمین پر گرا دیا۔اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ اس کے پاس سے کسی مریض کی سی چھچھلاندی سی بو آرہی ہے۔بالکل وہی پروفیسر نیونو کا وا کے کمرے والی بو۔اچھا تو یہ شخص پروفیسر نیونو کا وا ہے۔اور اس احساس کے ساتھ ہی میں وحشی کتے کی مانند اچھلی اور چلانا شروع کردیا۔جوسوکی...... یہ جوسوکی ہے...... یہ...... یہ آدمی میں اپنے آپ سے سرگوشیوں میں یہی کچھ کہتی ہوئی بھاگی۔اندھیرے میں جتنی تیزی سے بھاگا جاسکا ہے میں بھاگتی ہی چلی گئی۔

جس وقت میں نے اسٹیشن کے سامنے والی روشن اور منور سڑک پر قدم رکھا تو اس وقت بھی میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔اب تک میں اس ہیولہ کے طلسم خیال میں گرفتار تھی جس کی اندھیرے میں مجھ سے ملاقات ہوئی تھی۔اسی وقت ایک گاڑی اسٹیشن پر آکر کھڑی ہوئی۔ڈبے کے تنگ دروازے میں سے کالے کوٹوں والے تنخواہ دار ملازمین کو اس طرح یکے بعد دیگرے دھکے سے باہر نکالا جارہا تھا جیسے وہ کسی آنے والے لوگوں کے قریب ہی ایک طرف کو کھڑی بڑے غور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔میں نے محسوس کیا کہ یہ سب کے سب مرد ہیں اور ان کو دیکھ کر، میں جو ایک عورت تھی، رشک میں مبتلا تھی۔ساتھ ہی دل بے حد اداس بھی تھا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ ان میں سے ہر ایک مرد کے اندر ایک جوسوکی بستا ہے۔اور اس

بدبخت ہیولے سے کہیں زیادہ جو اس اندھیرے میں میرے گلے پڑ گیا تھا۔ اس خیال کے ساتھ
ہی جیسے میرا خون کھول گیا۔ ساتھ ہی دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی جو راحت آمیز بھی
تھی اور پریشان کن بھی۔

اونو چیو

نیش عشق

جب ایک حادثہ ہو کر گذر گیا اور حالات ایک بار پھر اپنے معمول پر آ گئے، اور ہر طرف ایک بار پھر خاموشی اور سکون کا دور دورہ ہو گیا، تو میرے اندر بے چینی کی نامعلوم سی رو پھیلنے لگی۔ ایک ایسی بے چینی جو دوسروں کے علم میں نہ تھی۔

مجھے اس احساس سے بڑی کوفت تھی اگر ممکن ہوتا تو میں اپنی اس کیفیت کو کسی بھی دوسری شے سے بدل لیتی۔ کاش ایسا ہو سکتا کہ کوئی مجھ سے کچھ بھی لے کر میرے اندر کی بے چینی سے مجھے نجات دلا سکتا۔ بس میں اپنی حالت کے بارے میں یہی کچھ سوچ سکتی تھی۔ اپنی طبیعت کے اس خاموش اضطراب اور وحشت کے احساس سے فرار حاصل کرنے کے لئے میں ہر قسم کی باتیں سوچتی۔ مثلاً ایک ایسا منصوبہ میرے ذہن میں آیا جس پر اگر عمل درآمد ہوتا تو لوگوں کو زبردست صدمہ پہنچا۔ سوال یہ ہے کہ میں اپنی نجات کی متلاشی کیوں تھی۔؟ یہ بتانے کیلئے مجھے سلسلے وار واقعات بیان کرنا پڑیں گے

ایک دن میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ ایک نئے رسالے کے اجرا کے لئے یہ بہترین اور مناسب ترین وقت ہے۔ ہماری اس گفتگو نے ایک بڑا ہی غیر متوقع رخ اختیار کر لیا۔ حالانکہ ایک بالکل ہی مختلف اور نئے انداز کا رسالہ نکالنا اتنا آسان کام نہ تھا۔ میرے میاں نے حیرت سے سوال کیا

''نیا رسالہ؟ مختلف انداز کا رسالہ؟''

''ہاں ہاں بالکل مختلف قسم کا۔ ایک مختصر حجم اور سائز ہو۔ وہ یقیناً بہت مقبول ہوگا۔''

میرے شوہر خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔

''بھئی، اس قسم کے رسالے کی اشاعت ہنسی کھیل نہیں ہے کہ بالکل ہی مختلف بھی ہو او قبول عام بھی حاصل ہو سکے۔'' پھر ایک موقع ایسا بھی آیا کہ میں نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے پیش کر دیا اور یہ میرے لئے ایک چیلنج تھا۔ میرے ساتھ تو معاملہ یہ تھا کہ میں جس احساس کے تحت یہ بیڑا اٹھا رہی تھی، اس میں کسی قسم کی طمع یا مفاد پرستی شامل نہ تھی۔

میرا خیال ہے کہ اس کی ادارت کا فرض نکا تا کو سونپ دیا جائے وہ بالغ نظر اور باشعور ہے اور یقیناً ہمیں یہ پریشانی نہیں ہوگی کہ وہ اپنے خیالات اور نظریات ٹھونسنے اور مسلط کرنے کی کوشش کرے گی۔'' میں نے کہا'' بات یہ ہے کہ رسالے کے سلسلے میں ابھی سے منصوبے اور خیالات میرے دماغ میں ایک کے بعد ایک چلے آ رہے ہیں۔ ایک ہجوم ہے دماغ میں طرح طرح کی تجویزوں کا۔''

اب اس سارے واقعہ کا میں بار بار اپنے ذہن میں اعادہ کرتی ہوں تو میرے بدن میں ایک نا قابل بیان جھرجھری سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس غیر منطقی منصوبے کا انجام کیا ہوا اور کیسے کیسے واقعات اس کے نتیجے میں ظہور میں آئے۔

اب اس منصوبے اور خیال کا جو بھی مقصد ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک بار جو دماغ میں خیال آیا تو یہ معلوم ہوا گویا اس کو پیر لگ گئے۔ وہ خود بخود ایسے چل پڑا جیسے کوئی زندہ مخلوق حرکت میں آ جائے۔ وہ خود ہی اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے۔ میرے میاں کو میری تجویز سے قطعی اتفاق نہ تھا لیکن ان کی اتنی ہمت نہ تھی کہ اس کی مخالفت کرتے۔ وجہ یہ تھی کہ مخالفت کیلئے ایک بالکل ہی مختلف اندازِ فکر اور حوصلہ درکار تھا جس کا تعلق رسالہ جاری کرنے سے قطعی نہ بنتا تھا۔ وہ خاموش رہے اور میں نے اپنی دھن اور جوش و خروش میں ان کی خاموشی کو ان کی رضامندی پر محمول کیا۔

اب جب بیٹھ کر اس ساری بات کے بارے میں سوچتی ہوں۔ تو یوں لگتا ہے کہ اس کو پورے واقعے میں سب سے زیادہ عجیب بات خود میری اپنی نفسیات تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ میں اس فہم اور منصوبے کو اسی شد و مد اور جذباتی انداز میں چلانا چاہتی تھی جس شدت اور جذباتیت سے میرے شوہر اپنے کاموں میں انہماک رکھتے تھے۔ ایک طرح سے میں اپنے منصوبے پر اس جوش و خروش سے عمل درآمد کر کے اس احمق بیوی کی تقلید کر رہی تھی جو اپنے شوہر کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ایک محبوب تلاش کرتی ہے اور اس سے محبت کر کے اپنے شوہر کے جذبہ رشک کو اکسانے

کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ میں نے پاگلوں کی طرح ایک جنوں خیز انداز میں تیاریاں شروع کردیں۔

اب تو ہر روز ہی لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ کبھی کسی کو شہر کے کسی کافی ہاؤس میں، ادارتی معاملات اور اسکیموں پر بات چیت کے لئے بلاتی تو کبھی گرد آلود خاک بستر عقبی گلیوں میں ناجائز وسائل سے یعنی بلیک میں کاغذ خریدتی پھرتی۔ ایسی مصروفیتوں میں لگی لگی بسا اوقات مجھے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ آخر اس تگ و دو کا مقصد کیا ہے۔

میں نے جس شخص کو مشورے کی خاطر مدعو کیا تھا، وہ میرے روبرو بیٹھا تھا اور میں پورے جوش وخروش سے بول رہی تھی۔ ''دیکھیں، بات سنیں، میں تو اس کام کی تکمیل کی خاطر جان کی بازی لگا دوں گی، اپنا سب کچھ قربان کردوں گی۔'' یہ کہتے کہتے میں نے محسوس کیا کہ وہ میری ہما ہمی اور جذباتیت سے کچھ اکھڑا اکھڑا اور بیزار سا نظر آرہا ہے۔ چنانچہ قدرے سنبھل کر میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ''معاف کرنا، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ذمہ داری کا سارا بوجھ آپ پر ڈال دوں۔ بس مجھے تو آپ کی رہنمائی اور مشورہ درکار ہے۔ اس شخص نے کاغذ میز پر پھیلایا اور ٹھہری ہوئی نرم آواز میں مجھے اپنی پلاننگ سمجھانا شروع کی۔ اب عجیب واقعہ ہوا کہ کاغذ پر چلتے ہوئے اس کے بڑے بڑے مضبوط لیکن نفیس ہاتھوں کو دیکھتے دیکھتے میرے لہجہ اور آواز میں جوش وخروش کے بجائے عجیب سی تبدیلی آنے لگی۔ جیسے میں معاملے کی بات نہیں بلکہ اپنے محبوب سے اقرار محبت کررہی ہوں۔ اور اسے چاہ رہی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ کیسے میں اس کے مشورے اور رائے پر انحصار کررہی ہوں۔ اور اس کے خیالات میرے لئے کتنے قیمتی ہیں۔

پھر مجھے روز بروز ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب اگر کوئی شے یا شخص میرے کام میں حائل اور مانع ہو، تو میں اپنے کام کے مقابلے میں اس سے بھی کنارہ کرلوں گی۔ اور اپنے کام اور مقصد ہی کو حاصل حیات بنالوں گی۔ میرا مقصد ایک لحظے کو بھی میرے ذہن سے جدا نہ ہوتا جبکہ کام کے انہماک میں مجھے یہ بھی خیال نہ آتا کہ میرے شوہر کدھر ہیں۔

میری پریشانیوں اور بوکھلاہٹ کے باوجود کام بڑی اچھی طرح چل پڑا تھا اور کمپنی کا اندرونی ماحول بڑا مفاہمانہ تھا۔ جوں جوں کام آگے بڑھ رہا تھا، یہ مفاہمت بھی بڑھ رہی تھی۔ میرا رویہ یہ تھا کہ جس طریقے سے بھی ہو، ترقی اور کامیابی اصل چیز ہے۔ اس سلسلے میں یہ مباحثہ کہ کس کے خیالات اور منصوبے کامیابی کا سبب بنے، اور کس کے خیالات بے سود ثابت

ہوئے۔ بے کار محض تھا۔ اس سوال کی ضرورت اس لئے بھی نہیں محسوس ہو رہی تھی کہ بے اندازہ روپیہ اس میں لگایا جا رہا تھا بلکہ جھونکا جا رہا تھا۔

............................(2)............................

نیا میگزین نکل آیا۔ میگزین سادہ اور چھوٹے سائز کا تھا۔ تاہم یہ پیارا سا رسالہ تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ پڑھا تو جب ہی جائے گا جب وہ لوگوں کی نظروں میں آئے گا اور دیدہ زیب ہوگا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اس سیدھے سادھے رسالے کی فروخت کے سلسلے میں کسی بھی کتابوں کی دکان پر یہ دیکھنے گئی ہوں کہ اس کو نمایاں کرنے کے لئے اسٹالوں پر کس طریقے سے لگایا گیا ہے۔ میری یہ حرکت یعنی بکری اور فروخت کے سلسلے میں عدم تجسس اور دلچسپی نہ لینا رسالے کے اجرا سے قبل کے انہماک اور جوش وخروش کو دیکھتے ہوئے تعجب خیز تھا۔ پھر وہ وقت آیا جب ہمارا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ پہلے دن وہ پریس سے باہر آیا تو لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ قطاروں کی قطاریں پتلے سے زینہ سے لے کر چوتھی منزل تک لگ گئی تھیں۔ یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ عمارت کی چاروں طرف قطاریں تھیں، جو بڑھتے بڑھتے ساتھ والی گلی تک پہنچ گئی تھیں۔

ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو تحفے میں ہمارے لئے تازہ سبزیاں لایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے اپنے کھیت کی سبزی ہے۔ لیکن پھر حالات بہت تیزی سے پلٹے۔ دو سال پہلے اور بات تھی۔ لیکن اب دنیا میں پہلے سے زیادہ خاموشی اور سکون تھا۔ بے شمار رسالے نکل پڑے تھے۔ اب لوگ رسالوں کے لئے اپنے انتخاب اور پسند کو ملحوظ رکھنے لگے تھے۔ اب ان کا انتخاب ہمارا رسالہ نہیں تھا۔ کم وبیش یہی حال دوسرے رسالوں کا بھی تھا۔ اب اگر کوئی نیا رسالہ ایک بہت مختلف گٹ اپ اور منفرد انداز کا بھی نکلتا تو اس کے معروف اور مقبول ہونے میں کافی وقت لگتا۔ اپنے رسالے کے اجرا کے وقت میں نے تو اس نہج پر سوچا ہی نہ تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے۔

اب دو ماہ کے اندر یہ حال ہو گیا تھا کہ رسالے کی ساٹھ فیصد کا پیاں واپس آ جاتی تھیں۔ تاہم ہم نے اشاعت جاری رکھی۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی یہ تھی کہ ہم نے سوچا کہ اس وقت ہمارے منافع کی رقم ٹھوس اثاثے کی حال میں موجود اور محفوظ ہے اور یہ خطرناک منصوبہ اب ایسا بھی اہم نہیں کہ اس کی خاطر کمپنی کے مفادات کو داؤ پر لگا دیا جائے۔ ہمارے خیال میں ابھی مزید اور نئے

تجربے کی گنجائش موجود تھی جس کے ذریعے اس نقصان عظیم کا زخم بھر سکے گا، بلکہ مزید منافع اور اثاثے حاصل ہو سکیں گے۔ اب تو یہ اندازہ اور تخمینہ لگانے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہو رہی تھی، کمپنی کے پاس کس قدر فالتو اور اضافی رقم اس وقت موجود ہے۔ اور یہ کہ جو زخم کاری ہمیں آیا ہے اس گھاؤ کے بھرنے اور مندمل ہونے کا ہمیں کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔

''بہتر تو یہی ہے کہ ہم ناممکنات سے گریز کریں اور مزید ایسے کاموں میں ہاتھ نہ ڈالیں۔ ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے اور ہمارے ادارے کی بھی ایک حد ہے۔'' ایک دن میں نے دوسری منزل کے ایڈیٹنگ روم میں اپنے میاں کو یہ کہتے سنا۔ اس دن میں سٹنگ روم کو نیچے شفٹ کرنے میں مصروف تھی۔ ہماری زندگی میں گھریلو اور کمپنی کے معاملات گڈمڈ ہی رہا کرتے تھے۔ دوسری منزل کے کشادہ کمرے میں آواز بہت گونجتی تھی۔ اور یوں سنائی دیتی تھی جیسے کسی پائپ سے گذر کر ہم تک پہنچ رہی ہو۔ جہاں تک میں سن سکی تھی، وہ اس وقت لفظ ''مقبول'' (پاپولر) کا مطلب بیان کر رہے تھے۔ جو نئے میگزین کے منصوبے کے سلسلے تعلق رکھتا تھا۔ میرے کان میں ان کی بات پڑی تو مجھے یہ خوشی ہوئی کہ چلو انہوں نے بھی کام میں حصہ اور دلچسپی شروع کر دی ہے۔ اور اب بھی جب میں سوچتی ہوں تو مجھے یاد آ جاتا ہے کہ اس احساس سے مجھے کتنا سکون ملا تھا۔ میں نے یہ بات قطعاً بھلا دی تھی کہ میں نے کسی جذبے کے تحت اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈالا تھا۔ میں نے از خود ہی یہ فرض کر لیا کہ وہ بھی میری پریشانیوں اور تفکرات میں برابر کے شریک تھے۔ اس احساس اور مفروضے نے مجھے بیویوں والے مخصوص جذبے کے تحت ایک ناقابل بیان مسرت اور راحت کا احساس دیا۔

زندگی بڑے سکون سے گذر رہی تھی۔ اور ادارے کے کسی فرد کو بھی یہ گمان تھا کہ یہ نیا پروجیکٹ ادارے کے زوال کا باعث بن جائے گا۔ پہلے کی طرح کبھی غروب آفتاب کے بعد اکثر کسی رقص گاہ پر یا پھر پینے پلانے کی غرض سے ہم کسی مے خانے میں چلے جایا کرتے تھے۔ اگر میرے شوہر بھی ہمراہ ہوتے تو بھی مجھے یہ شبہ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی کہ مے خانے، رقص گاہوں میں آنے جانے والی عورتوں میں اس قسم کی عورتیں بھی شامل ہوں گی جو یہ سوچ کر کہ اس کی محبت کرنے والی تو غائب ہے، اس کا دل مٹھی میں لے سکتی ہیں۔

یہ اس سال کا آخری دن تھا۔ یعنی بالکل ہی جنگ کے بعد والے سال کا آخری دن۔ اور اس سے پہلے کبھی کرسمس کا تیوہار اس زور و شور اور دھوم دھام سے نہیں منایا گیا۔ لوگ کرسمس ایسے

والہانہ انداز میں منا رہے تھے کہ جس کو دیوانگی ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اس روز میں بھی خود فراموشی کے عالم میں اپنے آپ کو بھول جانے کے لئے کرسمس کی تیاریوں میں بری طرح مصروف تھی اور یہ ظاہر کرنا چاہ رہی تھی کہ تیوہار کی ساری گہما گہمی میرے اندر اسی طرح اتر آئی ہے جیسے اس بدبخت منحوس رسالے کے اجرا سے قبل ان جانی سی خواہش دل کے نہاں خانے میں اودھم سا مچائے رکھتی تھی۔ ساری تیاریاں کر کے اللہ جانے شیطان نے کیا منتر کان میں پھونک دیا کہ میں سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اف وہ لمحہ آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ کیسی قابل رحم اور اجاڑ شکل نظر آئی تھی اپنی۔ اس خاتون کے تصور کے مقابلے میں جو میرے شوہر کو چاہنے کی دعوے دار تھی اور جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

اس دن سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ کرسمس کے غل غپاڑے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہمارا سفید لکڑی کا دو منزلہ مکان شور و غوغا سے گونج رہا تھا۔ میں کپڑے پہن رہی تھی کہ ایک مخمور سی مردانہ آواز آئی

''کیا تم یہاں ہو؟''

یہ آواز باہر والے کمرے سے آئی تھی۔ چونکہ ہمارے گھر میں کوئی دہلیز نہ تھی اس لئے اندر آنے اور بہار جانے والے کا پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کون آیا کون گیا۔ اور یہی ہوتا تھا کہ اگر کوئی پائیدان پر بھی آ کر کھڑا ہو جاتا تو ہمیں پتہ نہ چلتا کہ کوئی سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ اور اس وقت بھی یہی ہوا کہ کہ اپنے سامنے ایک شخص کو کھڑے دیکھا تو میں اس طرح ٹھٹکی کھڑی رہی۔ دراصل اس وقت دل میں یہی خیال آیا کہ دیکھوں تو مخمور انسان کی نگاہوں کو وہ عورت کیسی لگتی ہے جس کے خاوند نے اس کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ گویا میں اس لمحے اپنے آپ کو آزما رہی تھی۔ اب اس کے سوا اور میں کہہ بھی کیا سکتی ہوں۔ وہ شخص خود بھی اکڑا ہوا سا کھڑا رہ گیا ''کہیں باہر جا رہی ہو؟'' اس نے میری جانب نگاہ اٹھا کر پوچھا۔ اور اس سے نظریں چار ہوتے ہی میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ایک بھولی بسری یاد تازہ ہو گئی...... میں خوشی اور مسرت کے اس لمحے کو آج تک بھول نہیں سکی جو یوں غیر متوقع طور پر اس کو دیکھ لینے سے میرے اندر برقی رو کی طرح دوڑ گیا تھا۔ ''آج تو مجھے ایک ملاقات کرنا ہے، مجھے افسوس ہے۔'' میں نے اسے جواب دیا۔ میرے اندر کی غیر فطری جھجک نے میرے پندار کو ہوا دی تھی۔ میں نے اس شخص سے ایک فاصلہ سا قائم رکھا تھا۔ وہ شخص میری بات سن کر اس وقت باہر نکل گیا۔ اس کی پشت دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسا وہ میرے

ڈوبتے دل کا عکس ہو۔

.......................(3).......................

پہلے تو میں ایک کہانی سناتی ہوں۔ جس کو سوچ کر میں آپ ہی آپ ہنسنے لگتی ہوں۔ یہ کہانی ایک بچھو اور ایک کچھوے کے بارے میں ہے۔ ایک مرتبہ ایک کچھوا دریا پار جا رہا تھا۔ تو ایک بچھو نے اس سے کہا کہ مہربانی سے تم مجھے اپنی پشت پر بٹھا کر دریا پار کرا دو۔ میں پانی میں سفر نہیں کر سکتا۔'' کچھوے نے انکار کر دیا کہ نہیں بھئی مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ جیسے ہی پانی میں پہنچو گے تم ضرور ڈنگ مارو گے۔'' ارے کمال کرتے ہو تم بھی، لو اور سنو، میں ڈنک ماروں گا تو جاؤں گا کہاں؟ تمہارے ساتھ میں بھی پانی میں ڈوب جاؤں گا۔'' بچھو کی باتوں میں آ کر کچھوا راضی ہو گیا اور اس کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر چل پڑا۔ بچھو اپنی عادت سے مجبور تھا۔ کچھو سے کیا ہوا وعدہ پورا جنہ ہو سکا اور ابھی دریا کے بیچ ہی پہنچے تھے کہ ایسا ڈنک مارا کہ پیٹھ کی موٹی کھال کو چھیدتا ہوا پیٹ تک پہنچ گیا۔ ارے ہائے ہائے تم نے مار دیا نہ ڈنک؟ اب تم مجھ کو ڈبو کر ہی دم لو گے اور خود بھی ڈوبو گے۔'' بچھو نے بڑی افسردہ سے آواز میں کہا'' جانتا ہوں پر کیا کروں مارے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے مہربانی سے جس طرح ہو سکے مجھے برداشت کرو۔''

رسالے کی سیل کم ہونے کی وجہ سے چھ مہینے کے اندر ہی اندر ہر شخص نے محسوس کیا کہ رسالہ خسارے میں جا رہا ہے۔ تاہم کوئی شخص اپنی منہ سے یہ کہنا نہیں چاہتا تھا کہ نئے رسالے کو بند کر دیا جائے۔ مزے کی بات یہ تھی جس قدر زیادہ ان کی خواہش تھی کہ یہ بند کر دیا جائے اسی قدر اس بات کا منہ سے نکالنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اگرچہ ہر شخص کو یہ احساس بھی تھا کہ کمپنی کا بظاہر خوشگوار اور پر سکون ماحول کسی آنے والی خطرے کی نشان دہی کر رہا ہے۔ خطرہ جو نامعلوم طور پر کمپنی پر اپنے سائے ڈال رہا تھا۔ اب ہر ایک نے ایک ہی طرز عمل اختیار کر رکھا تھا۔ یعنی سب ہی یہ ظاہر کرتے تھے گویا ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں سوچتی ہوں کہ وہ مجھ سے ڈرتے تھے۔ اسی وجہ سے کسی کی بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ نئے پرچے کی اشاعت کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالے۔ اس لئے کہ ایسی بات کہنا مجھ پر براہ راست حملہ کرنا تھا۔ لیکن دوسروں کی خاموشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا دل بوجھل رہنے لگا۔ عجب سی تاریکی کا احساس تھا جو میرے قلب اور ذہن کو پراگندہ رکھتا تھا۔ دل کی اس کیفیت کا سبب یہ نہ تھا کہ مجھے یہ غم ہو کہ میرا منصوبہ ناکام رہا ہے، بلکہ غم اس بات کا تھا کہ ایک لاحاصل منصوبہ بنا کر محض اس لئے اس کی

کامیابی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی، کہ مجھے اپنے شوہر کے معاشقے کے بارے میں سوچنے کی مہلت نہ ملے۔ یہ کتنی بڑی حماقت تھی۔ اوراب اس حماقت یا قربانی کا دائرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ پوری کمپنی میں میرے سوا اس منصوبے کوختم کر دینے کے بارے میں کسی کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ ایسی کوئی تجویز پیش کر سکے۔ نہ ہی کسی کی ہمت تھی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں نے ایک عزم صمیم اور بڑی صاف گوئی سے کام لے کر رسالے کوختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور واقعی اس اعلان سے مجھے بڑے ہلکے پھلکے ہو جانے کا احساس ہوا۔ اس کے علاوہ کمپنی کے پورے عملے نے بھی میرے اس جرات مندانہ فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔ ہر ایک کی زبان پر یہ بات تھی کہ اس پائے کے رسالے کے اجرا کوختم کر دینے کا فیصلہ کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ آفرین ہے اس پر فیصلے پر۔

اب قصہ یہ ہے کہ اس طرح میری اس فاش غلطی کو سب ہی نے نظر انداز کیا اور میرے رویے پر کسی قسم کی تنقید سے گریز کیا۔ میری غلطیوں کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ میری دل آزاردی کے خیال سے کسی قسم کا تبصرہ نہ ہوا۔ سب کے منہ اور زبانیں بندر ہیں۔

اس واقعہ کے بعد ماحول پر ایک سکون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ لیکن مجھے وہ سکون اور خاموشی طوفان سے پہلے کا سکوت محسوس ہوتی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کیا کیفیت تھی۔ بہر حال یہ خاص قسم کی پریشان کن کیفیت تھی۔ اپنے ہی گھر میں بیٹھے بیٹھے جی چاہنے لگتا تھا کہ خود کو ہواؤں اور طوفانوں کے حوالے کر دوں۔ اور پھر مجھے کچھوے اور بچھو کی کہانی یاد آ جاتی۔

بہت عرصے پہلے کنزا کے مشرقی علاقے میں ایک زمین کا ٹکڑا بکاؤ تھا، جیسا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایسے بہت قطعے اور زمین کوڑیوں کے مول بک رہی تھیں۔ ہم نے بھی کنزا والا ٹکڑا خرید کر ڈال لیا تھا۔ کوئی خاص مقصد تو نہ تھا، بس زمین مل رہی تھی خرید لی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم نے یہاں جست کی چادروں کی دیواروں والی ایک بیرک بطور اسٹور روم کے تعمیر کر لی۔ اس اسٹور روم میں ہم رسالے کا کاغذ اور وہ رسالے جو بک اسٹالوں پر سے واپس آتے تھے، رکھا کرتے تھے۔ لوگوں کو عام طور پر یہ غلط فہمی تھی کہ ایسے وقت میں جب لوگ پیسے پیسے کو ترس رہے ہیں، ہمارے پاس پیسے کی افراط ہے۔ اتنی کہ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ اس کو خرچ کس طرح کیا جائے۔ دلچسپ بات تو یہ تھی کہ ہمیں کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ ہم اس زمین کو کسی بہتر اور بامقصد طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کے جب دنیا کے حالات سنبھلنے

لگے اور بہتری کی صورت پیدا ہوئی تو بھی ہمیں یہ خیال نہ آیا کہ اس کا کچھ کیا جائے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے تھے کہ کمپنی کے پاس پیسے کی اتنی فراوانی ہے کہ یہ لوگ تو اب یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کے پاس کتنے اثاثے اور کتنا پیسہ ہے۔ اور نہ ہی انہیں جاننے کی ضرورت ہے۔ ایک شام گھر واپس جاتے ہوئے میں اس قطعہ کی طرف سے گذری جس کے گرد لکڑی کے ٹکڑوں کو جوڑ کر باڑھ کھڑی کر دی گئی تھی۔ تختوں میں ایک جھری ایسی بھی تھی۔ جس سے ایک روشن اور کھلی ہوئی جگہ بمشکل نظر آ رہی تھی۔ اس میں کھڑی اونچی اونچی گھاس ہوا میں جھوم رہی تھی اور اسی طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ اسی آن میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ یہاں اپنی رہائش کے لئے ایک گھر تعمیر کیا جائے۔ یہ خیال اچانک ہی دل میں آیا اور میرے خیالوں پر چھا گیا۔ اور یہ خواہش اتنی مضبوط ہوگئی کہ اس کو کوئی وقتی خیال وخواب نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ایک گھر جو حقیقت میں گھر جیسا ہی ہو، بنانے اور اس میں رہنے کی خواہش کہ بس وہ ہم دونوں کا گھر ہو، یہ کوئی ایسی نرالی آرزو اور تمنا نہ تھی۔ لیکن میں جس طرح سوچ رہی تھی، اور جس قسم کی ذہنی کیفیت کے تحت یہ آرزو کر رہی تھی وہ بات ہی اور تھی۔

میرے شوہر اکثر اتامی چلے جایا کرتے تھے جہاں ہمارا دوسرا گھر تھا۔ پہلے کی طرح ان دنوں بھی گئے ہوئے تھے بلکہ اب انہوں نے پہلے کے مقابلے میں زیادہ جلدی جلدی جانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے بھی ہمیشہ کی طرح یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ واقعی وہاں اپنا کام کرتے جاتے ہیں یا پھر اپنی محبوبہ کے ساتھ کسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ نہیں میں نے یہ جاننے یا ٹوہ لگانے کی قطعی کوشش نہیں کی، بلکہ یہی ظاہر کرتی رہی کہ واقعی وہ اپنے کام کی خاطر ہی وہاں جا کر رہتے ہیں۔ تاہم جب بھی وہ اتامی والے گھر میں رہنے جاتے، دل میں ایک عجیب سی خلش محسوس ہوتی تھی۔ میں اپنے دل کا حال کسی پر بھی ظاہر نہ کر پاتی تھی۔ کیا بتاؤں اس خلش سے نجات پانے کے لئے میں نے کیسی کیسی دعائیں نہیں مانگیں۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس سے فرار حاصل نہیں کر سکتی۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ اگر ٹوکیو میں ہمارے دفتر کے قریب ہی کوئی بڑا سا کشادہ گھر ہوتا، آرام دہ اور معقول رہائش کے قابل، تو ممکن تھا کہ میرے میاں کو گھر چھوڑ کر اتامی جا کر رہنے کی ضرورت نہ محسوس ہوتی۔ ایک طرح سے میری اس خواہش کی بنیاد یہی تھی کہ میں اپنے میاں کو ان کی چاہنے والی سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح ان کے بار بار اتامی جانے کا عذر موجود نہیں ہوگا پھر وہ اپنی چہیتی کے ہتھے بھی نہ چڑھ سکیں گے۔ حالانکہ بعد

میں احساس ہوا کہ یہ خواہش اور خیال کتنا احمقانہ اور بچگانہ تھا۔

خیر، جیسے ہی یہ خیال آیا اس رات میں نے ان سے اپنے ارادے کا ذکر کیا۔ میرا تو یہی تھا کہ کسی خیال کو لفظ ملے نہیں کہ اس کا منصوبہ چالو ہو جاتا۔ اسکیمیں بننا شروع ہو جاتیں۔ چنانچہ میں نے بڑے ظریفانہ انداز میں کہنا شروع کیا'' ذرا دیکھو تو ہماری حماقت کہ اتنے اچھے آرائشی پلاٹ کو بے کار ڈال رکھا ہے۔'' میں کہتی '' کیا خیال ہے اس سے اچھی موقع کی اور کوئی جگہ ہو سکتی ہے بھلا گھر بنانے کیلئے؟ ایک طرف تو وہ قابو کی تھیٹر سے اتنے نزدیک ہے اور پھر اتنا پرسکون اور ہنگاموں سے محفوظ جیسے کسی پہاڑ کے دامن میں چھپا ہوا ننھا سا جھونپڑا۔ اگر یہ گھر بن گیا تو پھر آپ ٹوکیو میں رہ کر کام کرنے کو ترجیح دیں گے۔ آپ کو گھر چھوڑ کر اتامی جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور پھر یہی تو وقت ہے کہ اب ہم اپنا گھر بنالیں۔

میرے میاں نے گول مول سا جواب دیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ ٹوکیو میں ایک ایسے گھر کی ملکیت کا خیال، جو کشادہ اور آرام دہ ہو، ان کے نزدیک کچھ ایسا خوش کن نہ تھا حالانکہ اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ آفس سے بالکل قریب یعنی کہ ساتھ ہی ہوگا۔ بہر حال خوش ہونا تو ایک طرف وہ سپاٹ سا منہ بنائے بیٹھے سنتے رہے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ ان کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی تھی کہ گھر بار اور رہائش کے سلسلے میں وہ کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے بلکہ ہر بات میری صوابدید پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ لیکن اب جب میں سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ کیسی عجیب عادت تھی ان کی۔ ویسے میرے میاں رہن سہن اور اس کی آسائشوں سے فطرتاً بے نیاز نہ تھے بلکہ جب وہ ان کو پوری طرح فراہم کر دی جاتیں وہ اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے۔ وہ اپنی کسی بھی مسرت کا فوری اظہار کرتے ہی نہ تھے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان کی تو عادت ہے کہ کسی تجویز یا خوش آئندہ منصوبے پر گم صم ہی بیٹھے رہیں گے۔ اپنی رائے دینے سے احتراز کرتے رہیں گے۔

..................(4)........................

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب وہ رسالہ بند کر دیا گیا تھا۔ ایک طرح سے اس کی بات آئی گئی ہو چکی تھی۔ اب اس خالی قطعے کی حد بندی وغیرہ کا کام شروع ہو چکا تھا۔ بارک ڈھا دی گئی تھی۔ پختہ نیویں ڈالی جا رہی تھیں۔ مکان کا ڈھانچہ کھڑا کیا جا چکا تھا۔ ایک ذمہ دار اور باحیثیت شخص کو اس کے نقشہ کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔ امید تو یہی تھی کہ بہت احتیاط اور سوجھ بوجھ

سے تعمیر مکمل ہو جائے گی۔اس وقت اور زمانے کے لحاظ سے بہترین میٹریل ان داخلی خیالات اور باطنی سوچوں کا حصہ تھے اور جو خود بھی آشکارا نہ تھے۔

میں گاہے گاہے موقع پر جاتی رہتی تھی۔اس لئے کہ جانتی تھی کہ آدمی جب اپنی رہائش کی خاطر گھر بنوائے تو پوری دلچسپی اور توجہ بہت ضروری ہوتی ہے ورنہ کوئی کسر ضرور رہ جاتی ہے۔میں برابر وہاں جاتی اور دیکھتی تھی کہ اب عام بیٹھک والا کمرہ مکمل ہو رہا ہے، اب بیڈروم کی باری ہے۔غرض میں ہر موقع ہی پر موجود رہتی تھی۔ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے اپنے میاں کو سائٹ پر چلنے کی دعوت دی۔خزاں کا ایک خوشگوار دن تھا۔وہ ایک ہلکے رنگ کا کوٹ پہنے فرش کے چوبی تختوں پر اڑتے قدموں سے چل رہے تھے۔وہ کاریگروں سے بات چیت بھی کرتے جاتے اور ادھر سے ادھر بھی پھرتے۔ان کے لہجہ اور آواز میں خوشی اور گرم جوشی کا تاثر تھا۔لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا، کہ وہ خود تو آ گئے ہیں، مگر ان کا دل کہیں اور پڑا ہے۔پھر بھی میں اس خیال سے مطمئن اور مسرور تھی کہ چلو آج وہ یہاں آئے تو اور اب اس وقت میرے ساتھ تو ہیں۔ یقین جانئے کہ اس وقت بھول کر بھی دل میں یہ خیال نہ آیا کہ یہ خوشی اور سکون کے یہ لمحات عارضی اور لمحاتی ہیں۔میں تو اس وقت یہ تک بھول گئی تھی کہ یہ سارا بکھیڑا اور تعمیر کا منصوبہ میری محض ایک چال ہے۔ان کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کا ایک طریقہ۔

مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ اس مکان کی تعمیر پر کمپنی کی کتنی رقم لگ چکی ہے۔دیکھنے والے جب کہتے کہ بھائی آج کل اور قیمتی میٹریل گھروں کی تعمیر میں کون لگاتا ہے تو مجھ اس وقت بھی ہوش نہ آیا کہ معلوم تو کروں کہ اس وقت کمپنی کتنے خسارے میں چل رہی ہے۔اور کمپنی کے مالی حالات کن مشکلات سے دوچار ہیں۔بات یہ ہے کہ جس جذبے اور خیال کے تحت اس گھر کی تعمیر کا ولولہ اور امنگ میرے دل میں آئی تھی، اس کے پیش نظر میں اس میں کوئی گھٹیا یا کم قیمت مال لگا ہی نہیں سکتی تھی۔چنانچہ کمپنی کے نفع نقصان کی بات اور معاملہ یوں لگتا تھا جیسے مجھے اس سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔بس میں کچھ خالی الذہن سا محسوس کرتی تھی اپنے آپ کو۔اب اتنا وقت گذرنے پر بھی سوچتی ہوں تو بڑی عجیب حرکت لگتی ہے۔

گھر کب مکمل ہوا؟ سچ پوچھئے تو اب مجھے یاد بھی نہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمارے رفقائے کار نے بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا۔کتابیں اور نہ جانے کیا کچھ تحفوں میں دیا تھا۔میرے خیال میں یہ کچھ ٹھیک بات نہ تھی۔یوں کہ ہم اس گھر میں انبار پرانے فرنیچر تو لائے ہی نہیں تھے بلکہ ہر

ہر کمرے میں نئے گھر کے لئے خاص طور سے ڈیزائن کیا ہوا فرنیچر لگایا گیا تھا۔ اگر چہ سارے کا سارا فرنیچر نہایت نفیس، متانت اور اعلیٰ مذاق کا نمونہ تھا اور بے حد باوقار تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اس میں اپنائیت کا احساس مفقود تھا۔ گھر کے کسی گوشے اور کسی بھی کمرے میں چلے جاؤ۔ عجیب سی اجنبیت اور غیریت کا احساس ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ اپنا گھر ہی نہ ہو جیسے ہم کسی دوسرے کے گھر میں چل رہے ہوں۔

''میں جب اپنے کمرے کے دریچے سے لمبی گھاس پر نظر ڈالتی ہوں تو مجھے اپنے پرانے گھر کے چھوٹے سے لان کی گھاس یاد آ جاتی ہے۔'' میں نے مڑ کر اپنے میاں سے کہا...... ''یاد ہے نا مضافات کا چھوٹا سا گھر جہاں ہم پہلے رہا کرتے تھے، وہاں بھی تو یہ بانس گھاس تھی نا۔ اس کو دیکھ کر کتنا سکون اور اپنائیت محسوس ہو رہی ہے۔'' لیکن وہ خوشی جو اپنے فریق حیات کے ساتھ نئے گھر میں زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کرنے سے ہوئی، وہ دیرپا نہ تھی۔ میری تو آرزو اور تمنا صرف اور صرف یہ تھی کہ اپنے میاں کو سکون اور راحت کا ماحول مہیا کر سکوں اور ان کے ساتھ اس گھر میں رہ کر اپنی زندگی بتا سکوں......اور میری خوشی کی انتہا اور کیا ہو سکتی تھی سوائے اس کے کہ میں اپنے نئے گھر میں اپنے شوہر کی رفاقت میں زندگی گذار سکوں۔ لیکن شاید یہ طمانیت اور مسرت میرا مقدر نہ تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تقدیر کیا چال چل رہی ہے اور اس گھر سے نکلتے ہی نئے گھر میں کسی جال میں پھنس جاؤں گی۔

........................(5)........................

یہ تو اس شہر کا شروع ہی سے دستور تھا کہ ہمارے مخصوص ساز شامی سین کے تین تاروں سے نکلنے والے سروں کے سوا یہاں کسی دوسرے ساز کی صدا سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہاں اس زمانے سے یہ شہر گیشا گھروں اور ریستورانوں سے پٹا پڑا تھا۔ چونکہ اس جگہ جہاں ہم نے اپنا نیا گھر بنایا تھا، مکمل خاموشی رہتی تھی اور آس پاس کسی قسم کا شور شغب نہ تھا اس لئے گیشا گھروں کی کھلی کھڑکی سے باہر آنے والی ہر آواز واضح طور پر صاف سنائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ ہم ان کے کسی گاہک کی باتیں بھی بہت صاف سن لیا کرتے۔ شروع شروع میں یہ باتیں ہمارے لئے بالکل نئی اور دلچسپ تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ یہ ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن گئیں۔ ظاہر ہے میں نے نیا گھر شہر

کے اس بارونق اور رنگ رلیوں سے معمور علاقے ہی میں خود بنایا تھا۔ بنانے سے پہلے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید ہماری وہ غیر معمولی نفسیات تھی کہ جو خیال آ گیا سو آ گیا۔ نہ آ گا دیکھنا اور نہ پیچھا...... ہمارے نئے گھر کا اور دفتر کا درمیانی فاصلہ اندازاً کوئی دو سو گز ہوگا۔ اور ہم میاں بیوی کا دستور تھا کہ یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرتے تھے۔ ہمارے کام کے اوقات مختلف تھے۔ اس لئے آمدورفت کے اوقات بھی جدا جدا تھے۔ بہرحال دفتر اور گھر تک کے درمیانی فاصلے کو شہر کے بیچ سے گذر کر طے کرنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھار ہم اکٹھے ہی نکلتے اور راستہ میں بازار کی رونق اور دکانوں کی سجاوٹ دیکھتے بھالتے، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے، گھر آتے۔ میں اور میرے شوہر دونوں اپنی اپنی اسٹڈیز میں الگ تھلگ بیٹھ کر کام کرتے۔ اور کام سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے لئے نکل جاتے۔ گھر اور دفتر کے الگ الگ ہو جانے کی وجہ سے ہماری زندگیوں میں باقدگی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ تبدیلی وقتی طور پر ہی آئی تھی...... ابھی چند ہی ماہ ایسے گذرے تھے۔ وہ تبدیلی جس کا اندر ہی اندر ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ ایک دن میرے میاں گھر نہیں لوٹے اور مجھے کچھ بتائے بغیر ہی غائب ہو گئے۔ اگلے اور اس اگلے دن بھی گھر نہ آئے۔

اسی دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اس گھر کی تعمیر میں ایک سلیقہ اور اہتمام یہ بھی تھا کہ میں تنہا اس گھر میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرسکوں۔ یعنی میری اسٹڈیز دوسری منزل کی مشرقی سمت میں تھی۔ اس کے ساتھ ہی مغربی طرز کی خوابگاہ تھی۔ جب تک کہ مطالعہ کا کمرہ مقفل رہا۔ کوئی بھی خواب گاہ میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اتنا وسیع اور کشادہ تھا کہ فرنیچر کے باوجود خالی خالی ہی نظر آتا تھا۔ جب میں اس کمرے میں داخل ہوتی تھی تو کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ میں کب اندر آئی اور کدھر ہوں۔ بہرحال اس دن جب میں اس کمرے میں جس ذہنی کرب اور اذیت کے عالم میں داخل ہوئی، اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا۔ میں حسد اور جذباتی دباؤ کے جس کرب سے گذر رہی تھی، میں ہی جانتی تھی۔ یہ وہی درد تھا جو ہمہ وقت میرے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اس کو میں نے نہ جانے کب سے اپنے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ اب جو مجھے اس درد سے محبت ہو گئی تھی، یہ مجھے بہت پیارا تھا۔ میں اپنے داغوں کے گلستاں کی بڑی احتیاط سے پرورش کر رہی تھی۔ اس کو آبیاری اپنے ان آنسوؤں سے کرتی تھی جن کو بہانا اب مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔

ہماری کتابوں کی الماریاں خواب گاہ کی دیواروں میں دیوار دوز انداز میں بنی تھیں۔ اس دن جب میں بے دھیانی میں کھڑی الماری سے کتابیں نکال نکال کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ تو کسی

چیز کے فرش پر گرنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ میں نے جھک کر دیکھا تو ایک چھوٹے سائز کی تصویر تھی۔

اس وقت میرا کیا حال تھا اور دل ودماغ پر کیا بیت رہی تھی۔ اس کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ یہ ایک معمولی سی نوجوان عورت کی تصویر تھی جس میں کوئی خاص قابل ذکر بات نظر نہ آتی تھی۔ لیکن پہلی ہی نظر میں میں نے سوچا کہ یہ میرے میاں کی چہیتی محبوبہ ہے۔ جس کسی نے مجھے اس کا حلیہ اور صورت شکل بتائی تھی اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے بال بہت لمبے ہیں۔ جنہیں وہ سرخ رنگ سے رنگ کر پیچھے کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس تصویر کا چہرہ دیکھتے ہی میں سمجھ گئی کہ یہی وہ عورت مسکراتی ہوئی۔ جاپانی طرز پر بنے ہوئے بال چہرے پر ناز ونخرے کی عشوہ طرازی فی الفور ہی میرے جذبات میں ایک تغیر سا آ گیا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہی وہ عورت ہے جو اس لمحہ سے پہلے تک میرے جذبہ رقابت کا ہدف تھی اور جس کے خیال اور تصور نے مجھے کرب واذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ میں رقابت کے جذبے میں اتنی اندھی ہو رہی تھی کہ اس کے بالوں کی رنگت اس کے حلیہ کی رنگت تک پر غور کرنے سے خوف زدہ تھی۔ پھر اچانک اس کا مسکراتا ہوا چہرہ مجھے نہایت من موہنا اور پیارا محسوس ہوا۔ اس چہرے پر ایسی نرمی اور معصومیت تھی کہ اس نے میرا دل ہی چھین لیا۔ اس چہرے کو غور سے دیکھنے پر اس کی رنگت بھی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ تصویر تو ایک نظر ہی میں دل میں کھب کر رہ گئی۔ جیسے مجھے سکون آ گیا۔ اب اگر میں اس کا سبب اور اپنی کفیت بیان کرنے بیٹھوں تو شاید یہی کہوں گی کہ میں نے سوچا

''اچھا تو یہ ہے وہ جس نے میرے شوہر کو مجھ سے چھین لیا۔'' لیکن یہ بات تو میں مان ہی نہیں سکتی۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ کوئی یہ کہے کہ اس نے مجھ کو میرے خاوند سے چھین لیا ہے۔ خیر جو کچھ بھی ہو، اب میں کہتی ہوں کہ میرے لئے یہ لمحہ آگہی اور انکشاف کا لمحہ تھا۔ یعنی یہی وہ لمحہ تھا جب مجھ پر اپنے خاوند کے معاملات محبت کا انکشاف ہوا کہ آخر وہ کیا سبب تھا کہ انہوں نے مجھے نظر انداز کیا اور اس جھولی میں گر گئے۔ اور اس آگہی کے ساتھ ہی میں بالکل شانت ہوگئی۔ اب میرے دل میں کسی قسم کی کوئی خلش باقی نہ تھی۔ میں قطعی پرسکون اور ٹھیک ٹھاک تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ اچھا اس عورت سے جل رہی تھی؟ صرف ایک خاوند کی خاطر میں ایک لمحہ پہلے رقابت اور رشک میں مبتلا تھی۔ پر اب کہاں غائب ہو گیا وہ جذبہ رقابت، چشمک اور حسد سب کہاں غائب ہو گئے؟ کچھ پتہ نہ چل پا رہا تھا۔

..................................(6)........................

سہ پہر کا وقت تھا۔ میرے شوہر کے واپس آنے کے تین دن بعد کی بات ہے۔ میں اپنے دفتر کا زینہ چڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ملازمت اور کسی کام سے لگے ہونا عورت کی بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے۔ اسے مصروفیت میں اتنا بھی یاد نہیں رہتا کہ اس کے سات کبھی کوئی ایسا واقعہ بھی پیش آیا۔ آفس کا زینہ طے کر کے میں اوپر پہنچی، صدر دروازے کے ساتھ ہی غسل خانہ اور بیٹھک والا کمرہ تھا۔ وہی جہاں ہم اب سے کچھ عرصے پہلے رہا کرتے تھے۔ اب میں اس کو از سرِ نو ٹھیک ٹھاک کروا رہی تھی۔ ہمرا خیال تھا کہ اس کو کتابوں کی دکان میں تبدیل کر دیا جائے۔ چونکہ ہماری یہ جگہ گنڈا کے بارونق علاقے کے عین وسط میں تھی اس لئے خیال تھا کہ بازار کے رخ ایک بہت بڑی کھڑکی رکھی جائے۔ جس کے شیشوں کی سجاوٹ اور ساماں نیچے بازار میں نمایاں طور پر نظر آ جائے گی۔ چنانچہ میں نے کام کرنے والے کاریگروں کو ہدایت دی کہ دیکھنا کھڑکی خوب بڑی رکھنا اور بہتر تو یہ ہوگا کہ بازار سے دیکھنے والوں کو پورا اسٹور ہی ایک فراخ اور کشادہ دریچہ نظر آئے۔ یہ کہتی ہوئی میں اوپر چلی گئی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایڈیٹر کی میز پر شوہر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے کچھ کر رہے ہیں۔ ان کے پیٹھ میری طرف تھی۔ میرے شوہر مڑے تو ان کے منہ سے نکلا'' آہا'' وہ تھوڑا سا مسکرا دیئے۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ بات کرنے سے پہلے مسکرا دیتے ہیں۔ مجھے یہ مسکراتا چہرہ بہت پیارا لگتا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا، کہ ایک دم ان کے قریب جا کر ان کو بتاؤں کہ اتنے دن ان کے انتظار میں کتنی بے قرار رہی ہوں۔ میں تو واقعی سب کہہ گذرتی لیکن اس وقت ایک دم منہ کھول کر بولنا بکنا شروع کر دینا ممکن نہ تھا۔ میں اس بات کو اہمیت نہیں دے رہی تھی کہ وہ کئی راتوں سے غائب تھا۔ ایسی کوئی بات نہ تھی مجھے ان کی اس تین دن کی غیر حاضری کا ملال نہ تھا جو یقیناً انہوں نے اپنی محبوبہ کے ساتھ ہی گذار دیئے تھے۔ دراصل میں نے تو اپنا وہ منصب ہی ختم کر دیا تھا جس پر قائم رہ کر میں نے ان کی محبوبہ کے خلاف محاذ بنایا تھا۔ اور وہاں ڈٹ کر اپنے شوہر کے حصول کی جنگ لڑتی رہی تھی۔ خاموش جنگ۔ مگر اب گویا میں ہتھیار ڈال چکی تھی۔ شاید دوسرے تو یہ بات سمجھ نہ پائیں لیکن میرا دل خوب جانتا تھا کہ ایک مقام پر آ کر میں نے کس طرح راستہ بدل دیا تھا۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب بہت عرصے پہلے ہم

دونوں نے پہلے پہل ایک ہوجانے کے بارے میں بات کی تھی۔ ہم نے اس وقت بہت سی باتوں اور امکانات پر غور ہی نہ کیا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت ہماری عمریں آج کی طرح بالغ اور پختہ نہ تھیں اور ہم نے نوعمری کی بنا پر یہ فیصلہ آنکھیں بند کر کے ہی کیا تھا۔ یعنی اس وقت ہم نے عمر کے اس فرق کو جو ہمارے درمیان موجود تھا، کوئی اہمیت دی ہی نہیں تھی۔ خیر میں یہ نہیں کہتی کہ عام جوڑوں کے مقابلے میں ہماری عمروں کا فرق بہت ہی کم تھا۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ تھوڑا سوچا ضرور تھا لیکن کبھی اس حد تک سوچنے کی عادی تھی ہی نہیں کہ مستقبل بعید میں رونما ہونے والے امکانات پر اس وقت سوچتی اور پریشان ہوتی۔ اب یہ تھا کہ ہمارے درمیان میاں بیوی کا جو تعلق قائم ہوا وہ اب تک بڑا فطری اور نارمل رہا تھا اور اس طرح ہماری زندگی بھرپور تھی۔ اور ہم دونوں میں سے کوئی بھی آگے چل کر آنے والی تبدیلیوں اور صورت حال کے بارے میں متفکر نہ تھا۔ یہ وہ باتیں تھیں کہ اگر ہم ان کے بارے میں کچھ عرصے پہلے سوچ بچار کر لیتے تو آج اس کلفت اور کرب کا سامنا نہ ہوتا۔ اور ان نتائج کا کچھ تو سدباب ہوسکتا تھا جو آج درپیش تھے۔ اب شکایت کروں بھی تو کس سے۔ اور کہوں تو کیا کہوں۔ میرے سدا کی عادت ہے کہ ایسے حالات میں یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتی ہوں کہ یہ میرا ہی کیا دھرا ہے۔ میں نے اپنے خیالات کو مرتب کرنے کو سلیقہ بھی سیکھ لیا تھا۔ بحیثیت ایک عورت کے یہ میری لغزشوں اور بغیر سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے آگ میں کود جانے کا آخری تجربہ تھا۔ اور تلخ ترین بھی۔

''ہم یہ تصویر تو استعمال کر نہیں سکتے۔ اس کو بجائے کوئی اور تصویر نہیں جسے ہم استعمال کر سکیں۔''

میرے شوہر نے جب یہ بات کہی تو نہ تو وہ مجھ سے مخاطب تھے اور نہ ہی کسی اور سے۔ بس منہ اٹھا کر ایک بات کہہ دی۔ سرورق پر لگنے والی تصویر کے انتخاب کا یہ آخری روز تھا۔ میں بغیر کسی جھجک کے ان کے قریب جا کھڑا ہوئی۔ ان کے پاس سے اسی صابن کی ہلکی ہلکی سی خوشبو آ رہی تھی جو وہ ہمیشہ استعمال کرتے تھے۔ یہ اس دن کی بات ہے جب ایسا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا تھا اور سہ پہر کا وقت، ہم دونوں اکٹھے قریب بیٹھے میگزین کے لئے کام کر رہے تھے۔

اچانک ہی ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے مہارے ازدواجی مسائل کو ایک ہی ہلے میں مٹا دیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ بہتری ہی ہو کہ یہ بالکل عین وقت پر رونما ہوا۔ مجھے اس کا احساس بھی بعد میں ہوا۔ ہوا یوں کہ نیچے زینے پر مجھے بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

اوپر چڑھنے کی آوازوں کے علاوہ ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی معاملے پر بحث کر رہے ہوں اور الجھ رہے ہوں۔ تعداد میں آنے والے چودہ پندرہ تھے۔ ان کے بات کرنے کا انداز حاکمانہ تھا۔ لگتا تھا کہ اگرچہ ان کا تعلق پولیس سے تو نہیں ہے، تاہم وہ کسی اہم منصب اور شعبہ سے متعلق با اختیار لوگ ہیں۔ تب ہی اس قدر تحکم اور تکبر سے بات کر رہے ہیں۔ وہ ایک ساتھ ہی اکاؤنٹس کے کمرے میں آندھی کی طرح داخل ہوئے جو دفتر کے آخری سرے پر تھا۔ انہوں نے آن واحد میں ایک ایک چیز اور کاغذات اپنے قبضہ میں لے کر اپنے بریف کیسوں میں ٹھونسنا شروع کر دیئے۔ کاغذ کی ایک چندی بھی باقی نہ چھوڑی۔ حد یہ کہ رسید بک سے پھاڑ کر ایک ضائع کئے ہوئے ردی کاغذ پر بھی جھپٹا مار کر اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اسی پر بس نہیں کیا۔ انہوں نے لڑکیوں کے دستی بیگوں کی بھی تلاشی لینا شروع کر دی، جو بے حد بوکھلا رہی تھی کوئی ادھ ردی کے بکس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان میں سے ایک نے کڑک کر حکم دیا ''اندر سے کوئی باہر نہ جائے۔'' پھر انہوں نے کمپنی کے اہلکاروں اور ممبروں کی جیبوں سے چھوٹی نوٹ بکیں بھی نکلوا لیں۔ تقریباً دو تین گھنٹے تک انہوں نے دفتر کی تلاشی لی اور چل دیئے۔

اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا۔ اب ہم نے اندازہ لگانا شروع کیا کہ آخر یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا۔ ابھی اپنے اپنے اندازے بیان ہی ہو رہے تھے کہ سیلز کے سیکشن میں کسی کی آواز سنائی ''میرے خیال میں مناسب یہ ہے کہ آپ ڈائریکٹر صاحبان اپنے اپنے گھروں سے دور رہیں۔'' دراصل اس شخص کو ڈر تھا کہ ہم لوگ جو کمپنی کے حسابات وغیرہ کا کوئی علم نہیں رکھتے۔ تفتیش اور سوال و جواب کا سامنا نہ کر پائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی ویسی بات سے منہ سے نکل جائے جو کمپنی کی تباہی کا سامان بن جائے۔ یہ حقیقت تھی کہ ہم میں سے کسی کو کمپنی کے سرمائے، موجودہ اثاثوں اور اخراجات کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ دراصل یہ اتنی خوبی اور خوش اسلوبی سے چلایا جا رہا تھا کہ ہمیں کبھی اس کے سلسلے میں جاننے یا پوچھ گچھ کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ بالفاظ دیگر ہم اس تمام افتدا کے بارے میں نہ تو کوئی فیصلہ کرنے کے اہل تھے نہ ہم اس ناگہانی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ سوچ پا رہے تھے۔

رات کے اندھیرے میں ہم لوگ دفتر سے نکلے۔ ہمارے ہمراہ کمپنی کے تمام ارکان بھی تھے۔ آفس سے نکل کر ہم یوٹسویا کے ایک ہوٹل میں جمع ہو گئے جہاں ٹیلی فون کے ذریعہ پہلے ہی بکنگ کروا لی گئی تھی۔

................................(7)................................

یہ اس واقعے کے کوئی دو تین ماہ بعد کی بات ہے جب ہم پر اس ناگہانی چھاپے کی اصل حقیقت آشکار ہوئی۔ یہ کہنا تو اب بے سود ہی ہے کہ ہم اپنا کام پل صراط سے گذر کر چلا رہے تھے۔ ایک خط کے نتیجے میں کمپنی کے مالی حالات کی چھان بین اور تفتیش شروع ہوئی۔ کمپنی کے خلاف ایک ثبوت کے بعد دوسرا ثبوت فراہم کیا جاتا رہا۔ اس طرح کمپنی پر بہت بڑی جعل سازی کے شبہ میں مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ یہ جعلسازی ٹیکس کے سلسلے میں بیان کی گئی تھی۔ ہم بری طرح پھنس گئے تھے۔ تب اس وقت مجھے اس شخص کی بات بھی یاد آئی اور صورت بھی جس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ آپ کا یہ نفع اندوزی کا طریقہ دیرپا نہیں ہے۔ دیرپا ہو ہی نہیں سکتا۔ بات یہ ہے کہ جب حالات ٹھیک ہوں گے۔ دنیا اپنے ڈھرے کی طرف واپس آئے گی تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نتائج سے بے فکر ہو کر نہایت لاپروائی اور لاابدلی پن سے اپنا کام چلاتے رہے تھے۔ اور اس قسم کے کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہی چلے جا رہے تھے۔ جو خود بخود ٹیکس چوری اور جعل سازی کا ثبوت پر ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ آخر کس طرح پیشہ پانی کی طرح بہتا رہا اتنا کہ لوگوں کو متوجہ کرنے لگا اور ان کو جعل سازی اور فریب وہی شبہ ہونے لگا۔ دراصل اخراجات کے اس بے حد وحساب سلسلے میں سب سے بڑی ذمہ داری میری ہی بنتی تھی کہ میں اندھا دھند پیسہ بہاتی چلی جا رہی تھی۔ اور اب شدید ذہنی کرب سے گذرنے کے علاوہ ہراساں بھی تھی۔

جب انسان کسی ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے تو ہوش بھی آ جاتا اور سنجیدگی اور متانت بھی آ جاتی ہے۔ سب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے تو اس ہوٹل کے وسیع اور عریض کمرے میں ہم دونوں میاں بیوی ہی رہ گئے۔ ہمیں یہاں دو تین روز رہنا تھا، بلکہ ایسا بھی ممکن تھا کہ کچھ زیادہ مدت قیام کرنا پڑ جائے۔ ایک اجنبی جگہ پر اتنے دن ٹھہرنا وہ بھی ایسی صورت میں کہ ہمارا گھر یہاں سے کچھ دور نہ تھا، عجیب سا لگ رہا تھا۔ ''اچھا پھر میں ایسا کیوں نہ کروں کہ نہا لوں۔'' میرے میاں نے کہا اور کمرے کے ساتھ والے غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

میرے کانوں میں پانی کے چھپ چھپ گرنے اور نہانے کی آواز آرہی تھی۔ بہت عرصے پہلے کی بات ہے، میں متعدد بار اپنے شوہر کے ساتھ ایسے ہی ہوٹلوں میں ٹھہری تھی۔ مجھے خیال آیا کہ آج میاں بیوی کی حیثیت سے اس ہوٹل میں قیام کرنے والا ہمارا یہ جوڑا اس پرانے جوڑے سے کوئی مناسبت اور مشابہت نہیں رکھتا۔ اور خصوصاً اب ایسے وقت میں جبکہ ہم یہاں ایک طرح سے دبکے اور چھپے بیٹھے ہیں۔ ایک ناگہانی آفت نے ہمیں یہاں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہمارے درمیان کسی قسم کے رومانی جذبے اور رویہ کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔

اس کمرے میں ہم اپنے بستروں پر پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ برآمدے میں کھلنے والے کاغذی دروازے کی مدہم سی سفیدی نظر آتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ جس ناگہانی حادثے نے ہمیں جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہی سوچ اس وقت ہم دونوں کے ذہنوں میں موجود تھی۔ خوف اور وہموں کی آتی جاتی لہروں کے بین بین ایک اور جذبہ بھی تھا، جو میرے اندر سر آٹھا رہا تھا۔ اور حقیقت یہ تھی کہ آج مدتوں کے بعد ہم دونوں اپنے گھر کے بجائے ایک اجنبی ہوٹل میں ذہن اور خیال کی ایک ہی رو کے دباؤ اور اثر کے تحت پہلو بہ پہلو ایک ہی بستر پر لیٹے تھے۔ احساس اور خیال کی ہم آہنگی، کی یہی ایک ڈور تھی جس نے آج کی شب ایک ٹوٹے ہوئے تعلق اور رشتے کو جوڑ دیا تھا۔ اپنے اندر کی ہراسانی اور دہشت کے باوجود میں اس خیال سے مسرور تھی۔

ان تین دنوں کے سارے واقعات میرے دماغ میں فلم کی طرح چل رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں ان کو بتادوں کہ کل رات میں کس کرب سے دوچار رہی ہوں۔ اور وہ رات کس قیامت کی تھی جو مجھ پر سے گذر گئی۔ اس سے بڑی مسرت میرے لئے اور کیا ہوسکتی تھی کہ میں اپنا حال دل آپ کو سنا رہی ہوں۔ یہ ایک عجب لمحہ تھا۔ تب اسی آن میرے میاں نے غیر متوقع طور پر کہا ''سنو! اگر حالات راہ پر نہیں آتے تو ہمارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ ہم کمپنی سے الگ ہوجائیں۔ کیوں کیا خیال ہے؟'' فوری طور پر میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ یہی بات تو میں ان سے کہنا چاہتی تھی، لگتا تھا کہ کسی نے میرے خیال کو ان کے دماغ میں منتقل کر دیا ہے۔ خوف کی ایک لہر تھی جو بیک وقت ہم دونوں کے اندر دوڑتی تھی۔ اور خوف ہی نے ہم دونوں کے جسموں کو ایک دوسرے سے متصل کر دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح لپٹے ہوئے تھے جیسے

دوڑرے ہوئے جانور۔بس میں ان سے یہی تو کہنا چاہتی تھی کہ ''ضروری نہیں ہر وقت تم مجھے چھپائے رکھو، اپنی جان کے ساتھ لگائے رکھو، لیکن کبھی کبھی اسی طرح میرے پہلو بہ پہلو لیٹ تو جایا کرو۔'' شادی شدہ زندگی میں یہی پہلا موقع تھا، جب آنسو بہہ بہہ کر میرے گالوں کو تر کر رہے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ آنسوؤں کی یہ روانی کسی بات کا جواز فراہم کر رہی ہے۔

تومی اوکا تائیکو

وہ سلسلہ کوہ کے مقابل کھڑے ہیں

کہنے میں تو بڑا اچھا لگتا ہے کہ وہ یاماتو کے صوبے سے آیا ہے۔ لیکن یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ صوبہ تھا کس طرف۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بھی آ کی اور ہٹاچی کی طرح کوئی دورافتادہ صوبہ ہے۔ اچھا مزے کی بات یہ ہے کہ وہ آدمی جو یہ کہتا تھا کہ یاماتو سے آیا اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ یہ صوبہ روئے زمین پر کہیں واقع بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال یہ ہے یہ کہ ایک شخص کہیں سے آیا ضرور تھا۔

وہ جب ہمارے گاؤں میں آیا تو اس وقت گاؤں کی آبادی چند گھروں پر مشتمل تھی۔ وہ بھی اس انداز میں کہ یہاں وہاں دریا کے کنارے کے ساتھ اور آس پاس اکا دکا گھر نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ دریا کے کنارے کنارے نرسلوں کے جھاڑ کھڑے نظر آتے تھے۔ یہ بڑا اور طویل دریا سمندر کے قریب ہی بہتا تھا اور اس کی متعدد شاخیں چشموں کی صورت میں ادھر ادھر بہہ رہی تھیں اور اس طرح ہمارے گاؤں کا نقشہ کچھ ایسا بن گیا تھا کہ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ یہ گاؤں کئی جزیروں پر مشتمل ہے۔

خیر اب تو وہ جوانی کی منزل سے گذر چکا ہے۔ لیکن جب وہ اس اجنبی اور ان جان علاقے میں آیا تھا تو اس کی عمر تیس سال بھی نہ تھی۔ وہ اپنا وقت اس اجنبی جگہ پر گذارنے کی خاطر ہر دم مصروف رہنا چاہتا تھا۔ جب وہ اس گاؤں میں نیا نیا آیا تھا تو اس نے گاؤں کی عورتوں کی دیکھا دیکھی دریا میں چھلانگ لگا کر گلم مچھلی پکڑنا شروع کی۔ وہ گلم کو پکڑ کر اس کے خول میں سے مچھلی

کے بچے نکال نکال کر ساتھ والے گاؤں لے جا کر بیچ دیا کرتا تھا۔ چونکہ وہ گاؤں کی عورتوں کے مقابلے میں زیادہ پھرتی اور کثرت سے گلم پکڑ لیتا تھا اور زیادہ پھرتی سے بچے نکال کر بیچ آتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہی کام اس کا مستقل ذریعہ معاش بن گیا۔

جب وہ اپنے اس کام میں مصروف ہوتا تو ایک عجیب بات بھی دیکھا کرتا تھا۔ یعنی ایک کشتی میں لدی ہوئی گندی میلی ٹاٹ کی بوریوں کے انبار دریا پار آتے جاتے نظر آتے تھے۔ پھر یہ کشتی لکڑی کے بنے ہوئے ایک مال گودام کے قریب آ کر ٹھہر جایا کرتی اور اس پر سے بوریاں اتار اتار کر گودام میں ڈھیر کر دی جاتی تھیں۔

دریا کنارے بیٹھے بیٹھے وہ بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا، کہ ٹاٹ کی بوریوں کشتی سے اتاری جارہی ہیں۔ پھٹی پرانی بوریوں کے بنڈل کے بنڈل اتارے جاتے اور گودام میں پہنچ کر غائب ہوجاتے۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اندر جانے کے بعد ان پر کیا گذرتی ہے اور کہاں جاتی ہیں۔ ہر روز ایک کشتی آخر گودام کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوجاتی۔ ٹاٹ کی بوریاں اتر اتر کر گودام میں پہنچ جاتیں۔ آگے کیا ہوتا اس کا اندازہ وہ نہ کر پاتا تھا۔ بس ایک تختہ گودام سے لگا کر کشتی تک ڈال دیا جاتا تھا۔ اور گاؤں کے سیدھے سادھے نوجوان بڑی ہوشیاری اور چابکدستی سے ٹاٹ کی بوریوں کے بنڈل اپنے کندھوں پر لادلاد کر گودام تک لے جاتے اور ٹھونس ٹھونس کر گودام بھر دیتے۔ اس آدمی کو شک تھا کہ ضرور ان بوریوں کو چھپایا جاتا ہے اور پھر یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ورنہ تو روزانہ اتنی بوریوں کے انبار ٹھونسے جاتے ہی رہتے تو اس میں نئے بنڈلوں کی گنجائش کہاں رہتی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر چپ چاپ بیٹھا اپنے مقابل والے کنارے پر بنے گودام کو وہ تکا کرتا۔ البتہ دل میں ایک کھوج سی لگی رہتی تھی کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ یہ بوریاں کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں۔

وہ گلم مچھلیاں پکڑ پکڑ کر اور بیچ بیچ کر اکتا گیا تھا۔ مگر پیٹ بھی تو ساتھ لگا تھا سو اسی دھندے سے بھر لیتا۔ یہاں اس انجان اجنبی کے لئے اور کوئی کام کیا رکھا تھا جو وہ کر لیتا۔ بس مچھلیاں اور بیچ آیا اور پھر تمام دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہا۔ کبھی کبھار گاؤں کے راستے پر کوئی ریڑھی چلانا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر خود ہی خیال آجاتا مگر چلاؤں گا کیسے ایک گھوڑا تک تو خریدنے کی استطاعت ہے نہیں۔ چھوڑ ریڑھی وہڑی کون چلاسکتا ہے۔ بس اپنے ہی ہاتھ پیر ہیں اور اپنا ہی بل بوتا جسے چلاسکتا ہوں۔ آخر یہ گاؤں کے اور لڑکے بھی تو ہیں کیا پھرتی دکھاتے ہیں کشتی سے

اتارا تار کر بوریوں کے بنڈل گودام تک پہنچاتے ہیں۔ چلو پھر ہم بھی کیوں نہ اپنے ہاتھ پیر آزما لیں۔

دریا کے کنارے بیٹھے بیٹھے بوریوں کے بنڈل تختے کے ذریعہ گودام تک لے جانے والے مزدوروں کا تماشہ دیکھنا بہت آسان تھا۔ لگتا تھا بھلا یہ بھی کوئی کام ہے۔ بنڈل اٹھایا کندھے پر لادا اور اس پار گدام میں جا پہنچایا۔ مگر جب خود کر کے دیکھا تو پتہ چلا کہ کتنی مشقت تھی اس میں۔ اور پھر اجرت اتنی کہ ایک پیالہ ساکی کا بھی شام کو نہ خرید پائیں۔ چنانچہ وہ گودام کے مالک کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اس کے علاوہ اگر کوئی اور کام ہو تو وہ کرنے کو تیار ہے۔ مالک نے کہا: اچھا تم ایسا کرو کہ کل صبح اٹھتے ہی یہاں پہنچ جاؤ۔

اگلے دن منہ اندھیرے ہی وہ گودام کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس وقت اسے اپنے سوا وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا تھا۔ سورج کی کرنیں سمندر کی مخالف سمت سے طلوع ہو رہی تھیں۔ وہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ مالک کچھ ہی دیر میں بیدار ہو کر باہر آ جائے گا۔ پھر گودام کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور مالک نے اسے آواز دی ''اندر آ جاؤ۔'' وہ اندر چلا گیا تو اس نے حکم دیا بوریاں لے جا کر دریا کے کنارے کنارے لگا دو۔ اس کا کام وہ پھٹی پرانی بھیگی اور سیلی ہوئی بوریاں لے جا کر دریا کے کنارے کنارے لگانا تھا۔ اسے حکم دیا گیا تھا کہ انہیں کانچ کے برتنوں کی طرح بڑی احتیاط سے اٹھانا ہے۔ وہ ان کو احتیاط سے اٹھا اٹھا کر دریا کے کنارے پر برابر قطار سے رکھنے لگا۔ ایک ایک بنڈل کو کھول کھول کر دریا کنارے بچھاتے بچھاتے دن چڑھ آیا۔ سورج سر پر آ گیا اور اب بوریاں بچھتے بچھتے گودام سے بہت دور تک چلی گئی تھیں۔ اس نے وہیں سے کھڑے ہو کر اونچی آواز میں سوال کیا

''ابھی اور آگے تک لے جاؤں؟''

''بس ٹھیک ہے یہیں تک رہنے دو۔ اچھا اب ایسا کرو کہ تم کچھ کھا پی آؤ۔ واپس آ کر انہیں واپس ان کی جگہ پر رکھ دینا لیکن اتنا خیال رکھنا کہ اب تک جہاں تک بوریاں پھیلا کر کھڑے ہو اس سرے سے نہیں بلکہ گودام والے سرے سے اٹھانا شروع کر دینا۔'' جب وہ کام ختم کر کے جانے لگا تو مالک نے تاکید کی ''ہاں صبح سویرے پھر آ جانا۔ مگر یہ خیال رہے اگر دھوپ نکلی ہو تو آنا ورنہ نہیں۔ تمہاری اجرت پورا کام ختم کرنے کے بعد ملے گی۔'' یہ کہتا ہوا مالک واپس گودام میں چلا گیا۔ اس نے پھر وہیں سے اونچی آواز میں سوال کیا۔ کل تک کام ختم کرنا ہے نا؟ کل تو ختم ہو

جائے گا نا کام؟'' مالک بولا ''اس کا فیصلہ کام ختم کرنے بعد ہوگا۔''

ابھی سورج طلوع ہونے میں دیر تھی۔اور وہ گودام کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا کہ آج بھی دھوپ نکلے گی۔ کچھ دیر بعد مشرق میں سورج کی کرنیں چمکنے لگیں۔تو مالک گودام سے نکل کر باہر آ گیا۔'' دیکھو انہیں دریا کے کنارے بیٹھ کر دھو دھو کر دھوپ میں پھیلاتے جاؤ جیسے کل پھیلائی تھیں۔'' ''موسم تو آج بھی اچھا ہے۔'' اچھا دیکھو، یہ سوکھ جائیں تو ان کے بنڈل باندھ لینا۔اس طرح جیسے کل کیا تھا۔مزدوری اور نیا کام اس وقت ملے گا جب یہ ختم کرلو گے۔''

کمر کمر پانی میں کھڑے کھڑے اس نے ٹاٹ کی بوریاں دھو دھو کر انہیں دریا کے کنارے کنارے پھیلا دیا۔ پھر ان کو سکھا سکھا کر ان کے دوبارہ بنڈل تیار کیے۔کام کرتے کرتے شام ہوگئی اور اتنا اندھیرا چھا گیا کہ اب اسے نہ تو دریا نظر آ رہا تھا نہ بوریاں اور نہ ہی مالک کا چہرہ۔کام ختم کرنے کے بعد مالک نے اسے معقول مزدوری دی۔اور کہا بھئی کل پھر آ جانا۔آ جاؤ گے نا۔ چونکہ مزدوری اس کے توقع سے زیادہ تھی۔اس نے فوراً حامی بھر لی اور چلتے چلتے پوچھ لیا آپ ان بوریوں کا کیا کریں گے؟''

''سوسا۔استرکاری۔'' مالک کا مطلب کچی دیواروں میں ٹاٹ یا بھوسہ ملا کر لپائی سے تھا، کہ اس طرح کچی دیواریں مضبوط اور پختہ ہو جاتی ہیں۔اس وضاحت کے باوجود اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ یہ ''سوسا'' کیا بلا ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ اب وہ سوسا کے اس بیوپاری کا کارندہ بن گیا۔ پیٹ بھر روٹی اور پیالہ بھر شراب کے پیچھے چھوڑ کر وہ پائی پائی بچا لیتا۔دراصل اب وہ خود بوریاں خریدنے کی فکر میں تھا۔دو سال اس گہرے پانی میں کھڑے ہو کر بوریاں دھوئیں۔سوکھنے کو دھوپ میں پھیلائیں۔اس تمام مشقت کی کمائی جوڑ جوڑ کر وہ اس قابل ہو ہی گیا کہ خود بوریوں خرید لے۔لیکن مالک کی طرح ساری کی ساری بوریاں اس نے سوسا میں نہیں جھونک دیں۔ بلکہ بوریوں کا معائنہ کر کے پھٹی پرانی بوریاں تو سوسا والوں کے ہاتھ بیچ دیتا اور اچھی اچھی ثابت بوریاں علیحدہ فروخت کر دیتا۔ اس طرح کا دہرا کاروبار چل پڑا۔

وہ جب یہاں آیا تھا تو اس وقت اس کی عمر قریب قریب انتیس سال تھی اور اب اس کو اس گاؤں میں رہتے تین سال ہو گئے تھے۔اس سے پہلے اس کو تھوڑا بہت خالی وقت مل جاتا تھا۔مگر اب تو اس کو وقت ہی نہ ملتا تھا۔ ہاں اب وہ شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ

شادی کا خیال ظاہر کرتا تو گاؤں کے لوگ اس کے بارے میں پوچھ گچھ کر دیتے۔ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور اس سوال کا اس کے پاس ایک ہی احمقانہ جواب تھا۔ یاماتو سے آیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مصوبے کا نام بھول گیا تھا۔ ذہن پر زور ڈالنے سے اتنا تو یاد آ گیا کہ وہ کون سا پہاڑ تھا جو اپنے بچپن میں دیکھتا رہا تھا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے میں تو کسی کوہستانی صوبے میں پیدا ہوا تھا۔ کمر تک پانی میں کھڑے کھڑے سوچنے لگتا۔ لیکن اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ پاتا۔ آیا اس کے ماں باپ تھے بھی کہ نہیں؟ بھائی بہن عزیز کسی کے بارے میں کوئی یادداشت سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ نہ ہی کسی اور کو اس کے بارے میں کچھ معلوم تھا۔

اپنی رہائش کا اس نے یہ انتظام کیا تھا کہ وہیں دریا کے قریب لکڑی کا ایک مختصر سا گودام لے لیا تھا۔ اس وقت وہ تن تنہا رہتا تھا۔ اب اس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ اور جیسا کہ اس نے سوسا کے بیوپاری سے سیکھا تھا: پہلے ٹاٹ کی بوریوں کو دھو کر سکھاتا، پھر ان کے بنڈل بنا بنا کر بیچ ڈالتا۔ وہ سوسا کے بیوپاری کا ذیلی ٹھیکیدار بن چکا تھا۔ عام طور سے وہ گاؤں والوں سے ربط ضبط نہیں رکھتا تھا۔ اکثر اس کو یہ بھی خیال آتا کہ شاید اس گاؤں میں کوئی عورت ہے ہی نہیں۔ شراب کی بچت سے جمع کی ہوئی رقم جیب میں ڈال کر وہ سارے گاؤں کا چکر لگاتا تو اسے ساری کی ساری عورتیں گرہستن نظر آتیں، اپنے اپنے چولہا چکی میں مصروف۔ تو واقعی کیا اس گاؤں میں کوئی گشتی کوئی طواف ہے ہی نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑوس میں جانا پڑے گا۔ اس کیلئے کچھ اور پیسہ جمع کرنا ہوگا۔ پڑوس سے اس کا مطلب ساتھ والا گاؤں تھا۔ دراصل ایک مرتبہ اس نے بوریاں لاد کر تختے کے ذریعہ دریا پار کرنے والے ایک مزدور سے ہی یہ بات سنی تھی کہ ساتھ والے گاؤں میں بڑی طوائفیں ہیں۔ اب اسے مزید پیسہ آ جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دن وہ ساتھ والے گاؤں میں چل پڑا ''چلو دیکھتے ہیں شاید اتنے ہی میں کام بن جائے۔'' ساتھ والا گاؤں،، جنگی جہاز،، کے نام سے مشہور تھا، جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ ایک بہت بڑا جہاز بندرگاہ کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس قصبے میں متعدد ہوٹل تھے۔ جو طوائفوں سے بھرے پڑے تھے۔ اس کو جو پہلا ہوٹل نظر آیا وہ اسی میں جا گھسا۔ اس نے اپنی رقم دکھا کر کہا کہ یہ رقم ہے میرے پاس مجھے ایک عورت چاہئے۔ اس کی بات سن کر ایک چالیس سالہ عورت آ کھڑی ہوئی۔ اور بولی

''اتنے پیسے پوری رات کے لئے کافی نہیں۔ خیر پھر بھی دیکھ لیتے ہیں...... چلو اندر تو چلو...... مگر تم ہو کہاں کے رہنے والے؟ پہلے تو کبھی ہم نے دیکھا نہیں تمہیں۔'' ''پڑوس سے آیا

ہوں۔'' وہ بولا۔

''کیا کہا، تم نے ارے کہیں ڈین پو گاؤں سے تو نہیں آئے ہو۔''

''ہاں................ ہاں اسی گاؤں سے آیا ہوں۔''

''اچھا خیر، جہاں سے بھی آئے ہو۔ پر اگلی دفعہ آنا تو کچھ سوچ کر آنا اتنے کم پیسے لے کر نہ آجانا۔ کچھ حوصلہ بھی کیا کرو۔ خرچہ کرنا سیکھو۔'' یہ کہتی ہوئی وہ اس کو اوپر بالا خانے پر لے گئی جہاں بستر لگا ہوا تھا۔

''دریا کے بالائی دہانے پر ایک فیکٹری کام کر رہی ہے۔'' یہ بات اس نے ایک نوجوان سے سنی جو بڑی مسرت سے کہہ رہا تھا۔ ''ایک نئی فیکٹری چالو ہوگئی ہے۔'' اس نے نوجوان سے سوال بھی کیا کہ یہ ہے کس چیز کا کارخانہ۔ وہ بنا کیا رہے ہیں۔ آخر؟ کارخانہ تو پٹ سن سے ملبوسات تیار کرنے کا ہے۔ میرے خیال میں پٹ سن کا دھاگہ تیار کر کے اس سے کپڑا تیار کرتے اور اس سے ملبوسات بنائے جاتے ہیں۔'' اس شخص کو تعجب ہوا کہ وہاں آخر عورتوں کا کیا کام؟ وہاں تو عورتیں ہی عورتیں بھری ہوئی ہیں۔

''یہ سوال تو تم ان ہی سے کرنا بھئی۔'' نوجوان ہنس پڑا۔ پھر اس کی ہمت ہی نہ پڑی کہ دوبارہ اس گاؤں جائے۔ اس کی مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو اس کو اتنا وقت بھی نہ ملتا تھا کہ نرسل کی جھاڑیوں کی درمیان بیٹھ سکے یا پہلے کی طرح پانی کا نظارہ ہی کر سکے۔ اب تو مدت سے اس نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا تھا نہ ڈوبتے۔ اب تو عرصے سے اس نے گاؤں کے گھروں کے درمیان چلنا پھرنا بھی چھوڑ دیا۔ گاؤں کے لوگوں سے سلام دعا کی نوبت بھی نہ آتی تھی۔ بس ایک خوف سا سما گیا تھا۔ اس پر فرصت اور فراغت سے اس پر عجیب وحشت سی طاری ہو جاتی تھی۔ فارغ ہو کر بیٹھنے سے لگتا تھا کہ فالتو وقت اس پر چڑھ بیٹھے گا۔ اسے چاروں خانے چت کر کے گردن سے پکڑے گا۔ دراصل اس کی نظر کا محور اور دائرہ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے تو فقط دریا کی موجوں کی روانی، نرسلوں کی جھاڑ اور آسمان ہی کا نظارہ کیا تھا۔ وہ سوچتا: اب اگر آگے کچھ فالتو وقت مل گیا تو پھر نہ جانے کیا کیا دیکھنے میں آئے۔ کیسی کیسی آوازیں کانوں میں پڑیں۔ فراغت کے نام سے اسے وحشت ہوتی تھی جیسے فراغت اس کی جان ہی تو لے لے گی۔
ایک دن اس نے ایک نوجوان سے جو دریا اور گودام کے درمیان لگے تختے پر سے گزر رہا ہے پوچھا ''یہ جو پٹ سن کے ملبوسات کا کارخانہ ہے نہ یہ بھلا یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''ارے بھائی دور ہے یا نزدیک خود جا کر کیوں نہیں پتہ کر لیتے۔'' وہ آدمی اتنی زور زور سے ہنسا کہ لکڑی کا تختہ ہلنے لگا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اسی سوسا کے بیوپاری کے ملازم تھے۔اس زمانے میں جب وہ نیا نیا گاؤں میں آیا تھا۔ پھر یہ نوجوان ہنستے ہوئے کہنے لگے''بات سنو۔ کارخانہ تو دور ہے۔لیکن اگر تمہارا مطلب عورتوں کا پتہ کرنا ہے تو وہ بہت قریب ہی مل جائیں گی۔'' وہ سب کے سب پھر قہقہے لگانے لگے۔''اچھا۔تو وہاں تقریباً کتنی عورتیں ہوں گی؟'' اس نے ان سے پھر سوال کیا۔

''کتنی.....'' وہ لوگ ہنسی سے بے تاب ہو کر کہنے لگے

''لو اور سنو پوچھ رہے ہیں کتنی؟''

وہ شخص تو حیران ہوتا رہا کہ آخر یہ اتنی عورتیں فیکٹری میں کرتی کیا ہیں۔'' پر اس بات کا اس کو جواب نہ ملا۔ آخر میں ایک نوجوان نے کہا'' کپڑا کاتتی یا بنتی رہتی ہوں گی۔'' اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنا سارا جمع جتھہ اکٹھا کیا اور دریا کے بالائی رخ پر فیکٹری کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر فیکٹری سے کافی فاصلے پر کھڑا ہو کر دیکھتا رہا۔اور سوچتا رہا، آخر یہ اندر جو عورتیں ہیں وہ کیسی لگتی ہوں گی؟ اور وہ کیا معاوضہ لیتی ہوں گی؟ اور وہ ہوں گی کہاں کی رہنے والیاں؟ دریا کنارے وہ تن کھڑا تھا۔ایسے بے شمار سوالات دل میں چھپائے۔

دریا کنارے عموماً تند و تیز ہوائیں چلا کرتی تھیں۔لیکن اس کے پاس ہوا سے بچاؤ والی کوئی چیز مثلاً چھتری یا کوٹ وغیرہ بھی نہ تھا۔دریا کنارے نرسل کے علاوہ کئی اور پودے بھی اگتے تھے۔مثلاً چرواہے کا کھیسہ جیسے پھولوں کے پودے۔ان تمام پودوں اور جھاڑیوں کے درمیان وہ کھڑا تھا۔ بالکل تنہا جیسے انہیں کے درمیان سے اگا ہو یا کوئی اسے یہاں پیدائش کے بعد ڈال گیا ہو۔اب تک اس نے اپنی زندگی کس طرح گذار دی اور آئندہ اسے زندگی کیسے گذارنا ہے۔اس قسم کے سوالات کا اس کے دماغ میں گذر ہی نہ ہوا تھا۔اور اب اس وقت وہ کھڑا ہوا ان عورتوں کے کارخانے سے باہر آنے کا منتظر تھا۔اور جو خیال مستقل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا وہ یہی تھا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ بس یہی حقیقت تھی کہ دریا کنارے محنت مشقت سے روزی کمائے اور دریا کنارے بیٹھ کر کھانا کھائے۔اور اسی دریا کے کنارے کھڑا عورتوں کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہے۔شاید یہی اس کی تمام زندگی کے تجربے کا نچوڑ اور انتہا تھی۔موسم خوشگوار تھا،لیکن وہ ہوا کی سردی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

چند عورتیں فیکٹری کے پہلو سے برآمد ہوئیں۔ ان کے پیچھے درجنوں اور بھی باہر نکل پڑیں۔ یقیناً دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہو گیا تھا۔ سیاہ کیمونو میں ملبوس خواتین کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کالی کالی چیزیں ہوں۔ پھر یہ کالی کالی چیزیں دریا پر جا کر اپنے ہاتھ دھونے لگیں۔ پھر ان کالی کالی چیزوں نے اپنے کیمونو کے پائنچے چڑھا کر اپنی ٹانگیں اور پیر دھونا شروع کر دیئے۔

''چلو ٹھیک ہے کل دریا پار جا کر دیکھتے ہیں۔'' وہ سوچنے لگا۔

اگلے دن وہ فیکٹری کی طرف دریا پار پہنچا، تا کہ ان کو قریب سے دیکھے۔ یہ عورتیں نزدیک سے دیکھنے پر جنگی جہاز گاؤں والی عورتوں کی بہ نسبت زیادہ کم عمر اور جوان نظر آ رہی تھیں۔ ان میں اکثریت لڑکیوں کی تھی اور ان میں بعض تو بالکل بچیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ جس وقت وہ کارخانے سے باہر آئی تھیں تو ان کے چہرے سیاہ ہو رہے تھے۔ وہ سب کی سب دریا کے کنارے پر بیٹھ گئی تھیں۔ نہیں معلوم ان کے چہرے پیدائشی کالے تھے یا پھر کسی بیماری کے باعث سیاہ پڑ گئے تھے۔ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اور دور سے کیا نزدیک سے بھی کوئی اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔

یہاں کوئی ایسی آڑ یا اوٹ تو تھی نہیں جس کی آڑ میں وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ ان کو دیکھنے اور ان ہی سے ملنے آیا تھا وہ ایک دم ہی ان کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق ان کی تعداد چالیس یا پچاس ہو گئی۔ یکایک اس کا جی چاہا کہ بھاگ کر دریا پار چلا جائے۔ لیکن اس طرح تو وہ اور بھی نمایاں ہو جائے گا اور ان سب کی توجہ اسی کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ کھڑا رہا، ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر۔ ایک دم پودوں کی سرسراہٹ کی آواز آئی اور اس کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی کالی سی لڑکی نمودار ہوئی۔ اس لڑکی نے سامنے آ کر اس سے کہا

''تمہیں فیکٹری میں کوئی کام ہے تو اندر جانے کا راستہ یہ نہیں ہے اس طرف ہے؟''

''نہیں۔ مجھے تو وہاں کوئی کام نہیں۔''

''تو پھر یہاں اس طرح مت کھڑے ہو۔'' اس نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اس لئے کہ ہمارا مالک بہت سخت طبیعت کا آدمی ہے۔''

''میرے پاس پیسہ ہے۔'' وہ بولا۔

''پیسہ۔ کیا کہا۔ پیسہ؟''

''بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ اس پیسے سے......''

''سنا تم یہ جنگی جہاز گاؤں نہیں ہے۔''لڑکی نے اس کی بات کاٹ دی۔''اچھا اگر روپے کی ضرورت نہیں ہے......تو ......تو...... کیا کس چیز سے۔'' وہ ابھی تک دوسری جانب ہی نظریں جمائے کھڑا تھا۔

جواب میں لڑکی بھاگ گئی۔ دوسری طرف بیٹھی باقی عورتیں بھی کارخانے میں چلی گئیں۔ اور وہ ایک عجیب اضطراب اور بدحواسی کے عالم میں، جیسے کوئی خواب میں چلے، کپڑوں سمیت پانی میں کود گیا۔

وہ عورتیں ایک کالے جھتے کی صورت میں کھڑی اس لڑکی کو آوازیں دے رہی تھیں۔ ''اوتانی سان۔اوتانی سان۔''اس لئے وہ سمجھ گیا کہ کالی رنگت اور چھوٹے قد والی اس لڑکی کا نام اوتانی سان ہے۔

کوئی چار پانچ دن گذرے تھے اس واقعے کو کہ اوتانی سان نے اس سے پوچھا''ارے بھئی تم ہر وقت یہاں کیوں اور کس واسطے کھڑے رہتے ہو؟''

''میں ڈین بوگاؤں میں سوسا کی تجارت کرتا ہوں۔''اس کے جواب میں لڑکی نے کہا کہ ڈین بوگاؤں تو یہ بھی ہے۔''اچھا خیر'' وہ بولا۔''جو بھی ہو۔اگر پیسہ سے کام نہ بنے تو پھر تم سے شادی کرنے اور تمہیں بیوی بنانے کا کیا طریقہ ہے؟'' وہ جملہ بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔ جسے کہنے کی وہ چار پانچ دن سے ہمت کر رہا تھا۔

''شادی! بیوی بنانا چاہتے ہو؟ ہاں خیر جنگی جہاز گاؤں جانے سے تو یہ بہتر ہی ہوگا۔'' اوتانی سان نے کہا۔

اچھا تو یہ صاحبہ بھی جنگی جہاز گاؤں جاتی رہی ہیں۔اس نے دل میں سوچا۔اسی وقت وہ بھی بول پڑی۔''میں بھی سوچ رہی ہوں جنگی جہاز گاؤں جانے کے لئے یہاں ہم سب ہی باری باری وہاں جایا کرتی ہیں۔وجہ یہ ہے کہ کبھی بیمار ویمار پڑ جائیں تو پھر جانا ہی پڑتا ہے۔وہاں ذرا کھانا پینا اچھا مل جاتا ہے۔وہ بھی گاہک کے خرچے پر۔''اس نے یہ بات اس وثوق سے کہی تھی گویا وہ اپنے تجربے سے کہہ رہی ہو۔

''ابھی میری عمر سولہ سال ہے، لیکن اب اس قابل ہو چکی ہوں کہ اس گاؤں جا سکوں۔'' عورت نے اپنے حسابوں بہت فخریہ کہا۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ تو اس کو اس قسم کا اچھا اور اعلیٰ درجے کا کھانا کھلا نہیں سکتا جیسا کہ

جنگی جہاز گاؤں کے کسی طعام خانے میں کوئی گاہک کبھی کبھار کسی عورت کو کھلا دیتا ہے۔ خیر کچھ پیسے تو میں نے ساکی کے، پینا چھوڑ کر جمع کر ہی لئے ہیں۔ وہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ بولی

''اگر تم مجھے ایک بار اچھا سا کھانا کھلا دو تو میں تمہاری بیوی بننے کو تیار ہوں۔'' وہ دونوں شام کے دھند لکے میں لب دریا کھڑے تھے۔ اندھیرے جھک آئے تھے۔ اب ان کو ایک دوسرے کی شکلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ''میں تمہیں کبھی کبھار اچھا کھانا کھلا دیا کروں گا۔'' یہ کہتے کہتے اس نے سوچا چلو کچھ دن ساکی اور نہیں پیوں گا۔ بلا اسے اکیلا تو نہیں رہنا پڑے گا۔

عورت اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

..............................(2)..............................

اوتانی سان اپنے شوہر کو تسونی یان کہہ کر بلاتی تھی۔ دراصل اس آدمی کا نام تسونی کیچی تھا۔ اپنی شادی کے ڈیڑھ سال کے بعد ایک دن اوتانی سان نے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ''یہ بتاؤ تم کتنی بار جنگی جہاز گاؤں گئے ہو؟''

''صرف ایک مرتبہ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر یہ سچ ہے کہ صرف ایک بار ہی گئے ہو تو پھر تو ٹھیک ہے۔'' اصل میں اب وہ امید سے تھی۔ اور اس کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اس نے جیوٹ فیکٹری میں کام کرنے والی عورتوں سے سن رکھا تھا کہ اگر کبھی تمہارے مرد نے شادی سے پہلے کسی ایسی عورت سے تعلق پیدا کیا ہو جس کا بچہ ضائع ہو چکا ہے یا معذور پیدا ہوا ہو، تو پھر تمہارا بچہ بھی ضائع ہو جائے گا۔ اس کی پیدائش نارمل نہیں ہو گی۔ اور اوتانی سان سوچا کرتی تھی کہ اگر فرض کرو کہ بچہ زندہ پیدا ہو بھی گیا اور نارمل نہ ہوا تو پھر میں خود ہی اس کو دریا میں ڈبو دوں گی۔

اوتانی سان اب تسونی یان کے ساتھ اس کے گودام میں رہنے لگی تھی۔ اب تک اس کا چہرہ کالا تھا۔ اور گاؤں کے لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ جو بھوسہ بیچنے والا تسونی یان ہے نا اس نے کالی عورت سے شادی کر رکھی ہے۔ اور یہ کالی رنگت والی اوتانی سان ابھی تک سیاہی مائل نیلے رنگ کا کیمونو پہنتی ہے۔ اور اس طرح سر سے پیر تک کالی ہی نظر آتی تھی۔ اگرچہ ہر روز دریا میں تیرتی اور نہاتی تھی لیکن جو چیز کالی ہے وہ تو کالی ہی رہے گی۔ گاؤں والے اکثر آپس میں کھسر پھسر کیا

کرتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ بھئی کالا تو کالا ہی رہے گا چاہے تم اس کو سو سا صاف کرنے والے تیزاب میں ہی ڈبو کر کیوں نہ نکال لو۔ یہ بات وہ لوگ اس لئے کہتے تھے کہ وہ اب ٹاٹ کی بوریوں صاف کرنے کے لئے تیزاب استعمال کرتے تھے۔

گودام میں منتقل ہو جانے کے بعد اس اوتانی سان کا ایک ہی ڈھرا تھا۔یعنی پہلے دریا پر جا کر تسونی یان کے ساتھ کام کرنا اور پھر جب وہ بوریوں کو سکھانے میں مصروف ہوتا تو وہ گھر میں بیٹھ کر چاول ابالنا۔ چاول کا تو یہ تھا کہ جتنا چاہے چاول سیر ہو کر کھا سکتی تھی کہ یہاں فیکٹری کی طرح راشن بندی تو نہ تھی کہ مقرر مقدار سے زیادہ نہ کھا سکتی۔لیکن عمدہ قسم کا کھانا یا کوئی اچھی چیز میسر نہ تھی۔ خیر اوتانی سان کو اس کمی کی شکایت بھی نہ تھی۔ نہ شکوہ نہ شکایت وہ راضی برضا رہتی تھی۔اس کا شوہر جو کہتا وہی کرتی۔اگر کسی دن وہ اس کو کوئی ہدایت نہ دیتا تو وہ تمام دن ہاتھ پر ہاتھ رکھے گودام میں بیٹھی رہتی۔اور کام بھی کبھی کبھار ہی نکلتا تھا۔مثلاً کبھی تسونی یان کی موٹے کپڑے کی جیکٹ پھٹ جاتی تو اس کی مرمت کر دیتی۔لیکن سینا پرونا اسے پسند نہ تھا۔اور نہ ہی اس کے پاس سلائی کے لئے فالتو کپڑے ہوتے تھے۔اوتانی سان گاؤں کے لوگوں سے میل جول نہیں رکھتی تھی۔ گاؤں والوں کا کہنا تھا کہ تسونی سان کی بیوی کا مغز چلا ہوا ہے۔وہ یہ بات یوں کہتے تھے کہ اس نے اپنی لاپروائی سے ایک دن آگ لگا دی تھی جس سے تقریباً آدھا گودام جل گیا تھا۔آگ کا سن کر گاؤں والے بھاگے آئے تو دیکھا کہ وہ بت بنی بیٹھی ہے۔لیکن تسونی یان نے اس کو کبھی کسی کام پر جھڑکا نہ ڈانٹا۔

ایک دن اوتانی سان نے اپنے خاوند سے کہا کہ ''میرے بچہ ہونے والا ہے۔اگر یہ بچہ ٹھیک نہ ہوا تو میں اس معذور ناقص بچے کو بالکل نہیں پالوں گی۔دریا میں بہادوں گی۔'' لیکن اس کے یہاں ٹھیک ٹھاک اور تندرست بچہ پیدا ہوا۔ یہ لڑکا تھا۔اگلے برس ایک اور لڑکا پیدا ہو گیا۔ دونوں بچوں کی رنگت کالی تھی۔

اس گاؤں کے لوگ کھیتی باڑی کرنے والے دہقانی نہ تھے۔ بلکہ کچھ چھوٹے موٹے بیوپاری تھے۔ کچھ ملاحی کا پیشہ کرتے تھے۔ کچھ لدو گھوڑے رکھتے تھے اور مال برداری کا کام کرتے تھے۔بقیہ کچھ لوگ جیوٹ کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔کچھ کیا بہت لوگ ایسے بھی تھے جو اجرت پر مزدوریاں کرتے تھے۔ان کی زندگیوں میں دہقانوں کی زندگی کی سی یکسانیت اور ہم آہنگی نہ تھی۔ ہر کسی کا اپنا اپنا طرز زیست تھا۔ یہاں کی آبادی کا بھی یہی حساب کتاب تھا۔زیادہ

تر آبادی کا حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو مقامی نہ تھے بلکہ یہاں وہاں سے آ کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ سب کے سب وہ لوگ تھے جن کی زمینیں کسی نہ کسی سبب سے یا تو قابل کاشت نہ رہی تھیں۔ یا ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تھیں۔ یقیناً اوتانی سان کے والدین بھی ایسے ہی آبادکار تھے جو یہاں آ کر بس گئے تھے۔ جن دنوں وہ جیوٹ فیکٹری میں تکلے پر کام کر رہی تھی وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ یعنی باپ کے مرنے کے بعد اس کی ماں ایک نوجوان ملاح کے ساتھ نکل گئی۔ اوتانی سان کبھی اپنے ماں باپ کا ذکر ہی نہ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے کبھی تسونی یان سے بھی اس کے بارے میں بات نہیں کی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ کسی نے بھی اوتانی سان کبھی اپنے بارے میں یا اپنے والدین کے بارے میں کچھ کہتے سنا ہی نہ تھا۔ بجز ایک بوڑی دائی کے جس نے اس کے بچوں کی پیدائش میں اس کی مدد کی تھی۔ اوتانی سان نے اس کو بتایا تھا کہ میری ماں کے یہاں بھی پہلا بیٹا ہوا تھا۔

اوتانی سان اگر کم گو تھی تو اس کا خاوند بھی خاموش طبع تھا۔ وہ بے مقصد بات ہی نہ کرتا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ وہ دونوں ہی خاموشی کے عادی ہو گئے تھے۔ تنہائی میں زندگی گذارتے گذارتے ان کی یہ عادت ہی بن گئی تھی۔ ایک سبب یہ تھا کہ وہ محنت مشقت میں اتنے مصروف رہے تھے کہ کسی سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ البتہ ایک بات تھی کہ تسونی یان اکثر منہ ہی منہ میں اپنے آپ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ یا تو سچ مچ ہی وہ باتیں کرتا تھا یا لوگوں کو شک ہوتا تھا۔ اس لئے کہ وہاں کوئی بات کرنے والا موجود ہوتا نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی۔ اب یہ بھی کوئی بات تھی کہ کسی جوان جہان آدمی کے بارے میں کہہ دیا جائے کہ وہ پانی سے، دریا کی لہروں سے، پودے اور جھاڑیوں سے باتیں کر رہا ہے۔ لیکن یہ بات تھی ضرور کہ ٹاٹ کو بور یئے سکھاتے سکھاتے وہ دریا کے کنارے کھڑے پودوں سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ کبھی کسی چیز کے بارے میں کبھی کسی کے بارے میں۔ ضروری تھا کہ ایسے ہی اکیلے بیٹھ کر یا تو کوئی کام کرتے کرتے اوتانی سان بھی اپنے آپ سے یا دیوار پاکھوں سے باتیں کیا کرتی ہوگی۔ تاہم کسی نے اسے اتنی باقاعدگی سے واضح طور پر باتیں کرتے دیکھا نہ تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے وہ پھٹ پڑتی۔ بولنا شروع کر دیتی۔ اصل میں وہ کسی کو کٹے کٹے کوسنے دینے لگتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے ہی پھر ایک دم ہی چپ ہو جاتی تھی۔ خیر تسونی یان کی تو بات ہی الگ تھی۔ وہ تو خود ہی ایسا تھا لیکن اگر کبھی کوئی دوسرا اوتانی سان کو اچانک ہی کوستے کاٹتے سن لیتا تو پریشان ہو جاتا۔

دونوں بچوں کے اضافے نے تسونی یان کی مشقت میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ مشقت اتنی تن دہی اور ذوق وشوق سے نہیں کرتا تھا، جیسی وہ اس وقت کرتا تھا جب نیا نیا گاؤں میں آیا تھا۔ لیکن اب کبھی کبھار تو کچھ زیادہ رقم حاصل ہو جاتی۔ ویسے تسونی یان کو اب بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ کچھ وقت تو اب مل جاتا تھا اور اب وہ پہلے کی طرح فرصت اور مہلت سے اس درجہ خوف زدہ بھی نہ تھا۔ اپنے فارغ اوقات میں وہ دریا کے کنارے لگے ہوئے پودوں کے درمیان گذارتا نہ صرف ان کو دیکھتا رہتا بلکہ اکثر ان سے باتیں کرتے کرتے ان کو توڑ بھی لیا کرتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی پودا کھانے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن اکثر وہ ان کو اکھاڑ کر ہاتھ میں لئے ان سے باتیں کیا کرتا وہ زیادہ تر سخت ڈنٹھلوں اور نوکیلی پتیوں والی گھاس نوچتا تھا۔

ایک دن اس نے اوتانی سان سے فرمائش کی کہ جا کر ایک بڑا سا برتن خرید لائے۔ اوتانی سان نے ایک بہت بڑا دیگچہ لا کر دیا تو اس نے اس میں وہ سخت ڈنٹھلوں اور نوکیلی پتیوں والی گھاس ابالنا شروع کر دی۔ ابلتی ہوئی گھاس کی بدبو اتنی کڑوی اور ناگوار تھی کہ اوتانی سان کو الٹیاں آنے لگیں، اس کی طبیعت الٹ پلٹ ہوگئی۔ تسونی یان کا کہنا تھا کہ جب یہ گھاس اچھی طرح ابل کر تحلیل ہو جائے گی تو اس کا پانی خشک ہونے پر سفید رنگ کا سفوف رہ جائے گا۔ بڑی احتیاط اور توجہ سے پانی خشک کرنا ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ سارا پانی سوکھ جانے کے بعد گھاس کی تلچھٹ باقی رہ گئی۔ نہ کوئی سفوف نکلا نہ کچھ۔ اوتانی سان اس سعی لاحاصل پر سخت برفروختہ ہوئی۔ اور خلاف عادت خوب اونچی اونچی آواز میں اپنے شوہر کا خوب فضیحتہ کیا۔ اس کی اس حرکت پر وہ اتنی ناراض تھی کہ عرصہ گذر جانے کے بعد جب بھی ذکر نکلتا تو خوب چلا چلا کر بیان کرتی۔

ان کے دونوں کالی رنگت والے بچے بڑے ہو رہے تھے اور جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے تو گاؤں کے بچوں کے ساتھ جا کر کھیلنا کودنا شروع کر دیا۔ اب تک گاؤں میں کئی نئے خاندان آباد ہو چکے تھے۔ یہ زیادہ تر جیوٹ کی فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کے کنبے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے جب بھی تسونی یان کو دیکھتے ایک عجیب سا گیت گاتے۔

داغ......داغ......چیچک کے داغ
داغ کو کھینچنا تھا اور جب کھینچا تو
بالکل ہی پھٹ کر رہ گیا

تسونی یان چیچک رو تھا۔ اس کا بھورا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے

چہرے کی بھوری بھوری کھال چمڑے کی طرح موٹی اور دل دار نظر آتی تھی۔ گاؤں کے بچوں کے کانوں میں اپنے ماں باپ کی یہ بات پڑتی رہتی تھی کہ تسونی یان چھچک رو ہے اور جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ بعض باتوں کو لے اڑتے ہیں اور بے مقصد رٹا کرتے ہیں لیکن مزے کی بات تو یہ ہے خود اس کے اپنے دونوں لڑکے بھی دوسرے بچوں کی دیکھا دیکھی یہی رٹتے پھرتے تھے۔ تسونی یان کے یہاں ان دو بچوں کی پیٹھ پر تلے اوپر چار لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔

بڑا لڑکا جو یان احمق اور پیدائشی کمزور دماغ کا مالک تھا۔ دوسرا لڑکا اس سے مختلف اور ٹھیک ٹھاک تھا۔ چاروں لڑکیاں بھی تلے اوپر ایک دوسری مختلف تھیں ایک پگلی تھی، دوسری ٹھیک اور نارمل تھی، ک تیسری گونگی بہری اور سب سے چھوٹی اور بھی عجیب تھی۔ ویسے تو بہت ہنس مکھ اور کھلنڈری تھی لیکن اس کا بالائی ہونٹ خرگوش کی طرح کٹا ہوا تھا اور بعد میں آگے چل کر ایک آنکھ میں پھلی ہو گئی۔ اس کا آپریشن کروایا تو آنکھ پھڑ کنے لگی۔

''تمہیں اور کام ہے ہی نہیں بچے پیدا کرنے کے سوا۔'' اوتانی سان اکثر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی گویا کسی دوسرے سے مخاطب ہو۔ اکثر وہ اتنی اونچی آواز میں بڑبڑ کرتی کہ دوسرے تو سن لیتے۔ لیکن خود شاید نہ سنتی ہو۔ اکثر بیٹھے بیٹھے زور زور سے بڑبڑانا شروع کر دیتی۔ ''بس تمہارا یہی تو ایک کام ہے کہ مجھ سے بچے جنواتے رہو۔'' شروع شروع میں تو وہ یہ بات خود کلامی کے طور پر کہتی کوئی سنتا نہ سنتا۔ مگر اب تو بار بار دہرانے لگی تھی اور یہ بھی پروا نہ کرتی تھی کہ کوئی پاس اٹھنے بیٹھنے والا ابھی سن رہا ہے۔ چنانچہ اس کی یہ عادت لوگوں میں پھیلنے لگی۔ ایک دن تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ سبزی والے کی دکان سے بند گوبھی مولیاں وغیرہ خریدے، پیسے ادا کئے اور پیٹھ موڑتے ہی خاصی اونچی آواز میں بول پڑی۔ ''بس تمہارے پاس تو ایک کام ہے کہ مجھے بچے جنواتے رہو۔'' لیکن ایک بات ہے کہ اس قسم کی بڑبڑ اس نے نہ کبھی تسونی یان کے سامنے کی اور نہ کبھی بچوں کے آگے بڑبڑائی۔ اس نے تو تسونی یان سے اتنا بھی نہ کہا تھا کہ نیا سال آرہا ہے، مجھے ایک نیا کیمونو یا کوئی چیز دلوا دو۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ تسونی یان بھی کبھی اس سے گرم آواز سے نہ بولا تھا۔

اب تو تسونی یان سونے سے قبل ایک دو پیالے ساکی کے بھی پی لیا کرتا تھا۔ اور جب وہ اپنا اثر دکھانا شروع کرتی تو بڑے آرام کی نیند سوتا۔

اوتانی سان کا یہ تھا کہ اوپر تلے بچے پیدا ہوتے رہے۔ مگر وہ ان کی دیکھ بھال یا پرورش

کے سلسے میں تردد کرتی ہی نہ تھی۔ کوئی کھانس رہا ہے کوئی چھینک رہا ہے، کسی کی ناک بہہ رہی ہے، کسی کے پورے سر میں خارش کے دانے نکل رہے ہیں۔ اس کو کوئی پرواہ ہی نہ تھی۔ بچے آپ ہی آپ پل کر بڑے ہونے لگے تو چھوٹے بھائی بہنوں کو خود ہی سنبھالنے لگے۔ خاص کر چاروں چھوٹی لڑکیاں تو یوں لگتا کہ ایک دوسری کی چھوٹی چھوٹی مائیں ہیں۔ بس ایک دوسری کو سنبھالتی رہتی تھیں۔ کھانے پینے کا بھی یہی تھا کہ اس سلسلے میں بھی وہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ اپنی مرضی کے مالک تھے، جتنا چاہیں کھائیں۔ جس طرح چاہے نکالیں۔ اوتانی سان تو بس ایک بڑے سے چپٹے دیگچے میں چاول ابلنے رکھ دیتی اور بچے دھویں سے کالے دیگچے میں ڈوئیاں ڈال ڈال کر پیچ نکال نکال کر پی لیتے۔ اور پلیٹس بھر بھر کر کھاتے۔ اور ماں ان کی تھی کہ گم صم بیٹھی چاول کے ساتھ ساتھ پیچ پی پی کر پیٹ بھر لیا کرتی۔

........................(3)........................

اوتانی کی ایک عجیب عادت تھی۔ سردی ہو یا گرمی۔ انگیٹھی کے ساتھ ہی لگی بیٹھی رہتی۔ سوسا کے بیوپاری آتے جاتے رہتے، پھر پلٹ پلٹ کر آتے تو یہی دیکھتے کہ اوتانی جوں کی توں چولہے کے ساتھ لگی بیٹھی ہے۔ ان میں سے اگر تسونی یان کو کوئی پوچھتا تو وہ یوں جواب دیتی گویا کسی غیر کے بارے میں بتا رہی ہے۔

''اگر آپ تسونی یان کو پوچھ رہے ہیں وہ تو وہیں ملے گا۔ جنگی جہاز گاؤں میں۔'' اب وہ لوگ لکڑی والا گودام چھوڑ کر گاؤں میں رہنے لگے تھے۔ لب دریا ایک نیچا سا فلیٹ تھا جس کے چاروں طرف چشمے بہتے تھے۔ بڑا والا فاتر العقل لڑکا جویان اب سولہ سال کا ہو گیا تھا اور چھوٹا تورایان پندرہ سال کا تھا۔

اوتانی سان تیس سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ وہی سیاہی مائل نیلا سوتی کیمونو اور بے مانگ کی سیدھی کنگھی کر کے پیچھے کو بالوں کا جوڑا باندھ لیتی۔ دیکھنے میں وہ چالیس سال سے بھی زیادہ عمر کی لگتی تھی۔ اور زیادہ نزدیک سے دیکھو تو چہرے کی اڑی اڑی بجھی بجھی رنگت اور سختی کو دیکھ کر یہی لگتا کہ پچاس سے کم عمر نہیں ہے اس کی۔ سب سے چھوٹی اس کا دم چھلا بنی ساتھ لگی پھرتی لیکن اوتانی اس سے اتنی بے گانہ رہتی تھی کہ جیسے کسی دوسرے کا بچہ اس کے ساتھ لگا پھر رہا ہو۔ اور وہ جو

گونگی تھی وہ تو بت بنی مٹی سے لیپے فرش پر بیٹھی باہر کی طرف ٹکٹکی لگائے گھورا کرتی۔

''ابا کہاں گئے ہیں؟'' جویان ہمیشہ ماں سے یہی سوال کرتا تھا۔ اور وہ بھی بیٹے کو ایک ہی جواب دیتی تھی۔ ''تسونی یان! ارے جائیں گے کہاں وہیں گئے ہوں گے جنگی جہاز گاؤں۔ تو بھی جانا چاہتا ہے کیا۔ جا چلا جا وہاں۔''

''ابا کہاں گئے ہیں؟'' تو رہ یان نے اپنی ماں سے کبھی بھی یہ سوال نہ کیا تھا۔ کیونکہ اس کو پتہ تھا۔ ابا کہاں ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس کو نئی نئی جوئے کی لت لگی تھی۔ وہ خود اس میں لگا رہتا تھا کہ یہ دیکھے کہ گھر میں بیچنے کے قابل کیا چیز ہے جسے وہ لے اڑے چنانچہ اس کو باپ کی فکر کہاں ہوتی۔

دونوں بیٹے باپ کے ساتھ کام تو کر رہے تھے۔ لیکن کاروبار میں کسی خاص نفع کی صورت یا ترقی کا امکان مفقود ہی رہا۔ اب وہ ٹاٹ کی بوریوں کا ذخیرہ بھی رکھنے لگا تھا۔ لیکن ابھی تک بوریوں کے بیوپار میں اپنے قدم جما نہ سکا تھا۔ وہ اکثر اپنے بیٹوں کو دھمکایا کرتا تھا کہ ٹھیک سے کام کرو۔ نہیں ہوگا تو پھر میں کسی بھکشو یا کسی اور مزدور کا انتظام کرلوں گا۔ مگر دونوں بیٹے تھے کہ ان پر کسی بات کا اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ دونوں ہی کو جوئے کی لت تھی اور وہ اسی جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے۔ کسی طرح سے رقم لڑائیں۔

''اماں ہم جا رہے ہیں شام تک آ جائیں گے۔ دونوں بیٹے گھر سے نکلتے وقت ماں کو بتاتے ضرور تھے۔ جو انگیٹھی سے لگی بیٹھی ہوتی۔ پھر وہ کچھ کہے سنے بغیر بید سے بنا ہوا سوٹ کیس کھول کر کریدنا شروع کر دیتے تھے اور وہاں کیا دھرا ہوتا۔ ماں کے پرانے کپڑے، مردانے پٹکے (کمر بند) سب ہی کچھ کھسوٹ ڈالتے اور جب کوئی چیز ہاتھ نہ آتی تو پھر وہیں کچے فرش پر گومگو کے عالم میں بیٹھ جاتے۔

''کیوں جویان آج رات کہیں جانا نہیں تمہیں؟''

ماں بیٹے سے سوال کرتی تو جواب تو رہ یان کی طرف سے ملتا۔

''جانا تو چاہتے ہیں پر جیب میں پیسے بھی تو ہوں۔''

''اچھا تو یہ تو وہ کسی قمیص یا کمونو کا کالر ادھیڑنے اور سلائی کے دھاگے کھینچنے لگتی۔ پھر کالر کے بیچ میں سئے ہوئے پیسے نکال کر اسے پکڑا دیتی۔

''اس پر بھی جویان پوچھتا اماں اور پیسے نہیں ہیں تمہارے پاس؟''

اس پر اوتانی سان بڑابڑانے لگتی۔

بس یہی تو ہیں اور تو سارے کے سارے جنگی جہاز گاؤں کے کٹے لگے جاتے ہیں۔

وہ بڑبڑاتی رہتی۔ بیٹوں نے اس کی بات پر کان دھرنا بھی گوارانہ کیا۔ پیسے پکڑ کر چمپت ہوگئے۔ اوتان نے فرش پر پٹاخ سے یوں تھوکا جیسے اس نے تسونی یان پر تھوک دیا ہو۔

ایک دن دونوں بیٹے گھر میں اس شان سے داخل ہوئے کہ تن پر لتا نہ تھا۔ لنگوٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور دونوں نے اپنے جسموں کو ایک جیکٹ سے چھپایا ہوا تھا۔ یہ جیکٹ بھی کسی عورت کی تھی۔ جویان کے پیر میں تو جوتا بھی نہ تھا۔ اور توریان کے پیروں میں لاکھ کے کام کی زنانہ کھڑاویں تھیں۔ ''ارے ہم تو پھنس گئے۔'' یہ کہتے کہتے دونوں نے اپنے لحاف اپنے کھینچ لئے اور ایسے بن گئے جیسے سو گئے ہوں۔ لگتا تھا کہ جوئے خانے میں چھاپا پڑ گیا ہے۔ اور یہ عقبی دروازے سے نکل کر چھتوں چھتوں بھاگے ہوئے گھر پہنچے ہیں۔

اصل میں ہوتا یہ تھا کہ ادھر انہوں نے جوئے سے کچھ رقم جیتی اور ادھر جنگی جہاز گاؤں کا رخ کیا۔ وہاں جانے کی صلاح دینے والا ہمیشہ تورہ یان ہی ہوتا تھا۔ پہلی مرتبہ وہ جب وہاں گئے تھے تو پگلا جویان پورے سولہ سال کا تھا اور تورہ یان پندرہ سال کا تھا۔ انہوں نے جوئے میں بہت رقم بنالی تھی۔ صبح ہوتے وہ گھر لوٹے تو باپ موجود تھا۔ باپ عام طور پر نصف شب تک گھر آجایا کرتا تھا۔ لیکن اکثر یوں بھی ہوتا کہ وہ صبح دم ہی واپس لوٹتا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''بھائی، کبھی کبھار بیوی کو بھی تو خوش کرنا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بڑا ہی کٹھن کام ہے۔'' وہ اپنے ساتھی بیوپاریوں سے ہنس ہنس کر کہا کرتا ''ایسی بیوی کہ بس آتشدان کے پاس گھسی بیٹھی رہتی ہے کسی اندھیرے کونے میں۔'' اور وہ تھی کہ بیٹھے بیٹھے بڑابڑا شروع کر دیتی۔ کوئی سن رہا ہے یا نہیں۔ اسے اس کی بھی فکر نہ تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ منجھلی لڑکی باورچی خانے سے آواز لگاتی۔ ''اماں چاول بالکل ختم ہوگئے ہیں۔'' وہ اب بارہ سال کی ہوگئی تھی۔ اس نے باورچی خانہ سنبھال لیا تھا۔ کبھی کہتی ''اماں کوئلہ ختم ہوگیا ہے۔'' وہ یہ اطلاعات اماں کو دیتی اور اماں تھیں کہ آتشدان کے قریب کونے میں گھسی بڑبڑ شروع کر دیتیں۔ جیسے کسی سے ناراض ہوں۔ بڑ بڑ بڑ بڑ کر کے کہتی ''ارے وہ گھر کے پیچھے دبکی لومڑی مری نہیں نا اب تک؟'' پھر وہ رہ یان سے کہتی ''بڑے بھیا گھر میں چاول کا ایک دانہ بھی نہیں۔'' جانتی تھی نہ کہ اگر جویان سے کہا نہ کہا برابر ہوگا۔ وہ جو گھر میں سب سے بڑا بھائی ہے کون سے کان دھرے گا۔ اس کی بات پر۔ اچھا پھر سب سے بڑی

پاگل لڑکی کا یہ تھا کہ سفید چہرہ جیسے چونا تپا ہو نہ جانے اس کو پوڈر کہاں سے مل جاتا تھا جو وہ منہ پر تھوپے سکڑی سمٹی کچے فرش پر بیٹھی رہتی۔ یہ کچھ اس قسم کی سڑن تھی کہ نہ تو کسی کو کچھ کہتی، نہ ہی چیختی چلاتی اور نہ بے قابو ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ ماں باپ اور نہ ہی دوسرے بھائی بہن اس کو پاگل سمجھتے تھے۔ ایک بات یہ تھی کہ سٹیرن اپنی چھوٹی بہن کو خوب سنبھالتی تھی اور اس کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ گونگی اگر رونے لگتی تو فوراً بے چین ہو کر اس کے آنسو پوچھتی اور اس کو ناک صاف کرنے کا طریقہ سکھاتی۔ یہی نہیں بلکہ گونگی کا رات کا پیشاب نکل جاتا تو گدا سکھاتی، پگلی کی ایک اور بات یہ تھی کہ اماں کی طرح اکیلی بیٹھی منہ ہی منہ میں باتیں نہیں کرتی تھی، نہ ہی ہر وقت بڑبڑ کرتی رہتی تھی۔ لیکن سچ بات یہ تھی کہ پگلی کا مزاج بہت شاہانہ تھا۔ اس گھر میں یہی ایک شہزادی پیدا ہوئی تھی۔ شہزادی کا یہ عالم تھا کہ اس کیلئے پیشاب کی بدبو برداشت سے باہر تھی۔ چنانچہ جب گونگی کا پیشاب نکل جاتا تو گدا دھونے سکھانے کھڑی ہو جاتی۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی ایسی جگہ بھی تو نہیں تھی کہ وہاں بیٹھ سکتی۔

اسی زمانے میں باپ نے گھر آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ تسونی یان اب زیادہ تر گھر سے دور اور باہر ہی رہا کرتا تھا۔ باپ کا کاروبار اب زیادہ تر تو رہ یان سنبھال رہا تھا۔ اور پگلا جویان اپنے چھوٹے بھائی کی مدد کرتا تھا۔ دوسرے بیوپاری جو کاروبار کے سلسلے میں آتے وہ یہی سمجھتے کہ تو ریان کا ملازم چھوکرا ہے۔ جویان کے پلے اپنی عقل تو تھی نہیں۔ وہ باپ بھائی کے اشاروں پر چلتا تھا۔ جو وہ کہہ دیتے وہ کر لیتا تھا۔ اب اگر چھوٹا بھائی یہ کہہ دیتا کہ کیا خیال ہے جنگی جہاز گاؤں جانے کے بارے میں؟ تو وہ فوراً کہتا ''بالکل نیک خیال ہے۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔'' اور فوراً اس کے ساتھ چل پڑتا۔ اور ان کو جاتے دیکھ کر آتشدان کے قریب بیٹھی اوتانی بڑبڑانا شروع کر دیتی۔ ''بس انہیں تو دنیا کا کوئی کام ہی نہیں۔ اٹھے اور جنگی جہاز گاؤں چل دیئے۔ اس کی بات تو ہر کوئی سنی ان سنی کر دینے کا عادی تھا۔ پڑی بولتی رہو کیا فرق پڑتا ہے۔ اب کچھ دن سے اس کی رنگت کچھ زیادہ ہی جھلسی جھلسی لگنے لگی تھی۔ ہلکی ہلکی کھانسی بھی رہنے لگی تھی۔ مگر کون تھا جو اس کی پرواہ کرتا۔ کسی نے نوٹس بھی نہ لیا تھا۔ گونگی لڑکی اس کے قریب جا کر کھیلنے لگتی تو وہ اسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیتی۔ اور اس کے سر سے جوئیں نکالنے لگتی۔ گونگی سے چھوٹی والی بھی اب پانچ چھ سال کی ہو گئی تھی۔ لیکن اسے کبھی کبھار تشنج کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس کو چیختے روتے دیکھ کر وہ کہتی۔ ''جویان! دیکھ تو یہ بچی کتنا روتی ہے۔'' مگر خود کو اتنی توفیق نہ ہوتی کہ ہل کر اس کے

قریب جا کر بیٹھ جائے۔

.....................................(4).............................

سترہ سال کی عمر میں توریان نے گھر چھوڑ دیا۔ اس کا باپ تسونی یان تو پہلے ہی گھر سے بیگانہ اور غائب رہتا تھا۔ اور اب بالکل بے تعلق ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار ہی گھر میں منہ ڈالتا۔ اصل میں اس نے جنگی جہاز گاؤں کے قریب ایک علاقے شینجیما میں ایک عورت کے لئے کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اب اس کی زیادہ تر راتیں وہیں بسر ہوتی تھیں۔ وہ عورت جنگی جہاز گاؤں کی ایک طوائف تھی۔ تسونی یان کے بچے اس کو شینجیما والی خالہ کہا کرتے تھے۔ یہ عورت آوامتیکو کے ایک مچھرے کی بیٹی تھی اور جنگی جہاز گاؤں میں پیشہ کرتی تھی۔ ایک متربہ اس کے کسی گاہک نے ایک پرچی پر لکھ کر اس کو دے دیا تھا کہ ''میں تم کو جان سے ماردوں گا۔''

ان پڑھ جاہل تو تھی، وہ یہ سمجھی کہ اس پرچہ پر اس نے لکھا ہے۔ ''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

چنانچہ اس پرچی کو اس نے سنبھال کر رکھا لیا۔ ہر دم وہ اسے اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ جس وقت تسونی یان نے اس سے تعلق قائم کیا تو اس کی عمر کوئی ستائیس اٹھائیس سال رہی ہوگی۔ اس کا رنگ اوتانی سان کے برعکس نہایت گوراچٹا تھا۔ اس کی پلپلی سفید جلد غیر شفاف تھی۔ مطلب یہ وہ سورج مکھی تھی۔

پھر تورہ یان گھر چھوڑ کر چلا گیا اور کاروبار مکمل طور پر تسونی یان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ لیکن وہ دن کے وقت ہی رہتا تھا۔ اسے کاروبار میں مدد کے لئے پگلے جویان پر ہی انحصار کرنا تھا۔ اس کی عمر اب اکیس بائیس سال تھی۔ اپنی حماقت اور کم عقلی کے باعث وہ فوج کی جبری بھرتی سے بچا رہا۔ ابھی تک وہ اپنے والدین ہی پر پڑا تھا۔ تقریباً تین سال سے تورہ یان کی کوئی خیر خبر ملی ہی نہ تھی۔ تورہ یان سے چھوٹی اور سمجھ دار لڑکی جس کا نام کائن تھا۔ اپنی پرائمری تعلیم مکمل کر چکی تھی۔ اور خود اپنے ہی بل بوتے اور کوشش سے نرس بن گئی تھی اور ایک ڈاکٹر کے ساتھ جونیئر نرس کی حیثیت سے کسی جگہ کام کر رہی تھی۔ پھر اس نے ایک ٹسٹ پاس کرنے کے بعد نرسنگ کا ڈپلوما لے لیا۔ پھر نہ معلوم کس طرح اس نے رضا کارانہ طور پر فوج میں اپنی خدمات پیش کر دیں۔ کچھ

عرصے وہ چینی محاذ پر کام کرتی رہی۔ اس کے بعد وہ کسی مقام پر ایک بہت بڑے ہسپتال میں لگ گئی۔ اسی ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کے لڑکے سے اس کے مراسم اس حد تک بڑھ گئے کہ اس سے ایک لڑکا پیدا ہو گیا۔ لیکن والدین نے لڑکے کو اس سے شادی کی اجازت نہیں دی۔ البتہ اس کی اشک شوئی کی خاطر یا پھر یہ سمجھیں کہ بچے کی پرورش کے لئے کچھ رقم مقرر کر دی۔ بچہ اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ بچہ لے کر گھر جاتے ہوئے اسے شرم محسوس ہوئی اور کچھ اس لئے بھی کہ وہ بچے کی پرورش کی خاطر مقرر کی جانے والی رقم پر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ڈاکٹر کے نزدیکی کلینک میں متبادل نرس کے طور پر کام شروع کر دیں۔ جس گھر میں اس نے کمرہ کرائے پر لیا تھا اسی میں ایک نوجوان بھی کرائے پر مقیم تھا۔ یہ نوجوان بے روزگار تھا۔ کائن نے اس لڑکے کے ساتھ مل کر رہنا شروع کر دیا۔

وہ کام پر جاتی تو اسی نوجوان پر بچہ کو چھوڑ جاتی ۔ محلے والوں نے باتیں بنانا شروع کر دیں۔ یہ جواو کائن کا بچہ ہے نہ یہ تو پہلے والے مرد سے ہے۔ لوگ اس کو بچے کی دیکھ بھال کرتے دیکھ کر کہتے یہ بچہ بہت نیک بخت اور نفیس مزاج ہے، بات یہ ہے کہ کسی اونچے خاندان سے ہے۔ اس قسم کی باتیں سن سن کر او کائن کے کان پک گئے اور اس نے ایک دن دل میں کہا کہ اچھا ٹھہر جاؤ۔ اب میں اس دوسرے والے سے شادی کر کے دکھا دوں گی۔ پھر تو تم لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہی سب سوچ کر اس نے اپنے سے چھوٹے کم عمر لڑکے سے شادی کر لی یہ سوچ کر کہ جب بڑے بھیا گھر واپس آ جائیں گے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے تورہ یان پر بڑا امان اور بھروسہ تھا۔

نگلی او کائن سے ایک سال بڑی تھی۔ اور کیکو کہلاتی تھی۔ اب اس کی عمر بھی اٹھارہ انیس برس کی ہو رہی تھی۔ ابھی کیکو سان سترہ سال کی تھی کہ ایک دن اس نے غسل خانے میں ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔ بچہ تو رویا نہ چلایا البتہ او کیکو سان چیختی چنگھاڑتی گرتی پڑتی ماں کے پہلو میں جا کر گر گئی۔ ''ارے کم بختو تم لوگوں کو کوئی کام نہیں ہے۔ بچے پیدا کرنے کے سوا۔''

ماں نے بڑبڑ کر کے لڑکی کو پرے دھکیل دیا۔

واقعی یہ تورہ یان گیا کہاں؟ جو یان سوچنے لگی۔ اس کو اپنا چھوٹا بھائی یاد آ رہا تھا۔ جب بھی کوئی نئی پریشانی یا واقعہ ہوتا تو اسے بھائی کی یاد بری طرح ستاتی۔ اب نئی مصیبت یہ آن پڑی کہ ایک دوسرے آدمی سے کائن کے یہاں دوسرا بچہ پیدا ہو گیا۔ وہ اس سے پیسے مانگنے آئی تھی۔ اور

پریشان حیران سوچ رہا تھا۔ کیا کروں ابا تو خالہ شیکنجیما کے پاس رہتے ہیں۔ تو رہ یان کا کچھ پتہ نہیں کہاں گیا۔ اب میں کروں تو کیا کروں؟ لیکن اس کی عادت تھی کہ اپنی کسی پریشانی کا ذکر ماں سے نہیں کرتا تھا۔ بچپن ہی سے وہ ماں کو آتشدان کے قریب بیٹھے دیکھتا چلا آیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ بس ماں تو تھوے کی طرح بیٹھی رہے گی۔ اوراب وہ روز روز تو اپنے کیمونو کا کالر ادھیڑ کر اس میں سے روپئے تو نہیں نکال سکتی نا۔

ان ہی دنوں تسونی یان کا ایک ساتھی بیوپاری اس طرف آیا تو اس نے جویان سے کہا کہ ''اگر تم کو کاروبار کے لئے پیسے چاہئے ہوں تو مجھ سے ادھار لے لو۔ تم جتنے کہو میں اتنے پیسے ادھار دے دوں گا۔''

''اچھا تو پھر تم کتنے پیسے دے دو گے۔'' جویان نے ایسے اشتیاق سے سوال کیا جیسے کسی دریا پار جانے والے کے سامنے کشتی خود بخود آ لگے۔ بیوپاری کہنے لگا تم جتنے مانگو میں دینے کو تیار ہوں۔ البتہ ایک بات ہے تم مجھے اپنی خاندانی مہر دے دو۔ دیکھو جویان تم اس گھر کے بڑے بیٹے ہو۔ اور تم کو یہ اختیار اور حق ہے کہ یہ جو تم لوگوں کی مہر ہے اسے جیسے چاہو استعمال کرو۔ یا کسی کو استعمال کرنے کا حق دے دو۔ جویان نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مہر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اور اس شخص نے یہی مہر لگا گھر گروی کر لیا۔ اس کم عقل کو اتنی سمجھ کہاں تھی کہ وقتی اخراجات کے لئے ایک معمولی جیب خرچ کی رقم کے عوض وہ اس سے کیا لے گیا ہے۔ اس نے تو رقم پکڑی اور ماں سے کہا کہ میں جا رہا ہوں جلدی واپس آ جاؤں گا۔ اور اس نے بہت مدت کے بعد اس دن جنگی جہاز گاؤں کا راستہ پکڑا۔

وہاں سے واپسی پر پتہ چلا کہ کائن آئی بیٹھی ہے۔ وہ پیسے لینے آئی تھی۔ اس کو کسی نہ کسی طرح پتہ لگ گیا تھا کہ جویان کے پاس پیسہ آ گیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس مرتبہ جو بچہ ہوا ہے اس کی ٹانگیں اندر کو مڑی ہوئی ہیں۔ اب تقریباً ڈیڑھ سال کا ہو گیا ہے لیکن نہ تو ٹانگیں سیدھی کر سکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے۔ اگر علاج نہ ہوا تو ہمیشہ کے لئے معذور ہو جائے گا۔ ہسپتال میں رکھ کر علاج کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے کافی پیسہ چاہئے ہوگا۔ ہاں تو اب بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے؟ کائن دروازے کے باہر ہی کھڑی رہی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی گویا کہتی ہو کہ یہ بڑی بے انصافی ہوگی اگر تم نے اس کے علاج کے لئے پیسہ نہ دیا۔ اس لڑکی کی حالت یہ تھی کہ جب بھی آتی دروازے پر ہی کھڑی رہتی۔ البتہ کبھی اندر منہ ڈال کر نہ ماں کے پاس جا کر بیٹھتی نہ باورچی

خانے میں اس نے قدم رکھا۔اس کے خیال سے وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔حفاظان صحت کے لحاظ سے اس قابل نہ تھا کہ کوئی اس میں جا کر کھڑا بھی ہوتا۔شاید یہ سب اس لئے کر رہی تھی کہ اس نے نرسنگ پڑھی اور سیکھی تھی۔اس کے ذہن میں حفظان صحت کا بڑا احترام تھا۔

''اچھا تم کیا کہتے ہو بچے کو معذور بن جانے دوں؟''

کائن دروازے پر کھڑی کھڑی اس کا سر کھاتی رہی۔''میں جانتی ہوں کہ تم یہی تو کہو گے کہ تم جنگی جہاز گاؤں جا کر یہ پیسہ خرچنا چاہتے ہو۔ہاں بھئی کسی دوسرے کی اولاد پر کاہے کو خرچ کرو گے۔'' وہ بکے جا رہی تھی۔''ابا ہیں تو وہ بھی جنگی جہاز گاؤں جا بیٹھے۔اماں کا دماغ چلا ہوا ہے۔ارے یہی تو تمام باتیں انہوں نے اٹھا اٹھا کر میرے منہ پر مار دیں۔اور ہسپتال میں ڈاکٹر کے بیٹے سے میری شادی نہ ہو سکی۔سن رہے ہو نا تم؟'' وہ جویان کو مخاطب کئے جا رہی تھی۔

آخر وہ بولا ''ارے بھئی، یہاں رکھا کیا ہے۔'' وہ بوکھلا گیا۔

''ہاں خیر اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اگر میری شادی اس ڈاکٹر سے ہو جاتی تو تم ہی سب سے پہلے میرے دروازے پر ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوتے۔اور ٹھیک ہے اگر تم جیسا بدھو میرے دروازے پر آتا اور میں اس گھر کی بیگم بنی بیٹھی ہوتی تو میں تو تمہاری صورت بھی نہ دیکھتی۔'' وہ دروازے پر کھڑی کھڑی بک بک کئے جا رہی تھی۔''اب دیکھو میری شادی اتنے بڑے گھرانے میں نہیں ہو سکی۔تو خیر مجھے دوسرا مل گیا۔اور اب تو میں آج تمہارے در پر پیسے مانگنے آ بھی گئی جو وہاں ہوتی مجھے یہاں کون آنے دیتا۔''

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔'' جویان سوچنے لگا۔''اور دیکھو یہ تو رہ یان تو منہ اٹھا کر چل دیا۔اب یہ بھی پتہ نہیں کہ ہے کہاں۔جب بھی کوئی ایسا مسئلہ ہوتا تو جویان کو تو رہ یان پر غصہ آنے لگتا۔

اسی وقت اندر سے کیکو باہر نکلی اور ایک جست لگا کر کچے صحن کے پار نکل گئی۔پگلی کیکو ان دنوں تفریح کرنے دریا کنارے جایا کرتی تھی۔اور وہاں گاؤں کے نوجوان لڑکوں کا دل فی سبیل اللہ خوش کیا کرتی تھی۔کیکو سے چھوٹی گونگی بھی نوجوان ہو رہی تھی۔چودہ پندرہ سال کی ہو گئی تھی۔لوگ اسے کینو، کہا کرتے۔وہ خود تو اپنا نام سن نہیں سکتی تھی تاہم لوگوں کے لئے پکارنے کے لئے یہ نام پڑ گیا تھا۔

''ارے کینو۔تم ابھی تک کھانا پکا رہی تھیں؟'' کائن جس وقت آئی تھی اب پہلی مرتبہ بڑی بہن کی طرح للک کر پیار سے بولی۔اپنی گونگی بہن پر نظر پڑتے ہی اس کو یاد آ گیا کہ وہ کس طرح

کچے فرش پر سکڑی سمٹی بیٹھی رہتی تھی۔ جویان کو بات ٹالنے اور موضوع بدلنے کا موقع مل گیا اور بولا کھانا توکی یو پکاتی ہے۔ سب سے چھوٹی کی یو اب بارہ تیرہ سال کی ہوگئی تھی۔

اب کائن نے باہر کی ہی کھڑے کھڑے اندر گھسی بیٹھی ماں کو اونچی آواز میں مخاطب کیا" اماں میں بھائی سے پیسے مانگنے آئی ہوں۔"

اماں نے وہیں سے اپنی ہانکنا شروع کردی۔

"ارے ہاں، تمام رات یہ کمبخت لومڑی گھر کے پیچھے بیٹھی روتی رہی ہے۔ توبہ ہے میں تو سو بھی نہ سکی ٹھیک سے۔"

یہ کہہ کر اس نے پھر بڑبڑ شروع کردی۔

ارے وہ تسونی یان وہ تیرا باپ ابھی ہوگا دریا پر، جا۔ اس سے کہہ تجھے کپڑے دلوادے۔ نہیں تو کچھ اور منگالے اسے۔

"ارے اماں! پیسہ! پیسہ۔" جویان نے ماں کو سمجھایا۔ "یہ پیسے مانگتی ہے۔ جس کی ہم سب ہی کو ضرورت ہے۔" اس کے جواب میں اوتانی سان منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہی۔

"ان سے کب ہوسکتا ہے کچھ، بس بچے پیدا کرنے کے سوا اور کیا کام ہے ان کو۔"

وہ بکتی رہی اور اس کی آواز اس کے بیٹا بیٹی تک پہنچتی رہی۔

........................(5)........................

تورہ یان نے جنگی جہاز گاؤں جانے کے سوا کبھی گاؤں سے باہر قدم نکالا ہی نہ تھا۔ بس پل پار اس گاؤں تک ہی گیا تھا۔ اور ایک دن وہاں سے واپسی پر اچانک اسے خیال آ گیا۔ آج دوسرے راستے پر جانا چاہئے۔ کہتے ہیں جنگی جہاز گاؤں سے سیدھے چلتے جاؤ تو امیرا پہنچ جاؤ گے۔ وہاں پر ایک اسٹیشن بھی ہے۔ ایک اور جگہ فوکوشیما ہے۔ اسی راستے سے چلتا چلتا تورہ یان نودامی ایک جگہ پہنچا۔ پھر اسی راستے کو طے کرکے وہ اسٹیشن پر تورہ یان نے ٹکٹ لے لیا۔ ٹکٹ تو وہ شین باشی تک کا لینا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس شین باشی تک کے پیسے نہیں تھے اس لئے ناگویا کا ٹکٹ لے لیا۔ یہ تمام واقعہ اور اس کے بعد کے واقعات ڈینپو گاؤں سے واپس آکر تورہ یان شیخیاں مار مار کر سنایا کرتا تھا۔ کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹا؟ کون کہہ سکتا ہے لیکن حقیقت ہے کہ اس کی

ساری باتوں پر تو یقین کیا ہی نہیں جا سکتا۔

بہر حال تورہ یان کسی نہ کسی طرح نا گویا پہنچ گیا۔ وہاں پہنچا تو جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ آخر میں یہاں کس وجہ سے آ گیا۔ مقصد کیا ہے یہاں آنے کا؟ خیر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تورہ یان اس قسم کا انسان تھا جو اپنی غلطی یا کسی حرکت پر پچھتانے کے قائل نہیں ہوتے۔ چنانچہ بے مقصد پھرتے پھراتے وہ ایک اندھیر گلی میں جا پہنچا۔ اور پھر اس طرح منہ اٹھائے رہائشی علاقے میں چلا گیا۔ اس امید پر کہ رہائشی علاقے کے بنگلوں کے ملازمین کی آمدورفت کے لئے پچھلے دروازوں کے ساتھ ہی کوڑے کے ڈرم بھی پڑے ہوتے ہیں اور ان کو ٹٹولو تو کچھ بچا کھچا کھانا مل جاتا ہے۔ اس علاقے میں لوگوں کی آمد کم ہی ہوتی تھی۔ اور تورہ یان ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھانے کا اہل بھی تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر پیٹ میں کچھ پڑ جائے تو نیند تو کہیں بھی آ سکتی ہے۔ کہیں بھی رات بسر ہو جائے گی۔ لیکن اس کی توقع کے خلاف بچا کھچا کھانا ملنا اتنا آسان نہ تھا۔ لگتا ہے یہ کھاتے پیتے لوگ کنجوس ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی کچھ سوچتا ہوا وہ کوڑے کا ڈرم کھکھوڑ رہا تھا کہ اتنے میں ایک گھر سے خادمہ نکل کر کوڑا ڈالنے آئی۔ اس کو ڈرم میں بچا کچا کھانا تلاش کرتے دیکھا تو بوڑھی خادمہ تورہ یان کو پچھلے دروازے سے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے اس کو چاول کے کوفتے کھانے کو دیئے۔ کم از کم تورہ یان یہی بیان کرتا ہے، ویسے تو اس کی عمر سولہ سترہ سال تھی لیکن قد چھوٹا تھا اور وہ بالکل ہی بچہ نظر آتا تھا۔

''وہ گھر ایک لیفٹیننٹ......فلاں فلاں کا تھا۔ وہاں میرا زبردست سواگت ہوا۔ شاندار استقبال۔ گویا میں بھی کوئی ٹویوٹومی ہیڈی یوشی تھا۔'' اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ استقبال کس طرح اور کیسا ہوا۔ اور اس کی تواضع کس طرح کی گئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ لڑکا بڑا گپی اور شیخی خورہ تھا۔

اب ایک اور واردات سنئے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب وہ ٹوکیو پہنچا تو وہ ایک اچار کی دکان میں جا گھسا اور وہاں پر ملازمت کر لی۔ ایک بات یہ تھی یہ لڑکا اچار ڈالنے اور کھانا پکانے کا بہت شوقین تھا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہی ہو۔ ملازمت ملنے کے دو تین دن بعد تورہ یان نے اپنے مالک کو یہ مشورہ دیا کہ مولی کی قاشیں خشک کر کے بیچی جائیں تو وہ بہت بکیں گی۔ اب بات یہ تھی کہ تورہ یان نے ڈینپو گاؤں میں دیکھا تھا کہ گاؤں والے مولی کی پتلی پتلی قاشیں کاٹ کر ان کو خوب نمک لگا کر سمندری گھاس میں دبا دیتے تا کہ ان کی خوشبو بدل جائے۔ اس طرح راتوں رات مولی کا قاشوں کا اچار تیار ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ ان کو توقع تھی۔ مولی کی قاشوں کا اچار

ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا۔اور دکان کے مالک کی نظر میں تورہ یان کی وقعت بڑھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرنے لگا۔اب یہ اس کی ایک اور گپ تھی۔ ہاں اگر اس سے آدھوں جھوٹ منفی کردیا جائے تو تھوڑا بہت سچ بھی نکل سکتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اچار چٹنی کی دکان پر ملازمت کے بعد تورہ یان ٹوکیو میں اپنے تین سالہ قیام کے دوران دکان دکان ملازمت کے پھیر میں رہا۔اور اس طرح متعدد دکانوں پر ملازمت کرتا رہا تھا۔اب کہاں تک اس کی شیخیوں اور گپ بازی کا ذکر کیا جائے۔ایک دفتر ہے کہ سنتے سنتے بھی لوگ بیزار ہو جائیں۔ وہ تو شیخیاں بگھارتا ہی رہتا تھا۔البتہ اپنی جدوجہد کی ناکامیوں کی بات ہمیشہ گول کر جاتا تھا۔

بعد میں اس نے شادی بھی کر لی تھی۔شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد فوج کی جبری بھرتی میں آ گیا۔اور چین کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔محاذ کی بھی بے شمار مبالغہ آمیز داستانیں کہ محاذ پر اس نے کیسے جوئے میں پیسے بنائے اور کیسے لوگوں کو بیوقوف بنا کر دولت کمائی اور کہاں کہاں چھپائی۔ بس ایسے ہی بے سروپا قصے تھے کہ ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔

تورہ یان جب ڈینپو گاؤں میں واپس آیا تو تو شیخیوں اور مبالغہ آمیز قصوں کا ایک لامتناہی سلسلہ بھی اس کے ساتھ آیا۔سب سے پہلی بات جو اس کو محسوس ہوئی وہ گھر میں تسونی یان کی عدم موجودگی تھی۔اس کے سوال پر کہ ابا کہاں ہیں؟ جویان نے اس کو بتایا کہ ابا تو اب مستقل طور پر خالہ شیکنجیما کے ساتھ رہتے ہیں۔ بھیا چاول اور کوئلہ ہم ادھار لے رہے ہیں۔'' سب سے چھوٹی لڑکی نے بتایا کیا تمہارا خیال ہے کہ میرا بچہ معذور ہو جائے گا؟ کائن نے بھی اپنا مسئلہ پیش کر دیا۔

''اچھا تو یہ حالات ہیں......'' وہ کہنے لگا۔''چلو ایسا کرتے ہیں کہ ہم گھر کو گروی رکھ دیتے ہیں اور کچھ رقم قرض لے لیتے ہیں۔'' اس نے ٹوکیو میں گروی رکھ کر رقم حاصل کرنے کا رواج دیکھا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا'' جویان تم ایسا کرو کہ وہ جو ہماری مہر ہے نا وہ مجھے دے دو۔ دیکھو میں کوئی انتظام کرتا ہوں۔'' ''وہ مہر اتو اب ہمارے پاس ہے نہیں۔'' جویان نے اسے بتایا'' وہ تو میں نے وہ جو بڑے میاں ہیں نا، یاتومی ان کو دے کر کچھ رقم لے لی تھی۔'' اور پھر یہ سوچ کر کہ اب سن کر تورہ یان غضبناک ہو جائے گا وہ الٹا اسی کو الزام دینے بیٹھ گیا'' یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے نہ تم غائب ہوتے۔نہ یہ حال ہوتا۔تم تو چل دیئے تھے منہ اٹھا کر۔''

اب پگلی کی باری تھی۔ وہ اس کے سر ہو گئی۔

''مجھے ایک نیا کیمونو خرید کر لا دو۔ اماں کہہ رہی تھی کیکو تو اپنے بھائی سے جا کر کہہ، وہ دلوائے گا نیا کیمونو۔'' اور یہ جو کیکو تھی نہ وہ پھر پھول رہی تھی۔ اور اس کا پیٹ نمایاں حد تک بڑھا ہوا نظر آ رہا تھا جو تورہ یان نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا تھا۔ وہ جھلا گیا۔ یہ اماں بیٹھی بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ اللہ ہی جانے اسے کسی بات کا ہوش بھی ہے کہ نہیں۔ ان سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ اماں کو تو ایک ہی کام آتا ہے۔ بیٹھی بڑبڑ کرتی رہے۔ وہ سوچتا رہا۔ گونگی کینو ماں کے پاس بیٹھی ہاتھ کے اشاروں سے ماں سے باتوں میں مصروف تھی۔

''میں پوچھتا ہوں تورہ یان، تمہارے پاس پیسے ہیں جنگی جہاز گاؤں جانے کے لئے۔'' جو یان اب سب کچھ بھول کر اپنے چھوٹے بھائی سے پوچھنے بیٹھ گیا۔ اچانک ہی تورہ یان کے ذہن میں خیال آیا۔ اور وہ جو یان سے کہنے لگا ''میں جنگی جہاز گاؤں تو جاؤں گا۔ لیکن میرے ساتھ تم نہیں کیکو جائے گی۔'' وہ سوچنے لگا ٹھیک ہے۔ اب کیکو ہی ہمیں تحفظ دے گی۔ اس نے کیکو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہنے لگا ''چلو کیکو میں تم کو ایک بڑی اچھی جگہ لے کر چلتا ہوں۔ آؤ چلیں۔''

جنگی جہاز پر پہنچ کر اس نے ایک نائکہ سے کہا کہ ''یہ میری چھوٹی بہن ہے اس کو صرف ایک دن کے لئے رکھ لو۔ اور اتنی مہربانی کرو کہ مجھے کچھ پیشگی رقم دے دو۔ بس ایک دن کا ایڈوانس۔'''

''ایک دن کا ایڈوانس؟ لو بھلا یہ ایڈونس کی بات تو میں پہلے کبھی سنی نہیں۔'' وہ بڑی عورت بڑی حیرت سے بولی۔ لیکن وہ تورہ یان کے تیوروں اور انداز سے اتنی متاثر تھی کہ اس نے پیشگی پیسے پکڑا دیئے۔ وہاں سے اٹھ کر تورہ یان سیدھا جوئے کے اڈے پر جا پہنچا۔

..............................(6)........................

''بھئی دیکھو، تورہ یان کی واپسی میرے لئے پریشان کن ہے۔'' تسونی نے خالہ شیکنجیما سے کہا ''وہ اکیلا ہی بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ جو کے مقابلے میں بہت ہوشیار اور تیز نظر ہے۔ اب تو میرے پاس کچھ رہنا ہی مشکل ہو جائے گا۔''

خالہ شیکنجیما کا اصل نام اوہاروسان تھا۔ لیکن تسونی یان اس کو اوہارو کہنے کے بجائے خود بھی خالہ ہی کہتا تھا۔ خالہ اب چالیس کے پیٹے میں تھی۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کا جسم

بھاری پڑ گیا تھا۔ اس کا سارا جسم ایک سفید پلپلے پیڑے کی طرح نظر آتا تھا۔ اور اس کے ہاتھ اتنے موٹے کپے ہو رہے تھے کہ دیکھو تو لگتا تھا کہ دو سفید گولے ہل رہے ہوں۔ وہ روٹی نہیں پکا سکتی تھی۔ اور اب تو نہ جانے کب سے تسونی یان کا گذارا شراب اور لوئے کی دال پر ہو رہا تھا۔ یہ عورت گیشا تو تھی نہیں۔ اس لئے گانے بجانے کے فن سے بھی نا آشنا تھی۔ چنانچہ مجبوراً تسونی یان اکیلے ہی ساکی پیتے وقت خالہ کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا اور جام پر جام چڑھاتا رہتا۔ اس خاتون کی دونوں کنپٹیوں اور گردان پر داغ تھے۔ ایک دن وہ کہنے لگی ''مجھے یوں لگتا ہے جیسے چھت چکر کاٹ رہی ہے۔ اتنی تیز تیز، کہ نظر ہی نہیں ٹھہرتی اس پر۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گی۔ لیکن میں آوا نہیں جاؤں گی۔ اس لئے کہ اب وہاں میرے ماں باپ تو ہیں نہیں۔ مجھے کیا کرنا ہے وہاں جا کر۔''

تسونی یان کا کوئی بچہ کبھی شیکنجیما خالہ سے ملنے نہیں آیا۔ وہ خود ہی دن میں ایک مرتبہ اپنی سوتی جیکٹ پہن کر کاروبار کی دیکھ بھال کے لئے چلا جاتا۔ عام طور پر بالکل شام پڑے واپس آتا۔ خالہ کے ساتھ بیٹھ کر ساکی پیتا۔ کچھ یوں ہی بے مقصد منہ میں بڑبڑاتا اور ایسے ہی بڑبڑ کرتا سو جاتا۔ جب وہ سو جاتا تو اوہاراسان تسونی یان کی بچی ہوئی ساکی پیالے میں انڈیل کر ایک ہی گھونٹ میں غٹ غٹ پی جاتی جیسے کوئی پانی پیئے۔ یہ بات نہیں تھی کہ ساکی اسے ناپسند تھی بلکہ بات یہ تھی کہ چونکہ اس کا تعلق جنگی جہاز گاؤں سے تھا، اور یہاں آ کر رہنے کے بعد اس کو گھر گرہستی سے کبھی کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ اس لئے اس کو اتنا بھی سلیقہ نہ تھا کہ کم از کم اپنے پینے کے لئے تو ساکی گرم کرے۔ چانچہ ٹھنڈی ساکی حلق کے نیچے اتار کر تسونی یان کے آگے کا بچا کھچا چاول اور ڈونگوں وغیرہ میں جو کچھ پڑا رہ جاتا تھا، کھا لیتی۔ اوہاروسان کا یہ معمول تقریباً بیس سال سے تھا۔ لیکن اس کو کبھی محسوس نہ ہوا کہ یہ غلط حرکت اور بے ڈھنگا پن ہے۔

''تسونی یان! تسونییان! تورہ یان آیا ہے۔'' اور ہاروسان نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ غافل پڑا سوتا رہا۔ تورہ یان نے جھنجھلا کر کہا ''اچھا خالہ تم ہٹو یہاں سے میں خود جگاتا ہوں۔'' اس نے باپ کا شانہ ہلایا ''ابا...... ابا اماں مرگئی۔ اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟'' پھر اونچی آواز میں چلا کر کہا ''ابا...... ابا اٹھو۔ اماں مرگئی اور تم پڑے سو رہے ہو۔''

اوتانی سان نے آتشدان کے قریب بیٹھے بیٹھے ہی منہ سے خون ڈالا اور منہ کے بل بھوبل پر جا گری۔ اس کے مرتے ہی جو یان نے پہلا کام یہ کیا کہ اس کے تن پر جو کمونو تھی اس کا کالر

ادھیڑ کر ٹٹول ٹٹول کر دیکھا مگر ایک پیسہ بھی اس میں چھپا ہوا نہ ملا۔ جس نے سنا یہی کہا کہ اوتانی سان مر گئی اور بس ۔اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس کی تجہیز و تکفین کے بعد تسونی واپس خالہ شیکنجیما کے پاس چلا گیا۔ وہ دن میں ایک پھیرا گھر کا لگا لیا کرتا تھا۔

ماں کے مرنے کے چند دن بعد جویان نے جنگی جہاز گاؤں کی ایک عورت سے شادی کر لی جو پہلے کبھی جیوٹ فیکٹری میں کام کرتی تھی ۔شادی کے بعد جویان نے بھی ڈیپنو گاؤں ہی میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ اور اب وہ بھی اپنے باپ کی طرح دن بھر میں ایک بار گھر آتا تھا۔ اب گھر میں تورہ یان، پگلی کیکو، گونگی کینو اور سب چھوٹی کٹے ہوئے ہونٹ والی کیو رہ گئی۔

اب پگلی کے یہاں بچہ ہونے والا تھا پگلے پن کے باوجود ان دنوں اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ اور تمام دن گھر ہی میں پڑی رہتی تھی ۔آتشدان کے قریب اسی جگہ پر جہاں ماں بیٹھی رہتی تھی ۔ وہ منہ اوندھائے پڑی رہتی ۔تورہ یان بار بار پوچھتا'' کیکو یہ تو بتادے کہ یہ بچہ ہے کس کا ؟ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کچھ منہ سے پھوٹ تو ؟'' تورہ یان کو غصہ آ جاتا۔ لیکن کیکو کی زبان بند ہی رہتی ۔کیکو کو خود ہی کیا پتہ تھا کہ کس کا ہے۔ وہ بتاتی تو کیا بتاتی۔ کیکو کی عادت تھی کہ دریا پر چلی جاتی تھی ۔ وہاں گاؤں بھر کے جوان لڑکے موجود ہوتے تھے۔ اب کوئی ایک آدمی تو آتا نہیں تھا۔ ان کا یہ تھا کہ کچھ تو جنگی جہاز گاؤں جانا چاہتے تھے۔ مگر جیب میں مال نہ ہوتا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ادھر جاتے شرماتے تھے۔ اب یہ تو تھی ہی پگلی خانم کسی کو مایوس نہ لوٹاتی تھی ۔

کیکو آتشدان کے قریب اپنا گھڑا سا پیٹ دونوں ہاتھوں میں ایسے سنبھالے بیٹھی رہتی تھی ۔ جیسے ڈرتی ہو کر کہ کہیں گر کر پھوٹ ہی نہ جائے۔ تورہ یان کچھ اتنا فکر مند بھی نہ تھا، کہ گھر میں ایک بے باپ کے بچے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اسے اتنی بھی فکر نہ تھی جیسے کسی کتے یا بلی کے بچے پر بچہ ہوتا جائے۔ جب تک ان کے رہنے کی گنجائش ہو تو کاہے کی فکر۔ اور یہ کیکو کم بخت تو ایسی ہے کہ اگر اس کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو یہ تو بلی اور کتیا کی طرح ہی بچے پیدا کرتی رہے۔ غسل خانے میں ایک مردہ بچہ کو جن کر تو بس یہی کام ہی رہ گیا تھا اس کا اس کے بعد دو مرتبہ شروع ہی میں بچے گر گر گئے ۔اب یہ پھر بیٹھ گئی ہے۔

ایک دن تورہ یان کی نظر ایک چھوٹے قد کے منحنی سے آدمی پر پڑی۔ عمر اس کی تیس کے لگ بھگ ہو گی ۔تورہ یان نے اس کو اپنے گھر کے اندر جھانک جھانک کر کسی کو تلاش کرتے ہوئے پایا۔ اس وقت تو ٹال گیا۔ لیکن اگلے دن اور پھر اس سے اگلے دن بھی اس کو اسی طرح تانک

جھانک جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ آخر ایک دن تورہ یان نے اس کوٹو کا

''تم یہاں اس گھر میں کیا جھانکتے رہتے ہو۔ کیا بات ہے۔ کیا چاہئے؟''

تورہ یان نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

وہ آدمی منمنایا ''میرا خیال تھا۔ یہ کیکوسان کا گھر ہے اور وہ یہاں رہتی ہے۔'' ''اچھا رہتی ہے تو! پھر تمہیں کیا؟'' تورہ یان آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ ''سمجھا کیا ہے۔ تمہاری وہ گت بناؤں گا کہ یاد رکھو گے۔''

''میرا...... میرا خیال تھا کہ اگر وہ یہاں مل جائے تو میں اس سے کہوں کہ مجھ سے شادی کر لے۔'' وہ پھر کمزور سی آواز میں منمنایا۔

''اچھا آ...... ! تو یہ تم ہو جس نے اس کا یہ حشر کیا ہے؟ چلو...... ذرا اندر تو چلو۔ وہ اس کا گریبان پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔

پتہ یہ چلا کہ وہ شخص بار برداری کے لدو گوڑے چلاتا ہے۔ تیس سال سے اوپر عمر ہے اس کی اور ابھی تک کنوارا ہے۔ وہ کہنے لگا کیونکہ میں نے اوکیکوسان سے یہ سلوک کیا ہے جس کی وجہ سے اس کے پیٹ میں میرا بچہ ہے۔ تو اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں۔''

''تم ہی ذمہ دار ہو اس کے پھولے ہوئے پیٹ کے؟ اکیکو کے پیٹ میں تمہارا بچہ ہے۔ اس لئے وہ اب تمہاری بیوی ہے۔'' تورہ یان نے کہا۔

ہاں تو یہی میں بھی کہتا ہوں کہ میں اس کو لینے آیا ہوں۔ اسے میرے ساتھ بھیج دو۔''

وہ اکیکو کو تقریباً کھینچتے ہوئے یوں بھاگا گویا تورہ یان اس کو مارنے کے لئے پیچھے آرہا ہے۔

''ارے عجیب آدمی ہے۔ ایسے ڈر کر بھاگا ہے جیسے کوئی بچہ ہو۔'' تورہ یان چچ چچ کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

تورہ یان کو ساری فکر یہ تھی کہ کسی طرح اپنا گروی مکان چھڑا لے۔ ابھی تک تو اس کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا تھا کہ اس وقت یہ گھر ہے کس کے نام پر۔ سب سے پہلے تو اسے اپنی خاندانی مہر واپس لینا آسان نہ تھی۔ اس بڈھے یاماتومی سے۔ مگر وہ ایک عیار اور بدمعاش آدمی تھا۔ اس سے مہر واپس لینا آسان نہ تھا۔ اس وقت تک جب کہ ہاتھ میں پیسہ نہ ہو۔ اب مجھے پیسہ جوڑنا ہے مگر

کس طرح؟ یہی تو سوچنے کی بات تھی کہ یہ رقم معمولی قسم کے جوئے سے حاصل کرنا ممکن نہ تھی کہ وہ اپنا مکان چھڑا سکتا۔

اس کے باپ تسونی یان کا اب یہ حال ہو گیا تھا کہ نہ تو اپنے کاروبار میں اسے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی اسے دولت کمانے کی خواہش تھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ فطرتاً پیسے کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پھرتا تھا۔ اس کا تو یہ حال تھا کہ وہ اپنے بیٹے تک سے کسی قسم کی ادائیگی کا سختی سے تقاضہ کرنے کا قائل نہ تھا۔ وہ جب بھی تورہ یان سے ملتا تو بڑی نرمی سے پوچھتا

''کیوں بھئی تورہ یان کاروبار کا کیا حال ہے؟ کیسا چل رہا ہے؟''

تورہ یان باپ کی شکل دیکھتے ہی کچھ رقم اس کے حوالے کر دیتا۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ تورہ یان بڑا خیال کرنے والا انسان تھا اور اپنے کنبے کے معاملے میں بڑا سخی اور فراخ دل تھا۔ اس نے گھر گروی کرنے کے سلسلے میں ایک مرتبہ بھی جویان کو الزام نہ دیا اور نہ اس نے شرمندہ کیا۔ بس دل میں ایک خلش تھی ایک پھنس سی گڑی تھی کہ کسی طرح پیسہ جوڑ کر اپنا گھر چھڑا لے۔ لیکن چونکہ اس مرتبہ شیخی مارنے والی کوئی بات نہ تھی اس لئے اس بار وہ چپ ہی رہا۔ نہ کوئی گپ، نہ بڑک، حالانکہ یاد رہے کہ وہ گپ بازی کا کتنا شائق تھا۔

ویسے تو جویان بڑا بیٹا تھا۔ لیکن اس نے تو باہر شادی کر کے ایک طرح سے گھر سے تعلق ہی توڑ رکھا تھا۔ بس اب تو خاندان کا بڑا تورہ یان ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور جویان اپنے باپ کی طرح دن بھر میں ایک بار منہ ڈالتا تھا۔ اس نے تو توریان کی تجارت کو ایک طرح سے ٹھیکے پر اٹھا دیا تھا اور اس سے جو گزارے کی رقم ملتی تھی اس پر گزارا کر رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ احمق اور ناکارہ جویان خود کاروبار چلانے کا اہل نہ تھا۔ خیر اس کا حساب کتاب تقریباً ٹھیک ہی چل رہا تھا۔ اس لئے کہ جویان کی بیوی اس کی قلیل آمدنی میں بھی بڑی اچھی طرح گھر چلا رہی تھی۔ تورہ یان اس کی اس بات سے بے حد متاثر تھا۔ ''کمال ہے بھئی تم لوگ اتنی اچھی طرح اتنی کم آمدنی میں گھر چلا رہے ہو۔ تمہارے گھر موم بتی تو ہے نہیں۔ روشنی کیلئے اپنی انگلیوں کے ناخن جلاتے ہو؟''

جویان کی بیوی کھانے کا ایک دور بھی ضائع نہ ہونے دیتی۔ کھانا چاہئے سڑ جائے بس جائے۔ چوہے کتر جائیں مگر وہ کوڑے پر ڈالنے کی قائل نہ تھی۔ پھر اس کا یہ بھی تھا کہ محلے پڑوس میں کسی سے ملنا جلنا رکھتی ہی نہ تھی۔ چاہے کوئی مر جائے یا جی جائے نہ کسی میت یا جنازے پر جاتی۔ حد یہ کہ اس نے بھی تورہ یان کے گھر میں قدم نہ رکھا۔ شاید اس کا خیال ہو کہ اگر کہیں آ گئی

تو اس کی کھڑاویں گھس جائیں گی۔ حلیئے اور وضع قطع میں وہ اپنی ساس اوتانی سان سے بہت مشابہہ تھی ویسی کالی رنگت ویسا ہی چھوٹا سا قد۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ بڑبڑ نہیں کرتی تھی۔

....(7).............................

تورہ یان کی ساری عادتیں جوں کی توں تھی۔ وہی جوئے کی لت، وہی دنگا فساد کرنا اور رنڈی بازی وہ سارے ہی شوق رکھتا تھا۔ اب اس کی عمر بھی ستائیس سال ہوگئی تھی۔ وہ اپنا کاروبار بڑی سہولت سے چلاتا تھا۔ تورہ یان کو اب تک بیوی نہیں جڑی تھی۔ اگر چہ اس کا اچھا خاصا کاروبار چل رہا تھا۔ لیکن سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ اسے جوئے کی لت ہے۔ ظاہر ہے اس شوق اور عادت کی وجہ سے کوئی معقول لڑکی اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ تورہ یان کبھی اپنے بارے میں سچ بات سننے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ پڑوس والوں کی ایک بہت مقبول لڑکی کی نظر اس پر تھی۔ وہ خود بھی اسے پسند کرتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ لڑکی نے یہ کہہ دیا کہ جواریوں کا کیا ہے۔ جواری تو انسانوں کا کوڑا کرکٹ ہوتے ہیں۔ بس اتنا کہنا تھا کہ وہ بگڑ گیا۔ اس نے اس کو اٹھا کر پٹخ دیا۔ وہ لڑکی ایسی رفو چکر ہوئی کہ پھر نظر نہ آئی۔

اس وقت تک ڈینپو گاؤں کا قصبہ بن چکا تھا اور ڈین پوٹا گاؤں کہلاتا تھا۔ پر تورہ یان کا گھر ویسے کا ویسا اسی حال میں کھڑا تھا۔ اگر کوئی تبدیلی آئی تھی تو یہ کہ وہ اور پرانا ہوگیا تھا۔ اب گھر میں تورہ یان کے علاوہ صرف گونگی لڑکی اور اس سے چھوٹی والی بہن کیورہ گئے تھے۔ اور پھر کیو بھی کہیں پر خادمہ کے طور پر ملازم ہو کر چلی گئی۔ اور اب گھر پر تورہ یان اور گونگی رہ گئے۔ تسونی یان کا قاعدہ بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ چوتھے پانچویں روز ذرا دیر کو آنکلتا تھا۔ اور تورہ یان اس کو تھوڑی رقم کھانے پینے کے لئے پکڑا دیا کرتا تھا۔ وہ پیسے لے کر واپس چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھار یوں ہوتا کہ تورہ یان اکیلا بیٹھا ٹھنڈی ساکی پی رہا ہوتا۔ تو وہ کہتا

''آہا پی رہے ہو۔'' اور یہ کہتے ہوئی خود بھی شریک ہوجاتا۔ اور ایک پیالہ ساکی پی کر فوراً واپس چلا جاتا۔ اب تسونی یان کا آدھے سے زیادہ سر سفید ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے اور گدی کا رنگ بالکل بھورا ہوگیا تھا۔ کثرت شراب نوشی۔

اسی زمانے میں تورہ یان ایک نئے کاروبار میں مصروف ہوگیا۔ جیوٹ فیکٹری کی ناکارہ

مشینوں کو لوہے کے کباڑ کے طور پر چند سیٹ فی سیر کے حساب سے خرید کر وہ سکریپ خریدنے والوں کے ہاتھ بیچ دیا کرتا۔ اگر چہ اس میں زیادہ منافع کی توقع نہ ہوتی۔ تاہم اس کو منافع کمانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اس نے ترازو کے پلڑوں میں کچھ ایسا ہیر پھیر کیا تھا کہ وزن میں فرق لازماً آجاتا تھا۔ وہ خریداری کے وقت مال کم قیمت پر خریدنے کے گر سے بھی آگاہ تھا۔ یعنی نیلامی کے انچارج کو دے لے کر ملا لینا اور پھر اپنی مرضی کی بولی پر مال چھڑوا لینا۔ اور پھر اسی مال کو جب خود بیچتا تو ایک پیسہ کم نہ کرتا اور منہ مانگی قیمت ہی پر فروخت کرتا۔ اس طرح مارکیٹ میں اس کی شہرت ہی یہ تھی کہ وہ اپنی مقرر کردہ قیمت سے ایک پیسہ بھی کم کرنے کا قائل نہیں۔ اسی طرح کمیشن کے بارے میں بھی یہی تاثر تھا کہ وہ اپنے مقررہ نرخ سے تجاوز یا کسی بھی قسم کی کمی بیشی کا روادار نہیں۔ مشینری وہ فیکٹری کا نارکارہ مشینری کے طور پر خریدتا تھا۔ لیکن اس میں ایسی بھی مشینری تھی، جو تھوڑی سی مرمت کے بعد قابل استعمال بھی بنائی جاسکتی تھی۔ اس کی فروخت کے سلسلے میں اس کا نرخ مستحکم ہی رہتا تھا۔ دیکھنے والے یہ خیال بھی کرنے لگے تھے کہ وہ جس انداز میں پرانے مال کی خرید و فروخت سے منافع کمار ہا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ نئی مشینری منگانے اور فروخت کرنے پر بھی سرمایہ کاری کرنے لگے۔ لیکن تورہ یان ایسے کسی سودے میں ہاتھ ڈالنے کا قائل نہ تھا۔

گونگی اب اس عمر کو پہنچ گئی تھی جسے شادی کے قابل کہا جائے۔ مگر اس سے شادی کرتا کون! کھانا پکانے کا اسے ڈھب نہ تھا۔ سلائی کے نام ٹانکا بھرنا نہ آتا تھا۔ اور بھی کوئی ڈھنگ سلیقہ نہ تھا۔ اب تورہ یان یہ کرتا کہ دکان سے مچھلی لے آتا خود ہی پکاتا اور اکیلا ہی بیٹھ کر کھاتا اور شراب پیتا۔ اگر اپنے دھندے سے فرصت مل جاتی تو یہ بھی کرتا کہ باہر جا کر کھا پی لیتا۔ شام کے وقت جوا کھیلنے چلا جاتا۔ جب سے اس نے نیا نیا بلیئرڈ سیکھا تھا۔ تو بلیئرڈ بھی اس کو بہت پسند آ گیا تھا۔ لیکن یہ کھیل بھی وہ بازی ہی لگا کر کھیلتا۔ اس کو کسی معاملے سے دلچسپی ہی اس وقت ہوتی تھی جب اس پر بازی یا شرط لگی ہو۔ ورنہ وہ کسی معاملے میں بھی جوش و جذبہ کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ حد یہ ہے کہ شادی کے بعد، پہلے بچے کی پیدائش کا وقت آیا تو یہ حال تھا کہ بیوی کو گھر کے سامنے ایک بنچ پر بٹھا کر محلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ بھی شرطیں لگا رہا تھا کہ لڑکا ہو گیا یا لڑکی، اور بیوی کا تکلیف سے برا حال تھا۔

عام طور پر تورہ یان کنجوس اور خسیس ہی مشہور تھا۔ لیکن ایک تو وہ بے حد خوش گفتار اور باتونی

شخص تھا، اس کے علاوہ یہ تھا کہ شراب خانے وغیرہ میں وہ بڑے کھلے دل کا مظاہرہ کرتا تھا۔لہٰذا ایسی جگہوں میں موجود عورتوں میں بڑا مقبول تھا۔ وہ ان کے درمیان گھرا رہتا۔لیکن شروع میں تو وہ ان کی خاطر تواضع کرتا لیکن پھر وہی خست اور فطری تنگدلی عود کرنے لگتی تو اس کے گرد منڈ لانے والی تمام خواتین یکے بعد دیگرے سرک جاتیں۔ پہلے جب کسی نئی عورت سے راہ ورسم پیدا کرنا چاہتا اور وہ عورت اس کی ہم مذاق بھی ہوتی تو بڑی سخاوت دکھاتا۔کبھی قیمتی سا کیمونو خرید کر دے رہا ہے تو کبھی اس کی فرمائش پر کوئی اور چیز دلوار ہا ہے۔مگر جب اس کو احساس ہوتا کہ اس کا بٹوہ ہلکا ہو رہا ہے تو ایک دم پلٹ جاتا۔اس کے بعد وہ اس عوت سے پیسہ اینٹھنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑتا۔ حد یہ کہ بات بات پر قرض مانگتا۔سگریٹ تک کے پیسے اس سے ادھار مانگ لیتا۔ یہاں تک کہ وہ عورت بیزار ہو کر خود ہی کھسک جاتی۔ گذشتہ دو تین سال میں تو رہ یان سے تعلق کی بنا پر پہلے ایک شراب خانہ کی خادمہ کا پاؤں بھاری ہوا۔اور پھر پل کے دوسری جانب جو ایک نیا نیا کیفے کھلا تھا اس کی ایک خادمہ اسی کی نظر کرم سے امید سے ہوئی اور اس کا یہ انداز تھا جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔اس نے ان کے مطالبہ پر آدھی رقم بھی معاوضہ یا باہر جانے کے طور پر ادا نہ کی۔ ان کے انجام سے قطعی بے نیاز اس نے طوطے کی طرح آنکھ پھیر لی۔

ایک دن کیا ہوا کہ بیٹھے بٹھائے اچانک ہی تڑا تڑ دھڑا دھڑ موسلا دھار بارش پڑنے لگی۔ گرج چمک اور پانی کا شور تھا کہ الامان، آندھی اور طوفان کا یہ عالم کہ دکانوں کے سائن بورڈ اور مکانوں کے دروازے ہوا میں کھڑ کھڑاتے اڑے اڑے پھر رہے تھے۔جست اور ٹین کی چھتوں کی چادریں کاغذ کی دھجیوں اور چیتھڑوں کی طرح فضا میں بکھر رہی تھیں۔ چھتوں کی ٹائلیں اور اینٹیں برف کے گالوں کے مانند فضا میں بکھری پھر ہی رہی تھیں۔ پھر یکا یک لوگوں نے دیکھا کہ پل کے سامنے سے ایک سیاہ مہیب پہاڑ آندھی طوفان کی رفتار سے بڑھا چلا آرہا ہے یہ سب کچھ ایسا آناً فاناً ہو رہا تھا کہ کوئی یہ اندازہ بھی نہ کر سکا کہ یہ کالا پہاڑ، پانی کا یلغار کرتا ہوا ریلا ہے جو ادھر بڑھا چلا آتا ہے۔ پھر جب پانی نے ان کو آ ہی لیا تو چیخ پکار شروع ہوگئی۔ پانی، پانی اور پانی تھا کہ چشم زدن میں ان کی بغلوں تک آرہا تھا اور وہ گلے گلے پانی میں کھڑے تھے۔اور جب تک وہ چھتوں پر چڑھتے ، پانی نے انہیں ڈبو دیا۔ جو لوگ چھتوں پر چڑھ گئے تھے وہ بھی کب محفوظ تھے گاؤں میں ایک بھی دو منزلہ مکان نہ تھا۔ وہ لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں پر ہی پانی میں دفن ہو گئے۔

اتفاق تھا کہ تورہ یان کے گھر کی چھت پانی میں نہ ڈوبی۔ جب طوفان کا ریلا ختم ہوا اور پانی اترنے لگا تو وہ کمر کمر پانی میں چلتا ہوا گودام والے کمرے سے گھر کے ایک جانب گیا اور پٹرول کے چار خالی ڈرم لے آیا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کو جوڑ کر اور ان کی ڈاٹ بند کر کے انہیں تیرنے کے قابل بنا لے گا جس پر وہ اور گونگی بیٹھ کر پانی سے نکل جائیں گے۔ بہت سے بڑے بوڑھے لکڑی کے ٹپ پانی میں ڈال کر اس میں بیٹھ کر جیوٹ فیکٹری تک پہنچے اور انہوں نے اس کی چھت پر جا کر پناہ لی بہت لوگ تورہ یان کی طرح کمر کمر پانی میں اس طرح چل کر فیکٹری تک گئے کہ بچوں کو ڈرموں میں بٹھا کر ہاتھوں سے ڈرم کھینچتے رہے۔ تورہ یان نے بھی یہی ترکیب استعمال کی کہ کینو کا ہاتھ پکڑ کر کمر کمر پانی میں چلتا ہوا فیکٹری تک پہنچا۔ کینو پانی میں ٹھیک طرح چل نہیں پا رہی تھی۔ اس لئے اس کی کمر کو دونوں طرف سے پکڑ کر وہاں تک پہنچا لوگوں کا کہنا تھا کہ تورہ یان بڑا اچھا تیراک تھا۔ اور وہ پانچ برس کی عمر سے دریا کو تیر کر پار کرتا تھا۔ لیکن دریا اور بات تھی اور چڑھے ہوئے دریا میں ڈوبے شہر کو پار کرنا اور بات

پانی کا ریلا چڑھنا ایک مصیبت تھی لیکن پانی کا چڑھ کر اترنا زیادہ بڑی افتادہ تھی جو بیچارے چھتوں پر چڑھے اور پانی ان کے سر سے اونچا ہوا پانی اترنے پر مردہ ہی ملے۔ جو ڈوبنے سے بچے وہ بیمار پڑ گئے۔ پانی کو واپس جاتے ہوئے دیکھ کر لوگوں نے اس میں اپنی چیزیں پھینکنا شروع کر دیں۔ تمام چٹائیوں کا یہ حال تھا کہ گل کر حلوہ ہو رہی تھیں۔ اب اگر ان کو پانی کے ساتھ بہانہ دیتے تو یہ ڈر تھا کہ چیزیں جگہ جگہ پھنس کر پانی کی روانی میں رکاوٹ ڈالیں گی اور ٹھہرا ہوا پانی متعفن ہو کر سڑ جائے گا۔ پانی میں کھانے پینے کی اشیا کے ساتھ ساتھ غلاظت اور فضلہ پہلو بہ پہلو بہہ رہا ہوتا تھا۔ تورہ یان کے گھر میں کیا بچنا تھا سب کچھ بہہ گیا۔ کھانے پینے کی اشیا میں سے صرف ایک چیز ہی باقی بچی تھی وہ تھی آلو بخارے کی چٹنی۔ ایک بہت بڑے سے مرتبان میں جو مضبوطی سے بند پڑا تھا۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے مگر یہ چٹنی اوتانی سان نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ واقعی ایک معجزہ ہی تھا۔

جیسے ہی پانی اترا اور زندگی میں ٹھہراؤ آیا تو تورہ یان سب سے پہلے قصبہ کے چاول ڈپو پر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ پانی میں بھیگے اور سیلے ہوئے چاول خرید لے یعنی ایسے چاول جو نسبتاً کم سیلے ہوئے تھے اور ان کی نمی اتنی زیادہ نہ تھی۔ اس لئے کہ یہ ان بوروں کے چاول تھے جو اگلے بوروں کے بالکل پیچھے پڑے تھے اور ان میں پانی کم سے کم جذب ہوا، نمی بھی تو سیلن کی حد تک۔

اب اگر وہ یہ بات ڈپو والوں کے آگے کہہ دیتا تو وہ ہرگز یہ بورے اس کے ہاتھ نہ بیچتے اس نے یہ بھی کیا کہ پاس پڑوس کے ڈپوؤں سے اور دکانوں سے بھی ایسے تمام چاول خرید لئے۔ اور یہ تمام چاول اس نے سوکھنے اور خشک ہونے کے لئے اپنے گھر کے سامنے والی گلی میں پھیلا دیئے۔ ہوا اور دھوپ سے سیلے اور بھیگے چاولوں کی نمی جذب ہوگئی تھی لیکن وہ کچھ کچھ خمیرے ہو گئے تھے اور اس کے سامنے والی گلی ایک عجیب سی خوشبو سے بھر گئی تھی جس میں کچھ شراب اور الکوحل کی سی بو غائب تھی۔ تورہ یان نے یہ چاول ان فاقہ کشوں کے ہاتھ بیچ دیئے جو مہنگے داموں اچھے چاول نہیں خرید سکتے تھے۔ لیکن اچھے چاول سے آدھے نرخ پر بکنے والے یہ چاول جان لیوا بھی تھے۔ کیا تورہ یان لالچی اور نفع اندوز تھا؟ یہی تو سوچنے کی بات ہے۔ اس سیلاب میں اس کا باپ، اس کا بھائی اور بہنیں سب ہی زندہ رہے۔

تورہ یان نے سیلاب کے طفیل خوب پیسہ بنایا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ایک عدد عورت بیاہ لایا۔ یہ خاتون اہل طرب کے عشرت کدوں میں خدمتگار کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ تورہ یان اس عشرت کدے میں پیسہ لے کر جاتا تھا لیکن ابھی اس کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ کسی گیشا سے تعلق قائم کرتا۔ چنانچہ وہاں کی اس خادمہ سے اس کا ربط ضبط قائم ہوگیا۔ یہ خاتون عمر میں غالباً اس سے ایک سال بڑی تھی۔ اور تین بچوں کی ماں تھی۔

تورہ یان کی بیوی کوٹو کہلاتی تھی۔ یہاں تورہ یان کے ساتھ آنے سے قبل اس نے اپنے نو سالہ بیٹے کو اپنی ماں کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ اور ایک پانچ سال کے بیٹے کو اس کے پڑوسی نے گود لے لیا تھا۔ البتہ ایک چھ سالہ لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ کوٹو، کی اپنی عمر اس وقت انتیس سال تھی۔ تورہ یان اس کی زندگی کے ان پہلوؤں سے آگاہ تھا۔

کوٹو نے تورہ یان کی زوجیت میں آنا ایک تو یوں قبول کیا تھا کہ اس کو تورہ یان کا مزاج اور رکھ رکھاؤ پسند تھا جیسا کہ شروع شروع میں اس کے رویئے سے محسوس ہوتا تھا۔ پھر دوسری بات یہ تھی کہ اس کی خواہش تھی کہ اس گندے کاروبار سے نجات حاصل کر کے صاف ستھری زندگی اختیار کرے۔ دراصل کوٹو ایک صاحب حیثیت تاجر کی بیٹی تھی جو عزت دار شخص تھا۔ لیکن وہ سیانی ہوئی تو باپ کا کاروبار ختم ہوگیا۔ حالات کے پیش نظر انیس سال کی عمر میں اس کی شادی کر دی گئی۔ اور اس شوہر سے اس کا سب سے بڑا بیٹا پیدا ہوا۔ پھر اس نے اپنے خاوند کو چھوڑ دیا اور گشیا بن گئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس کو بچپن ہی سے فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی اور اس کے والدین نے

بچپن میں ان تمام فنون کی شوقیہ تربیت دلوائی تھی۔ چونکہ کوٹو کی شروع ہی سے یہ خواہش تھی کہ جلد از جلد بازارِ حسن وطرب سے نجات مل جائے تو اس نے ایک شخص سے شادی کر لی تھی۔ چھوٹے دونوں بچے اس خاوند سے تھے۔ لیکن وہ ایسا تھا کہ اس نے بچوں کی پیدائش رجسٹر ہی نہ کروائی۔ بات یہ ہے کہ یہ شخص فوجی بھرتی سے کسی طرح بچ نکلا تھا' بھرتی بھی کیا فوج کے ایک باقاعدہ دستے کو چھوڑ کر بھاگا تھا۔ اور وہاں اس کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اور اب بھی اس نے یہی حرکت کی کہ جب دو بچے ہو گئے تو ایک دن بغیر کچھ کہے سنے غائب ہو گیا۔ اب کوٹو اپنے تینوں بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر دوبارہ لوٹ کر اسی پیشے میں آ گئی۔ تورہ یان سے شادی کے بعد کوٹو جب حمام جاتی تو لوگ خصوصاً محلے والے اس پر انگلیاں اٹھاتے اور باتیں بناتے۔ ......دیکھو......وہ دیکھو میں نے کہا تھا نا کہ تورہ یان کی بیوی تو اس علاقے سے آئی ہے۔ باتیں بنانے کا بھی ایک سبب تھا کہ ڈین کے پورے قصبہ میں کوئی عورت بھی حمام اس ٹھسے اور قرینے سے نہیں آئی تھی۔ نہ ہی کوئی عورت ہر روز کوٹو کی طرح اپنے بال سنوار سکتی تھی۔ اس کی ہر بات میں ایک قاعدہ قرینہ تھا۔ کائن جو کبھی کبھار بھائی بھاوج سے ملنے آتی رہتی تھی۔ بھائی کے کان بھرتی تھی۔ بھیا اب تمہارے گھر میں تو کسی قسم کی آزادی اور بے تکلفی رہی ہی نہیں۔ میں تو یہاں بے تکلفی سے کھانا کھانے کو بھی ترس گئی ہوں۔ وجہ یہ تھی کہ کوٹو اب باقاعدہ ایک ایک کے آگے کھانا پلیٹوں اور پیالوں میں ڈال کر رکھتی تھی۔ کوٹو اب چاول دیگچی سے قاب میں ڈال کر پیش کرتی تھی یہ سب اہتمام تورہ یان کے گھر میں بالکل نئی بات تھی اور فضول تکلفات ہی سمجھا جاتا تھا۔

بھئی تورہ یان یہ تمہاری عورت کچھ زیادہ سخت اور کنجوس نہیں ہے کیا؟ یہ تو ایک پیالہ ساکی سے بھی کسی کو نہیں پوچھتی۔ تسونی یان کو بھی شکایت ہی رہتی تھی۔ باپ تو باپ۔ خود تورہ یان کا یہ حال تھا کہ ایک پیالہ ٹھنڈی ساکی باورچی خانے میں کھڑے کھڑے پینے کی مجال نہ تھی۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں یہ عادت ہو' کہ پکتے چاولوں سے ڈوئی ڈال ڈال کر پیچ نکالی اور پی لی۔ جب جی چاہا جیسے چاہا کھا لیا۔ ان کے لئے ان تمام باتوں پر بندش لگ چکی تھی۔ اب تو کوئی اپنی مرضی سے پتہ بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔ تورہ یان کو اب ہر موسم کے لحاظ سے چار موسموں کے جوڑے بھی تیار ملنے لگے تھے۔ کوٹو کی آمد کے سال بعد ہی ایک بچی پیدا ہو گئی۔ ابھی مشکل سے وہ اس کی صورت دیکھ پایا تھا کہ اس کو چین کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔

............................(8)............................

چین کے محاذ سے تورہ یان دوسال بعد واپس ہوا۔ اس کی واپسی کے کچھ عرصے بعد ہی تسونی یان کی وفات ہوگئی۔ اس کے بھوری رنگت ناہموار چیچک مارے چہرے پر ایک سفید رنگ کا مہاسہ سانکل آیا تھا۔ اب نہ ہی اس میں کسی قسم کی تپکن تھی نہ کوئی زخم یا منہ بنا تھا۔ اس لئے اس نے کوئی خاص پرواہ نہ کی۔ اگلے روز ایسے ہی سفید سفید دانے اس کے ہاتھ کی پشت پر نمودار ہوگئے۔ اب تو ہر روز ہی اس کے بدن پر کہیں نہ کہیں ایسے ہی دانے نظر آنے لگے۔ کچھ ہی دن میں پورے بدن میں پھنسیاں ہی پھنسیاں نظر آتی تھیں۔ اب یہ دانے پھوٹنے لگے اور ان میں سے چپچپا مواد رسنے لگا۔ چہرہ اور جسم تو پہلے ایک کھردار اونچے نیچے گڑھے پڑے چمڑے کی مانند تھا اب جو دانے پھوٹے تو ان کہ جگہ بننے والے داغ تو اور بھی گہری گہری کھائیاں ہی نظر آنے لگے۔ تورہ یان نے اس کا یہ حال دیکھا تو ہسپتال داخل کر دیا۔ ہسپتال میں ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ تسونی یان مر گیا۔ وفات کے وقت اس کا تمام جسم سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ مرتے وقت پورے جسم میں صرف آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

تسونی یان کی وفات کے بعد اوہاروسان واپس آ وا چلی گئی۔ وہاں اس نے ایک مچھیرے کی ملازمت کر لی۔ اس کی آخری عمر مچھلیاں لے جاتے اور ماہی گیری جال مرمت کرتے ہی گذر گئی۔ پلپلی اور بالکل سفید کھال والی اوہاروسان تسونی یان کے مرنے سے پہلے ہی کہا کرتی تھی کہ مجھے چکر آتے ہیں۔ ہر چیز گھومتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایک دن وہ ساحل پر بیٹھی بیٹھی گر کر مر گئی۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ کوئی خالہ شیگیجیما بھی تھی اور یہ کہ وہ ساحل پر چکرا کر گر کر مری یا ماہی گیری کے جھونپڑے میں دم دیا۔

تورہ یان جب محاذ پر گیا ہوا تھا تو کوٹو نے ایک کوریائی کو تورہ یان کے کاروبار کی دیکھ بھال کے لئے ملازم رکھ لیا تھا۔ اور کاروبار میں اس کی عدم موجودگی سے کوئی خلل بھی نہ پڑا تھا۔ واپسی پر اس نے اپنا کاروبار سنبھال لیا۔ اور اسی پرانے گھر کو از سر نو تعمیر کر لیا گیا تھا۔ تورہ یان کی واپسی پر کوٹو نے اس کے ہاتھ میں بینک کی ایک کتاب بھی تھما دی جس میں اچھی خاصی رقم جمع تھی۔

لیکن اس سب کے باوجود واپسی پر تورہ یان نے کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ تو ہر

روز جیب میں کچھ رقم ڈال کر تفریح کرنے نکل جاتا تھا۔ لگتا تھا جہاں وہ جاتا تھا وہ ایسی ہی عورتوں کا اڈہ تھا، لیکن اصل شوق اور لت جو اس کو لگی تھی، وہ ریس کی تھی۔ ان لتوں میں جو کچھ جمع جتھا تھا، وہ اس نے پلک جھپکتے میں ختم کر دیا۔ اب تو کوٹو اور وہ کوریائی ملازم ہی کاروبار چلا رہے تھے۔ اسی دوران کوٹو، کے یہاں لڑکا پیدا ہو گیا۔ لڑکے کی پیدائش کے دس دن بعد ہی سے کوٹو، پھر کاروبار میں لگ گئی۔ کبھی لوہے کے اسکریپ خریدنے ہوتے اور کبھی جیوٹ فیکٹری کی نیلامی میں بولی دینا ہوتی۔ یہ تمام کام وہ خود ہی نپٹاتی۔ لڑکے کی پیدائش کے دو ہفتے کے بعد اس نے ایک قلمی ٹائپ مزدور بھی ملازم رکھ لیا تھا جو بھاری مشینری وغیرہ کو اٹھانے رکھنے کا کام کرتا۔ بات یہ تھی کہ تورہ یان کی کاروبار میں عدم دلچسپی اور بے توجہی کی بنا پر اس کا پورا وقت ایسے ہی کاموں میں گذرتا تھا۔ وہ اگر چاہتی بھی تو یہ کام چھوڑنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن ایک بات ضرور تھی جب کبھی اتفاق سے تورہ یان گھر پر موجود ہوتا تو وہ کوٹو، اور کوریائی ملازم کو کاروباری معاملات کی اونچ نیچ سمجھانے کیلئے لمبے لمبے لیکچر دیا کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا کرتا تھا کہ جب تم لوگ اس محفوظ آسمان تلے چت پڑے آرام سے سو رہے ہوتے تھے تو اس وقت میں چینیوں کی بندوقوں سے نکلنے والی گولیوں کی زد میں ہوتا تھا۔ دیکھو جیسے ہم بھوسے کے پتلے تیار کر کے ان کو ہدف بناتے ہیں، چینی لوگ عورتوں، بچوں پر نشانہ بازی کی مشق کرتے ہیں اور ہم یہ دیکھا کرتے تھے کہ اگر گولی لگنے سے ان کا آدھا سر اڑ گیا ہے تو وہ اب بھی چل پھر رہے ہیں۔ گردن کٹے مرغ کی طرح، کہ بعد میں بھی دوڑا چلا جاتا ہے۔ اف توبہ بھئی عجب منظر ہوتا ہے۔

باپ کے مرنے کے بعد اب تورہ یان کے گھر جویان کا بس آنا جانا رہ گیا تھا۔ کبھی اس امید پر کہ اگر کاروبار میں کوئی کام یا ملازمت نکل آئے تو کچھ پیسے ہی بن جائیں، اور کوئی کام نہیں نکلتا تو پھر بھی امداد اور حصہ تو مل ہی جائے گا۔ کائن جونزس کا کام کر رہی تھی، تورہ یان کے گھر بہت کم آتی تھی۔ اکثر کوٹو جب گھر پر نہ ہوتی تب ہی وہ پہنچتی اور تورہ یان کو دروازے پر ہی پکڑ لیا کرتی اور بھائی سے پیسے اینٹھ لے جاتی۔ پگلی کیکو بھی اسی قصبے میں رہتی تھی۔ وہ بھی اکثر آنکلتی تھی۔ مگر اس کی آمد کا کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا۔ البتہ بغیر اطلاع ہی آٹپکتی تھی۔ وہ اب پانچ بچوں کی ماں تھی۔ عجب بات تھی کہ اس کے پانچوں بچے بالکل نارمل اور صحیح تھے۔

سب سے چھوٹی کیو جس جگہ ملازمت کر رہی تھی وہیں کے ایک ٹرک ڈرائیور سے شادی کر لی تھی۔ ساتھ والے گاؤں میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ اور اس کا یہ تھا کہ بھائی کے گھر

کی یاد اسے جب ہی آتی تھی جب اسے پیسے کی ضرورت ہوتی تھی۔اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ لے کر اب بچہ ہونے والا ہے، اب کوئی کام کرنا ہے۔پس جب بھی وہ آتی اپنے دکھڑے اور پیسے کے مطالبے ہی کے لئے آتی۔اب گونگی بھی بال بچوں والی ہوگئی تھی۔اور اسی قصبے میں رہتی تھی۔ اس کا شوہر ایک مضبوط تنومند اور لمبا تڑنگا آدمی تھا۔کیو گونگی شادی کے بعد صرف ایک ہی مرتبہ تورہ یان کے یہاں آئی تھی۔

اس کے بہن بھائیوں کے علاوہ کوٹو، کی ماں نے بھی ڈینپو کے قصبہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہ عورت بہت ہی غبی اور بے حد موٹی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی معصوم مسکراہٹ طاری رہتی تھی۔وہ ہتھ ریڑی پر کاٹ کباڑ بیچتی پھرتی تھی۔اپنے نواسے یعنی کوٹو، کے پہلوٹھی کے بچے کی پرورش بھی ان کے ہی ذمہ تھی۔

کوٹو، کے رشتے سے ان کے یہاں ایک ہستی اور آیا کرتی تھی۔وہ تھی کوٹو، کی بڑی بہن جو کچھ فاصلے پر اکیلی ہی رہا کرتی تھی۔وہ کوٹو، سے عمر میں کوئی بارہ سال بڑی تھی۔یعنی چالیس کے پیٹے میں تھی۔تین شوہروں کا غم اٹھایا پر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ایک ہی لت تھی اسے۔بس جوا کھیل کر دل بہلتا تھا اس کا۔اسی کی تورہ یان سے خوب بنتی تھی۔اور تورہ یان جب چاہتا سالی سے جوا کھیلنے کے لئے پیسے مانگنے آجاتا اور وہ اسے کبھی کوٹو کی طرح مایوس نہ لوٹاتی تھی۔فوراً پیسے پکڑا دیتی تھی۔ ان کا قول تھا کہ جوئے کے لئے پیسے سے انکار کرنا یا اعتراض کرنا نحوست اور بدشگونی کا باعث ہوتا ہے۔اس کے برعکس کوٹو، کبھی پیسے دینے پر راضی نہ ہوتی تھی۔وہ تو کہتی تھی اس سے تو خدا مجھے موت دے دے جو میں تم کو جوا کھیلنے کو پیسے دوں۔

کوٹو کی یہ ہمشیرہ محترمہ جو تھیں ان پر کسی دیوتا کا سایہ تھا اور وقتاً وقتاً وہ ان کے سر پر آتا رہتا تھا۔ایک مرتبہ ایسے ہوا کہ ایک دن وہ تورہ یان کے گھر مہمان آئی ہوئی تھیں کہ وہ آ گیا سر پر اور وہ تھیں کہ بیٹھے بیٹھے ہاتھ جوڑ کر اچانک ہی بھجن پڑھنا شروع کر دیئے۔کبھی جوڑے ہوئے ہاتھ آگے لے جاتیں پھر ہاتھ اٹھا کر سر سے اوپر لے جاتیں ایسا کرتے ہوئے ان کا تمام جسم لرز رہا تھا۔

ایک دن جب لرزہ ختم ہو گیا تو تکانو نے کوٹو سے کہا" تمہارے گھر کے پیچھے ایک سفید لومڑی ہے۔اور اس کی خواہش ہے کہ اس کی پوجا کی جائے۔اور اس کا نام چیو کیچی سان ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ صدر دروازے کے پہلے میں ایک مندر بنا دو۔"

چنانچہ تورہ یان کے کچے آنگن میں صدر دروازے کے پہلو میں ایک خوبصورت اور بارونق مندر بن گیا۔ اور کوٹو اس میں صبح شام شمعیں روشن کرنے لگی۔

ایک اور موقع پر ایک دن تکانو پھر کوٹو کے گھر پر اس شان سے وارد ہوئی کہ اس کے ہاتھ میں سانپ کی ایک کینچلی تھی۔ کوئی دو میٹر لمبی اور لاتے ہی سب کے سامنے لا کر ڈال دی اور فرمانے لگیں ''یہ دیکھو۔ یہ کینچلی، تورہ یان کے گھر کے پیچھے بہت مدت پہلے ایک سانپ رہتا تھا۔ یہ اسی کی کینچلی ہے۔ اور اس کا نام یونی کیچی سان تھا۔''

اب تورہ یان کے گھر صدر دروازے کے ساتھ والے مندر کے دونوں طرف چینی کے گلدان سجا دیئے گئے تھے۔ ایک جانب لومڑی کی شکل کے گلدان رکھے گئے تھے۔ دوسری جانب سانپ کی شکل والو پر یونی کیچی سان لکھا تھا۔ اس طرح مندر کی مورتیوں میں ایک مورتی لومڑی کی تھی جو تاجروں کا علامتی نشان ہے۔ ہر ماہ کی ایک مخصوص تاریخ کو کوٹو، اس کی پوجا پاٹ کیا کرتی تھی۔ اس طرح تورہ یان کا مندر ایک مکمل بت کدہ بن گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جب تورہ یان فوج میں گیا ہوا تھا ان دنوں کوٹو نے ایک نہایت نفیس بدھ کی مورتی خرید کر سجادی۔ حالانکہ وہ اس گھر میں بہت بے محل نظر آتی تھی۔ اسی گھر میں ایک طرف اوتانی سان اور تسونی یان کے مقبرے بھی موجود تھے۔ صبح صبح اٹھ کر کوٹو، سب سے پہلے بدھ کے آگے شمعیں روشن کرتی، پانی چڑھاتی۔ پھر شام کو پانی اور شمعوں کے ساتھ ساتھ تازہ پکے ہوئے چاولوں کا چڑھاوا بھی چڑھاتی۔ ہر تیسرے روز تازہ تازہ پھول چڑھایا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ شام کا وقت تھا اور کوٹو، دیوتاؤں کے آگے شمعیں جلا رہی تھی کہ اچانک ہی لومڑی کی شکل والا گلدان جو چو کیچی سان کے نام کا تھا، چٹخا اور اس کی دم جھڑ گئی۔ اور اسی لمحے اس کا کوریائی ملازم نہایت پریشانی کے عالم میں کہنے لگا کہ وہ اسکریپ آئرن کا ٹرک لے جا رہا تھا، اس کے نیچے ایک نامعلوم بچہ آ گیا ہے۔ لیکن شکر ہے کہ بچے کو اتنا نقصان نہیں پہنچا۔ صرف اس کی پنڈلی کی ہڈی کی قربانی دے کر بچے کو بچا لیا۔ لیکن تورہ یان تھا کہ اس نے نہ تو کبھی بدھ کے آگے سر جھکایا نہ ہی کسی دوسرے دیوتا کے آگے ہاتھ جوڑے۔ کوٹو، اس کی اس حرکت سے بڑی غیر مطمئن اور پریشان رہتی تھی۔

کچھ دن بعد کوٹو، کی ماں کاٹھ کباڑ بیچنے والی موٹی بڑھیا، مرگئی۔ وہ اتنی موٹی تھی کہ اس کو تابوت میں ٹھونسنا بہت مشکل تھا۔

..................................(9)..................................

اس واقعے کے کوئی دس یا پندرہ یا ہوسکتا ہے کہ بیس سال بعد تورہ یان کے ملک میں لڑائی لگ گئی۔اس مرتبہ کسی بدیسی ملک سے لڑائی تھی۔لڑائی بھی کئی سال تک رہی۔انجام کار تورہ یان کا گھر بھی اس آگ میں دوسرے تمام گھروں کے ساتھ جل گیا جو ایکا ایکی ہی آسمان سے آگ برسنے کے سبب جلے تھے۔ایک دم ہی آتش گیر بم ایسا برسنا شروع ہوئے کہ سب کچھ جل کر بھسم ہو گیا۔تورہ یان کا سارا اسکریپ سرکار نے اٹھالیا۔ایک کیل بھی نہ چھوڑی۔تورہ یان کا کاروبار ختم ہو گیا۔جیوٹ فیکٹری کے ساتھ والے مکان گرا دیئے گئے۔کہتے ہیں کہ اب وہاں پیراشوٹ تیار کئے جا رہے تھے۔تورہ یان کا مکان بھی ڈھا دیا گیا۔اس کا کنبہ ڈینپو کے قصبے کے مضافات میں جا بسا۔جو یان اور اس کی بیوی کے فلیٹ پر آتش گیر بموں کی ایسی بارش ہوئی کہ فلیٹ کے پرخچے اڑ گئے۔جو یان بیوی سمیت دب کر مر گیا۔تورہ یان نے فلیٹ کے ملبے کی کھدائی کروا کے بھائی اور بھاوج کی لاشیں نکلوائیں اور ان پر پٹرول چھڑک کر آگ لگوا دی۔اور چشم زدن میں دونوں سیاہ لاشیں جل کر راکھ بن گئیں۔

پگلی کیکو کے پانچوں بچے ان آتش گیر بموں سے بچنے کی کوشش میں ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے جل کر ختم ہو گئے اور ان کا باپ ایکیوسان کہتے ہیں کہ آگ سے بچ کر بھاگتے ہوئے دریا میں گرا اور ڈوب کر مر گیا۔

اس لحاظ سے کائن خوش قسمت تھی کہ اگرچہ اس کا گھر جل گیا تھا۔لیکن بچوں اور میاں کی جانیں بچ گئی تھیں۔چنانچہ وہ اپنا ٹبر لے کر تورہ یان کے گھر آ بیٹھی۔یہی غنیمت تھا کہ وہ خود دونوں بچوں اور شوہر سمیت زندہ سلامت بچ گئی تھی۔

گونگی کینو کا لمبا اور پتلا سا تنگ فلیٹ بھی جل کر خاک ہوا۔اس نے کہیں جانے کے بجائے وہیں ڈین پو کے مضافات میں چھپر ڈال کر کچی جھونپڑی بنالی اور اسی میں رہنے لگی۔اس کا لمبا تڑنگا شرابی خاوند مفلوج ہو گیا تھا۔۔جس کی وجہ سے اس کا نچلا دھڑ بیکار ہو گیا تھا۔کینو کی گذر اوقات اور کھانا پینا کیسے چل رہا تھا،کسی کو خبر نہ تھی۔نہ ہی کسی کے پاس اتنا فالتو وقت تھا کہ ایسی فکروں میں سر کھپاتا۔البتہ کوٹو نے کسی سے سنا تھا ایک افواہ سی کان میں پڑی تھی کہ گونگی کیکو

اب اندھی بھی ہوگئی ہے۔ اندھی اور گونگی کیکو اسی حالت میں دنیا سے گذر گئی کہ وہ تو کسی کو کوس بھی نہیں سکتی تھی۔

جنگ کے دوران تورہ یان بھی شکر قند بو کر اپنا گذارا کرتا۔ اسی پر منحصر نہ تھا، بلکہ اچھے اچھے لوگوں کو ایسے کام کر کے پیٹ پالنا پڑ گیا تھا۔ شکر قند اگا کر اور بیچ کر جو وقت ملتا تورہ یان کھانے پینے کی اشیا کی تلاش اور حصول میں گذار دیتا۔ خدا خدا کر کے جنگ ختم ہوئی جس کے نتیجے میں ملک اور قوم کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن تورہ یان فوراً ہی واپس ڈیپو پہنچ گیا۔ فی الحال وہ تنہا ہی وہاں گیا تھا اور وہاں اس نے اپنے تباہ شدہ کاروبار کو از سر نو زندہ کیا۔ دن رات محنت کر کے اتنا کر لیا کہ آئرن ورکس کے نام سے ایک کارخانہ چلا لیا۔ تورہ یان تو ڈین بو واپس چلا گیا تھا لیکن بچے اور کوٹو نہیں گئے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ واپس کوٹو اور بچوں کے پاس نہیں گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں پر تورہ یان نے ایک عورت کے ساتھ رہائش اختیار کر لی جو ایک معمولی سی شراب کی دکان چلا رہی تھی۔ اور بلیک میں شراب کا دھندا کر رہی تھی۔ کوٹو اور بچے وہیں قصبے سے باہر مقیم رہے اور کوٹو تورہ یان کو یہ کہہ کر گالیاں دیا کرتی تھی کہ ''تمہارا تو خون ہی خراب ہے اور یہ کہ تمہاری رگوں میں تو باپ کا خون اچھلے گا ہی۔ تم وہی کرو گے جو اس نے کیا تھا۔ وہ جو تمہاری اماں تھیں نا اوتانی سان وہ خالہ شیکیجیما سے حسد کرتی تھیں سو جل جل کر دیوانی ہو کر مریں۔ لیکن تم اس خیال میں نہ رہنا۔ میں مرنے والی نہیں میری جوتی کو پرواہ نہیں۔''

کوٹو بکتی جھکتی رہتی لیکن رات کو بستر میں لیٹ کر آنسو بھی بہا لیتی۔ اندر سے دل تو اس کا بھی بھاری رہتا تھا۔ جس سال لڑائی ختم ہوئی اسی سال یعنی تقریباً آٹھ سال بعد چالیس سے اوپر عمر میں ایک لڑکا اور پیدا ہو گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ تورہ یان ہی کا بچہ ہے۔ بھلا اس بمباری میں تو عیاش طبع سے عیاش طبع آدمی بھی عورت کے ساتھ شب باشی کا حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جب تین بچے اسکول جانے لگے تو کوٹو عموماً آتشدان کے پاس ہی بیٹھی رہتی۔ اسی زمانے میں کوٹو، اپنے ساتھ جو لڑکی لائی تھی وہ اب گھر میں نظر نہ آتی تھی۔ شادی ہو گئی یا خدا جانے کہاں چل دی تھی۔

کوٹو اپنے تینوں بچوں کو بٹھا کر کہا کرتی تھی ''دیکھو میں نے رات دن مشقت کی، جان ماری اور جب اس قابل ہو گئے ہم کہ سکون سے زندگی بسر کر سکیں، تو دیکھو کیا ہوا۔ بات یہ ہے کہ کبھی کوئی کسی جواری کو انسان نہیں بنا سکا۔ میں تمہارے باپ کو کیسے سدھار لیتی۔'' بچے اس کی باتوں پر زیادہ کان نہ دھرتے اور جب ایک مرتبہ شکایت اور الزام تراشی کا سلسلہ چل پڑتا تو بات

میں بات نکلتی آتی۔

''دیکھو کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ جب تمہارے باپ فوج میں تھے تو میں نے کوئی محنت سے محنت کی ہے۔ ارے میں نے تو اپنا رنگ تک جھلس دیا۔ میں نے تو یہی سوچا تھا نہ کہ کچھ پیسہ جڑ جائے گا۔ جو چار دن چین سے گذر جائیں گے۔ مگر اس شخص نے آتے ہی پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ اور پھر اب طوائف ہی جیسی تو وہ عورت ہے، جس کے ساتھ وہ اٹکا ہوا ہے۔ اب تو میری یہ سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ یہ شخص کرے گا کیا۔ واقعی سوچنے کی بات ہے۔''

لڑکی ان دنوں مڈل اسکول کی طالبہ تھی، اور لڑکا پرائمری میں پڑھ رہا تھا۔ سب سے چھوٹا نرسری میں تھا۔ وہ تینوں کے آگے رو رو کے کہتی۔ ''ذرا دیکھو اس کمبخت عورت نے کیا قابو کیا ہوا ہے۔ اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے کہ اپنی اولاد تک کے لئے اس کے دل سے پیسہ نہیں نکلتا۔ ارے تمہارے کھانے پینے کے لئے بھی تو کچھ نہیں نکلتا اس کے ہاتھ سے۔''

ماں کو روتا بلکتا دیکھ کر بچے حیران پریشان ہو جاتے۔ انہیں یہ خوف لاحق ہو جاتا کہ کہیں باپ ان کو فاقوں نہ مارے دے۔ اور ایک مرتبہ تو یہ ہوا کہ سب سے چھوٹا بچہ ضبط نہ کر سکا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ یہاں تک کہ کوٹو نے طمانچہ لگا کر اس کو چپ کرانا چاہا مگر اس کی ریں ریں بند ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کی دھاڑیں کم ہوئیں تو پیپری کی سی آواز نکلتی چلی گئی۔ اس کے رونے سے ماں تو خیر پریشان ہو ہی گئی بچے تو بالکل ہی بیزار ہو گئے۔

سب سے بڑی لڑکی نے اسکول کی پڑھائی ختم کرتے ہی پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ اپنے ہی اسکول کے ٹیچر کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ اسکول ٹیچر شادی شدہ اور دودھ پیتے بچے کا باپ تھا۔ کوٹو، چیخی چلائی۔ ''ارے یہ تیرے باپ کا خون ہے جو اچھل رہا ہے کہ تو ایک بال بچے والے مردوئے کو پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔ اچھا بھئی جو جی میں آئے کرو۔ ہم سے کیا۔''

(10)

تورہ یان اسی سرائے نماں شراب کی دکان کی دوسری منزل میں رہ رہا تھا۔ چھوٹے سے قصبے کی یہ دکان اسی چور بازاری والی مارکیٹ میں تھی۔ وہ وہیں سے بیٹھے بیٹھے ڈینپو میں اپنے لوہے کے کارخانے کو چلا رہا تھا۔ اب وہ بلیک مارکیٹ خرید و فروخت کا مرکز بن گئی تھی۔ اور وہ

چھوٹی سی شراب کی دکان اب جوئے کے اڈے میں تبدیل ہوگئی تھی۔لوگ یہاں ماہ جونگ کھیلنے آیا کرتے تھے۔لیکن تورہ یان اب تک اس عورت کے ساتھ اسی دکان کی دوسری منزل میں مقیم تھا۔ وہ عورت اگر چہ تورہ یان سے بارہ برس کے قریب چھوٹی تھی، لیکن بڑی ہوشیار تھی اور کاروباری سلیقہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔اسے صرف کاروبار ہی کا نہیں بلکہ تورہ یان جیسے مردوں کو برتنے اور قابو میں رکھنے کا بھی بڑا شعور تھا۔تورہ یان کو شیخیاں مارنے کا شوق تھا اور وہ یہ بھی نہیں برداشت کرتا تھا کہ کوئی اس کو ٹوکے اور اس کے جھوٹ کو پکڑے یا اس کے سامنے سچی سچی باتیں کرے۔ چنانچہ اس عورت نے اس کے سامنے کبھی سچ بول کر ہی نہیں دیا۔ یہ عورت کیوشو کے علاقے سے یہاں آئی اور یہیں بلیک مارکیٹ میں شراب کی دکان چلانے لگی۔

ایک مرتبہ تورہ یان گھر واپس آیا سیدھا دوسری منزل پر گیا تو کیا دیکھا کہ وہ خاتون ایک نوجوان کے ساتھ بستر میں گھسی ہوئی ہے۔اسے تورہ یان کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔تورہ یان چپ چاپ نیچے اتر گیا۔ پھر نیچے سے باروچی خانے میں کام کرنے والی چھری پکڑے واپس آ گیا۔اس وقت اس کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی ہو چکی تھی۔غرض وہ چھری ہاتھ میں لئے دوسری منزل پر پہنچ گیا۔تفصیل تو کسی کو نہیں معلوم کہ اوپر کیا واردات ہوئی۔البتہ اتنا سب کو معلوم ہے کہ تورہ یان کو تھانے میں بیٹھ کر معافی نامہ لکھنا پڑ گیا تھا۔

وہ اس عورت کے جوئے خانے کی دوسری منزل والے کمرے میں رہنے کے سوا کبھی کہیں اور جا کر نہیں ٹھیرا۔اور اس واقعہ کے بعد بھی وہ رات کو وہیں سوتا تھا۔مدت بعد ایک مرتبہ اس کی بیٹی نے اس کو فون کیا۔اس کے کارخانے میں فون تھا اور وہیں بیٹی کا فون آیا۔ظاہر ہے وہ اس سے کچھ اینٹھنا چاہتی تھی۔لڑکی اسکول ٹیچر کے ساتھ کہیں کسی اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی۔لیکن اس نے اپنے باپ کو اپنے اپارٹمنٹ کا پتہ نہیں دیا۔تاہم وہ سوشی کی دکان پر اس سے ملاقات کرنے گیا۔

وہ لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی شراب پی پی کر اس سے باتیں کر رہی تھی اور وہ اس احساس سے بڑا مضطرب اور بے چین سا ہو رہا تھا کہ اس کی اپنی بیٹی اس کے سامنے بے تکلفی سے بیٹھی پی رہی ہے۔اسے بہت ہی ناگواری محسوس ہو رہی تھی۔اور یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار یہی کہتا رہا ”دیکھو اپنی اماں سے ذکر نہ کرنا ان کو پتہ نہ چلے۔ پھر اس نے پیسے اس کو پکڑا دیئے اور وہ پیسے لے کر چلتی بنی۔“

تورہ یان نے جب خودکشی کی کوشش کی تو کسی کو بھی خودکشی کا سبب معلوم نہ ہوسکا کہ یہ حرکت اس نے اس عورت کی وجہ سے کی یا کاروبار میں نقصان کی وجہ سے۔ بہر حال اس نے یہ حرکت ضرور کی تھی۔ تورہ یان نے کسی کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اس نے کس چیز کی مدد سے یہ کوشش کی تھی۔ البتہ بہت عرصہ گذر جانے کے بعد ایک مرتبہ اس نے کہا کہ میں تو تقریباً مرچلا تھا۔ اس کی بات کا یقین اس کی لڑکی ہی نے کیا تھا۔ ورنہ وہ تو شیخیاں مارنے کا شائق تھا۔ اس نے اپنی ناکامی کا تو کبھی اعتراف ہی نہیں کیا۔ چنانچہ جب تورہ یان نے یہ بات کہی تو کسی نے اس کی بات کا یقین ہی نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے اور کوٹو، تو کہنے لگی ''بیوقوف۔ بھلا وہ آدمی بھی مرسکتا ہے۔ توبہ کرو۔''

لیکن جب وہ مصر ہوا کہ میں تو مرچلا تھا لیکن مرنہیں سکا تو اس کی بیٹی نے مذاقاً کہا ''ابا کہیں یہ بات تو نہیں کہ اب آپ میں کچھ رہ نہیں گیا ہے......اور اب کوئی عورت آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی؟ ابا ہے نا یہی بات؟''

تورہ یان ہنسنے لگا ''لو بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' لیکن لڑکی کو یقین تھا کہ وہ تقریباً ختم ہوچکا ہے۔

میں نے مرنے کا ارادہ کیا۔ اور میں تقریباً مرچلا تھا۔ یہ بات اس نے اپنی بیٹی سے دو تین مرتبہ کہی تھی۔ خیر ویسے تو وہ جی رہا تھا۔ وہ گاؤں جہاں تورہ یان پیدا ہوا تھا، اب قصبہ بن چکا تھا۔ لیکن ابھی اس میں اتنی زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی البتہ جیوٹ فیکٹری کے آس پاس متعدد فیکٹریاں وجود میں آچکی تھیں۔ جن میں مختلف مصنوعات تیار کی جاتی تھیں۔ اس علاقے میں دریا تھا اور شاید یہی سبب تھا کہ دریا کا پانی فیکٹریوں سے خارج ہونے والے کیمیائی ادویات فضلے کے گرائے جانے سے متعفن ہوگیا تھا۔ اور گاؤں میں داخل ہونے والے کو پہلا احساس یہی ہوتا تھا کہ سارا ماحول کسی میٹھی میٹھی بو سے بھرا ہوا ہے۔ یہ گیس کی بو تھی۔ چھوٹے سے چشمے کے کنارے کنارے کباڑیوں کی دکانیں پاس پاس قطار میں نظر آتی تھیں۔ یہ دکانیں ان چھوٹے دلالوں اور ٹھیکیداروں کی تھیں جو کارخانے کو اسکریپ آئرن سپلائی کر رہے تھے۔ جیسے کبھی خود تورہ یان کیا کرتا تھا۔ طویل دریا کے کناروں کے اس پار پٹرول کے خالی موٹروں اور زنگ آلود مشینوں کے ایک ڈھیر کی شکل میں انبار لگے تھے۔ بڑے بڑے کارخانے پاس پاس تھے۔ ان کی چمنیوں سے گندا پیلا دھواں برآمد ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں چمنیاں سرخ ارغوانی دھویں کے بادل اگل رہی تھیں۔

وہ تمام پودے اور جھاڑیاں جو دریا کے کناروں پر لہلہاتے نظر آیا کرتے تھے کنکریٹ اور سیمنٹ تلے آسودۂ خاک ہو چکے تھے۔

تورہ یان اپنی کوشش سے تو نہیں بلکہ اپنی بیماری سے موت کے آگے شکست کھا گیا۔ ہر مرتبہ جب وہ ساکی پیتا تو اپنا پہلو دبا کر کہتا۔ لگتا ہے یہاں کوئی پھوڑا ہے۔ یہ بد گوشت کی ایک رسولی تھی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ رسولی نکلوانے کی کوشش میں اس نے پیٹ میں چیرا لگوایا۔ تقریباً ایک فٹ لمبا شگاف ڈال کر اس کو نکالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن رسولی نکلنے کے بجائے خون کے جریان کے سبب اور بھی زیادہ پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ وہ مر گیا۔ اپنی موت سے تین دن پہلے وہ چلایا کرتا تھا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ بے ہوشی میں بھی اس کے منہ سے یہی نکلتا رہتا تھا۔ تورہ یان گھل کر بس ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ اس کے وجود کی علامت کھال اور ہڈیاں ہی نظر آتی تھیں۔ آخر کب تک اس طرح زندہ رہ سکتا تھا۔ مر گیا۔ اور کوٹو، جو ہسپتال میں تھی۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

''میں اس کو مرتے دیکھنا نہیں چاہتی۔''

کوٹو، تورہ یان کی موت کے دس برس بعد آج بھی زندہ ہے۔ اب بھی خیال آجاتا ہے تو تورہ یان کے خلاف بولنا شروع کر دیتی ہے۔ شکایتوں کا دفتر کھل جائے تو بند ہے۔ وہ مرے گی تو بھی ہرگز روئے پیٹے گی نہیں بلکہ وہ اپنی وفات کے سانحے کے لئے اپنے بچوں کو ہر روز تیار کرتی رہتی ہے۔ یہ کہہ کہہ کر کہ میرے بچے جوان ہیں سب کو پال پوس کر فارغ ہوگئی ہوں۔ اب اس دنیا میں میرا کوئی کام باقی نہیں۔ اور اگر کوئی باقی رہ بھی گیا ہے تو بھی ایسا نہیں کہ اس کے سبب مر بھی نہ سکوں۔ اس کے علاوہ مرنے سے خوف بھی آتا ہے۔

کوٹو کی بہن تکانو بھی ابھی زندہ ہے۔ اس کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ وہ ہر وقت کہتی ہے کہ بس اب بلاوا آنے والا ہی ہے اور میں اس کے لئے بالکل تیار ہوں۔ وہ ایک نرسنگ ہوم میں مقیم ہے اور نہایت صاف ستھرے لباس میں ملبوس وہاں بڑے سکون سے رہ رہی ہے۔ سال نو کے تیوہار بڑے پر تکلف اور ٹھاٹ کا کھانا اڑاتی ہے۔ ایک نئے سال کے موقع پر کوٹو کے بیٹے نے جسے برسہا برس پہلے اس نے گود لے لیا تھا۔ اس کو فون کیا اور کہنے لگا: ماں تم تو مجھے بھول گئی ہوگی لیکن میں یاد کرتا ہوں۔

جواب میں فون کھٹ سے بند ہوگیا۔

تا کاہاشی۔تکاکو

ارباب اقتدار

میں صبح صبح ڈاک لانے کے لئے نکلی تو پتھر کے فرش والا طویل راستہ جو صدر دروازے سے پھاٹک تک جاتا تھا، جاپانی پھل کے پتوں سے پٹا پڑا تھا۔ ہر طرف پتے ہی پتے بکھرے نظر آتے تھے۔

تمام رات بادِ خزاں چلتی رہی تھی اور تمام رات ہی ہمارے گھر کے عقب میں واقع جنگل روتا اور سسکیاں بھرتا رہا تھا۔ وہ دمہ کے مریض کی طرح ہانپتا اور کراہتا رہا تھا۔ تمام رات تاریکی کی دبیز تہیں ان آہوں اور سسکیوں سے مرتعش رہی تھیں۔ شام کو یہ ہوا تھا کہ ہوا کے جھکڑ چلنے سے کچھ دیر پہلے پتنگے اور پروانے دریچوں کی دراڑوں سے اندر گھس آئے تھے۔ اور رینگتے ہوئے پیلی تتامی کے چٹائیوں والے کمرے میں بھر گئے تھے۔ میں نے ان کو مارنا شروع کر دیا۔ لیکن جتنا میں ان کو مار رہی تھی، اتنی ہی کثرت سے وہ اندر کی طرف رینگتے چلے آ رہے تھے۔ اور آج صبح مطلع صاف تھا۔ ابر آلود آسمان کی سیاہی کی جگہ اب شفاف آسمان ہر سو پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے یہاں کراتاچی کی باڑھ کے ساتھ ساتھ جاپانی پھل کے تین بہت پرانے درخت کھڑے نظر آتے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ فائدہ ہے کہ باڑھ کے اس طرف خزاں رسیدہ پتے اتنے نہیں جھڑتے جتنے عمارت والے رخ کو گرتے ہیں۔ پت جھڑ کی ہواؤں سے جھڑنے والے ان پتوں کی رنگت بدل گئی تھی۔ زرد اور سرخ رنگوں کا ایک پیچیدہ سا امتزاج ان کے ہریالے پن پر چھایا ہوا تھا۔ اور

ایک دوسرے پر ڈھیر ہونے کے باوجود ہر ایک کا نمونہ ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف نظر آ رہا تھا۔ ان خزاں رسیدہ پتوں کے رنگوں اور نمونوں میں عجیب طرح کی جاذبیت پیدا ہوگئی تھی۔ جب وہ ہری ہری رنگت لئے بڑی توانائی سے درختوں کی ڈالوں پر لگے ہوئے تھے تو اس انداز میں مجھے متوجہ نہ کرتے تھے۔ میں ان کو بچا بچا کر بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ان کے اس رنگ وروپ کو اپنے قدموں تلے پامال کرتے ہوئے گذر جانا میرے بس کی بات نہ تھی۔

لیٹر بکس میں دو خط تو ہمارے بیٹے کے نام تھے۔ ایک میرے شوہر کے نام تھا اور ایک خود میرے لئے تھا۔ جب میں ان خطوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی تو مجھے اچانک ہی محسوس ہوا کہ خط پر جس کسی نے پتہ لکھا ہے۔

بخدمت مسز اکیکو متسو یاما

اس کی تحریر نے میرے اندر ایک عجیب سے احساس کو تازہ اور زندہ کر دیا۔ کچھ عجیب سا اور ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے اس خط پر میں نے خود اپنا پتہ لکھا ہو۔ اب ذرا سوچئے کہ آپ کو ایک خط ملتا ہے کہ جس کی تحریر دیکھ کر عجیب سی اپنائیت کا احساس ہو رہا ہے۔ لیکن کیوں؟ یہ بات ذہن پر واضح بھی نہ ہو پا رہی ہو۔ بس اس وقت میری ذہنی کیفیت کچھ اس نوعیت کی تھی۔ یہ بات سمجھنے سے پہلے کہ تحریر بالکل میری اپنی ہی لگ رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا احساس ہو رہا تھا کہ کوئی بڑی ہی آشنا اور مانوس سی چیز ہے جو میرے اندر داخل ہو رہی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے یقین سا ہو گیا کہ یہ پتہ میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن ایک بات یہ تھی کہ یہ جوابی لفافہ نہ تھا کہ جسے میں خود اپنا پتہ لکھ کر روانہ کرتی۔ ظاہر ہے یہ تحریر میری نہ تھی۔ اب مجھے اس بات کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ لفافہ پلٹ کر دیکھوں اور بھیجنے والے کا نام اور پتہ پڑھ کر معلوم کروں۔ وہ تو انداز تحریر خود ہی کہے دیتا تھا کہ قلم کی نوک کو کاغذ پر گڑ وگڑ و اور دبا دبا کر لکھنے کا انداز گویا گول سر والی نقشہ بلیک بورڈ پر لگانے والی پن (جو عام طور پر تھمب ٹیک کہلاتی ہے) کو لکھنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور بڑی محنت سے سنبھال سنبھال کر لکھا گیا ہے۔ ساتھ دلچسپ بات یہ تھی کہ ہر سطر کے خاتمے پر ایسا لگتا تھا کہ طبیعت اور انگلیوں کے تناؤ میں کمی آ گئی ہے۔ اور آگے چل کر تحریر میں اس احتیاط کے بجائے آزادی روی اور لاابالی پن نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ تحریر وہ تھی جو یقیناً میرے خط اور تحریر سے بڑی مشابہ تھی۔ اور میں سمجھ گئی اور سوچنے لگی: اچھا تو دیکھیں کہ آتسو کو ہماری یاد کیسے

آ گئی۔ اور ہتسو کو جس نے مدت سے مجھے خط نہ لکھا تھا۔ کیا کہتی ہے۔ پھاٹک کے سامنے کھڑے کھڑے ہی میں نے لفافہ کھول لیا۔ لکھا تھا

''اماں آپ کیسی ہیں؟ امید ہے ابا اور بھائی دونوں بخیر ہوں گے۔ چار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں کہ میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ اس وقت کے بعد سے جب آپ میری شادی میں شرکت کے لئے آئی تھیں۔ اب تو میری گود میں بچہ ہے۔ کوئی سال بھر کا ہے۔ اماں کیا آپ مجھ پر اس بات سے ناراض ہیں کہ میں نے آپ کو اطلاع کیوں نہیں دی کہ میں امید سے ہوں۔ اور حد یہ کہ بچے کی پیدائش کی اطلاع بھی نہ دی۔ میرا یہ خیال بالکل نہیں تھا کہ اگر میں نے آپ کو اطلاع دے بھی دی تو آپ میرے پاس نہیں آئیں گی۔

اماں ایک بات پوچھوں! یہ بتایئے کہ آپ نے ''نوہ'' ماسک کبھی ہاتھ میں پکڑ کر دیکھا ہے۔ بڑی ہی عجیب چیز ہے۔ جب میں اس کو دونوں ہاتھ میں پکڑ کر آگے کی طرف سے گھور گھور کر دیکھتی ہوں تو یہ بالکل سپاٹ نظر آتا ہے۔ اور اس پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ماسک کو ذرا پرے ہٹا کر غور سے دیکھا جائے تو ایک خفیف سے مختلف زاویئے سے تو اس پر معمولی سی جذباتی کیفیت نمایاں کیا، بڑے واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اور پھر یہی کیفیت جیسے چہرے میں ضم ہو جاتی ہے اور چہرہ پھر وہی سپاٹ کا سپاٹ نظر آنے لگتا ہے۔ اچھا اب اگر دوبارہ اس کا زویہ تھوڑا سا تبدیل کر دیں تو اچانک ایک مختلف کیفیت نظر آنے لگتی ہے۔ مگر یہ بھی لمحاتی طور پر ابھرتی ہے۔ پھر اچانک ہی منجمد ہو جاتی ہے اور چہرہ پھر سپاٹ ہونے لگتا ہے۔ سپاٹ ہی نہیں بلکہ عجیب سخت اور بے حس و حرکت کا تاثر قائم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہر دفعہ جب تاثر میں تبدیلی آتی ہے تو کوئی شے جیسے برآمد ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہ احساس بھی بڑا لمحاتی سا ہوتا ہے۔ چہرہ پھر اپنی سابق سپاٹ حالت پر واپس آ جاتا ہے۔ واقعی ماسک ایک عجیب و غریب ہے۔ اماں! کہیں میں نے آپ کو ناراض تو نہیں کر دیا۔ کیا آپ اپنی اس بیٹی کی بات کا برا مان گئیں جسے آپ نے ہمیشہ ناپسند کیا اور اس کا سبب جاننے کی بھی کوشش نہیں کی۔

یہ بہت پہلے کی بات ہے جب میں پہلی مرتبہ آپ کے چہرے کے تغیر سے آگاہ ہوئی تھی۔ پورا کنبہ یعنی ہم چاروں ایک موسم گرما میں ساحل پر اکٹھے گئے تھے۔ میں اس وقت پانچویں جماعت میں تھی۔ ہم لوگ کشتی میں اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ میں اور بھائی کشتی کے پچھلے حصے میں تھے۔ آپ اگلے حصہ میں بیٹھی تھیں۔ اور ابا درمیان میں تھے۔ یاد ہے نہ آپ کو۔ ابا ہمیں کشتی

کی سیر کے لے گئے تھے۔

اچانک بیٹھے بیٹھے مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ جب آپ کی بڑی بڑی آنکھیں ابا کے شانے سے گذرتی ہوئی سیدھی مجھے پر جمی ہوئی ہیں۔ میں حیران تھی کہ آپ مجھے اس طرح کیوں گھور رہی ہیں۔آپ کے چہرے پر بالکل وہ نوہ کی ماسک والا تاثر تھا۔ جب کشتی لہراتی تو آپ تھوڑا سا منہ بنا لیتیں اور آپ کے چہرے پر خفیف سا تاثر نمودار ہوتا۔ تاہم مجموعی طور پر چہرہ بالکل سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ میں اس طرح اپنے آپ پر ٹکٹی باندھ کر گھورنا بالکل برداشت نہ کر سکی اور بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ میرے اس طرح ایک دم کھڑے ہو جانے سے کشتی ڈگمگائی اور میں سمندر میں جا گری۔ ابا اور بھائی نے بمشکل مجھے نکالا تھا۔ یاد ہے نا آپ کو کہ میں پھر پیچھے جا بیٹھی تھی۔ چونکہ میری آنکھوں میں سمندر کا کھاری پانی گھس گیا تھا اس لئے میری آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔ آنسوؤں کے پردے کے پیچھے سے میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا تو آپ نے نظریں چرا لیں اور اپنا زرد چہرہ ترچھا کر کے منہ پھیر لیا۔ اور پھر بڑی دیر تک آپ خالی خالی آنکھوں سے دور کہیں کسی اور طرف دیکھتی رہی تھیں۔

اس وقت کے بعد سے آپ مجھ سے کبھی کبھار ہی بات کرتی تھیں۔ میں ہمیشہ اس بات پر حیران ہوتی تھی کہ آخر آپ مجھ سے ناراض کیوں رہتی ہیں۔ اس لئے کہ بھیا کی بھی تو آپ ہی ماں تھی۔ آپ کا رویہ بھیا سے کتنا مختلف تھا۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیا کرتی تھی کہ آپ اس قدیم روایت کو نبھانے کی کوشش کر رہی ہیں جس کی رو سے لڑکوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔ اور لڑکی کی پرورش میں بڑی سختی برتی جاتی ہے۔ کبھی کبھی آپ مجھے بڑی سختی اور رکھائی سے دیکھتیں۔ اور بڑی سرد مہری سے منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگتیں۔ چونکہ مجھے احساس تھا کہ آپ مجھ سے بلا وجہ ہی نفرت کرنے لگی ہیں اس لئے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد میں گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ اور میں نے گھر سے دور بہت دور کالج میں داخلہ لے لیا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ خود آپ کی بھی خواہش تھی کہ میں گھر سے دور چلی جاؤں۔ اور آپ خود بھی مجھے وہاں بھیجنے پر مصر تھیں۔

ہوسکتا ہے میری بعض باتوں سے جو میں نے لکھی ہیں، آپ ناراض ہو جائیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری گھر سے اتنی طویل غیر حاضری کا، یہ خط معذرت نامہ بن جائے۔

اچھا اب یہ ہے کہ اگلی جمعرات یعنی چوبیس اکتوبر کو میں پہنچ رہی ہوں۔ ایک لمبے عرصے

کے بعد آپ سب سے ملوں گی۔ میں آخری مرتبہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر گھر آئی تھی۔ اب اس بات کو بھی چھ سال ہو گئے۔ اور اتنی مدت کے بعد میں اس مٹی پر قدم رکھوں گی جس کی مہک میں آشنائی اور اپنائیت ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ آپ اور اس سرزمین کے درمیان حائل ہیں۔ اور آپ نے گھر اور پانی مٹی میری یادوں پر پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ اب چونکہ میرے شوہر کسی کاروباری غرض سے اس علاقے کا چکر لگانے والے ہیں۔ میں ان کے ہمراہ اپنی اولاد کے ساتھ آؤں گی اور آپ کے پاس ٹھیروں گی۔ تاکہ آپ ایک نظر اپنے گھرانے کی نئی نسل اور پہلی اولاد کو دیکھ لیں۔

منجانب ہتسوکو
18 اکتوبر
برائے
متسو یاما اکیکو

خط تہہ کر کے میں نے جیب میں ڈال لیا اور اندر واپس چلی گئی۔ پھاٹک سے صدر دروازے تک کا فاصلہ میں نے بڑے دھیرج سے طے کیا۔ جاپانی پھل کی خزاں رسیدہ پتیاں میرے قدموں تلے چرمراتی رہیں۔ ان کے اندر سے پھوٹتے ہوئے زرد اور سرخ رنگ کچل کر گڈمڈ ہوتے رہے۔ لیکن اب رنگوں کے اس لال پیلے حسن نے مجھے اس طرح متاثر نہیں کیا جس طرح اب سے کچھ دیر قبل کیا تھا۔ میں تو اس وقت کسی اور ہی سوچ میں تھی ''اچھا تو ہتسوکو کی گود میں بھی بچہ ہے۔ پتہ نہیں بیٹی ہے یا بیٹا۔''

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی میرے اندر ہتسوکو کے خلاف کوئی خاص جذبہ کارفرما تھا؟ کیا یہ درست تھا کہ میرا سلوک اور رویہ ابنارمل تھا۔ ایک دم غیر معمولی؟

جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں تو جذبات کے اسی جوار بھاٹا اور زیر و بم سے گذر رہی تھی جس سے دنیا کی ہر ماں کبھی نہ کبھی ضرور دوچار ہوتی ہے۔ جذبات کا یہ اتار چڑھاؤ ہوسکتا ہے بعض ماؤں کے لئے زیادہ خطرناک ہو۔ بیٹیوں کا مسئلہ ننھے ننھے سفید آبگینے زندگی کی دلدل کی سطح پر ابھرتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اور دلدل کی تہہ میں ان کے اسلاف اور خونی رشتے اور ناتے مدفون ہوتے ہیں۔ ان ہی اسلاف اور خونی واسطوں کی وساطت سے یہ ننھے ننھے سفید

آبگینے سطر پر ابھرتے ہیں تیرتے ہیں۔اگر چہ مائیں اس نسبت اور تعلق سے آگاہ بھی ہوتی ہیں تاہم ان کے اندر ایک خوف ہمہ وقت ان کو مضطرب رکھتا ہے۔کون جانے اس ننھے سے آبگینے کے وجود کی مدت قیام کیا ہے۔اس کو ایک وقت پھوٹ ہی تو جانا ہے۔کون جانے دلدل کی سطح پر نمودار ہونے سے قبل ہی ٹوٹ پھوٹ جائے۔کون جانے سطح آب پر آ کر بھی ہوا کے تند جھونکے کی ایک ٹھیس سے آبگینہ بکھر کر رہ جائے، معدوم ہو جائے۔اور فنا کی گود میں سو جائے۔ جہاں تک میں تجزیہ کر سکتی ہوں یقیناً میں بھی جذبات کے اسی جوار بھاٹا کے درمیان تھپیڑے کھاتی اور ان جانے خوف کی شدت سے سہمی رہی ہوں۔ وہ وہم اور خیال جو چھوٹے چھوٹے وقتی جذبے بن کر ان پر طاری ہوئے وہ میرے اندر کے محدب شیشہ سے گذر کر مہیب اور زیادہ شدید طور پر ہولناک انداز میں پروان چڑھتے رہے ہوں گے۔

میری چشم تصور میں اب بھی وہ کشتی، سمندر کے نیلگوں پانیوں پر ڈولتی ہوئی بڑے واضح طور پر موجود ہے۔ کشتی بڑے آرام آرام سے موجوں پر ہلکورے لیتی چلی جا رہی تھی۔ پانی کی ایک موج اچھل کر بیٹھ رہی تھی اور دوسری ابھرنے اور اچھلنے کو تیار تھی۔ابھی سمندر میں بھنور ڈالتی ہوئی اونچی اونچی موجیں نہیں اٹھ رہی تھیں بلکہ ہلکا ہلکا سا تموج تھا اور سطح سمندر کی خاموشی کی کوکھ سے پیدا ہونے والی موجیں ساحل تک پہنچتے پہنچتے پانی کی دھاریوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور ان دھاریوں کی موہوم رنگارنگی کے امتزاج سے ایک نمونہ سا بنتا جاتا ہے ۔ جیسے کوئی خوبصورت ڈیزائن تیار ہو رہا ہو۔موجوں کی روانی سست گام تھی۔اور ان کے تموج کے باوجود سینہ آب ساکت نظر آتا تھا۔ پانی کی سطح پر یہ بنتے بکھرتے وجود میں آتے اور معدوم ہوتے نقوش میرے خیال اور احساس سے عجب طرح ہمکنار تھے اور میں یہ سوچ رہی تھی۔سینہ بحر پر ابھرنے اور ابھر کر پھر چھپ جانے والے یہ لحاتی آبگینے، اس میں پڑتے ہوئے یہ چھوٹے بڑے بھنور اور موجوں کی شکست سے پیدا ہونے والی دھاریاں جو ساحل تک پہنچنے کی آرزو میں ایک خوبصورت نمونہ سا تیار کرنے کی دھن میں آتی اور جاتی ہیں، یہ سب کیا ہے؟ وہ مختلف صورتیں اور اشکال جو وجود بحر کی علامت ہیں۔اور وجود بحر کیا ہے؟ ایک سطحی نمود کا نام جس کے پاتال میں گہری تاریک کائی کی ٹھہری ہوئی سبزی کے سوا کچھ بھی نہیں۔غضب کا تضاد ہے کہ نہیں کہ اوپر تو رنگ و نور کا ایک خیرہ کن سیلاب اور تہہ میں پاتال میں کیا ہے؟ خاموشی، جمود، ٹھہراؤ اور اندھیرا۔اگر چہ میری پیدائش سمندر سے بہت دور ایک چھوٹے سے شہر میں ہوئی۔اور اتفاقاً شادی بھی اسی شہر

کے آخری سرے پر ہوئی اور اس طرح زندگی میں سمندر سے واسطہ محدود بلکہ نہ ہونے کے برابر رہا۔لیکن آج سمندر میری نظروں کے سامنے اس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے اس نے اپنے اندر چھپے تمام رنگ اور سارے روپ چشم بینا کی نذر کر دیئے ہوں۔ یہ سمندر کے عام روپ سے بہت مختلف تھے۔اور سمندر کا سارا جوار بھاٹا، بنتے بگڑتے نقوش کے سارے تغیرات گویا میرے اندر اترتے چلے گئے تھے۔اور وہی میرے چہرے کی سطح پر اس طرح ابھرتے ڈوبتے رہے ہوں گے جس کا نظارہ ہتسوکو نے اس وقت اس ننھی سی عمر میں کیا، اور جس کا ذکر اس نے اب اپنے خط میں کیا۔

میرے ذہن میں نوہ ماسک کے پرانے قدیم چہرے تازہ ہوگئے جنہیں میں نے مختلف معبدوں میں دیکھا تھا۔ یہ چہرے بڑے نادر تھے۔اور نوادرات کے ایک لکڑی کے فرش والے تاریک کمروں کی دیواروں پر آویزاں تھے۔اندھیری کوٹھریوں کی دیواروں پر آویزاں ہوا کی لرزش سے ہلتے رہتے تھے۔خاک، دھول اور گرد میں اٹے ہوئے ان چہروں میں سے مجھے شاکومی ماسک اب تک اچھی طرح یاد ہے۔ یہ ایک ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ تھا۔ چہرہ کیا تھا جذبات اور تاثرات کا ایک فانوس۔ابھی دیکھو تو متبسم ۔ پھر دیکھو تو ملول اور افسردہ، کبھی ناراض، کبھی خوفزدہ، کبھی پاگل پن کے آثار ہویدا، اور پھر دیکھو تو کچھ بھی نہیں، نہ دیوانگی نہ فرزانگی، نہ غم نہ غصہ ، نہ تبسم نہ تکلم۔اپنی ہی جگہ پر برقرار سپاٹ اور بے تاثر۔اور اس سپاٹ پن کا بھی ایک سبب تھا یعنی اوپر سے سپاٹ اور بے حس نظر آنے والے چہرے اپنے اندر جذبات کا ایک تلاطم چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہتسوکو نے یہ بھی غلط نہیں لکھا ہے کہ میں کشتی کی اگلی طرف بیٹھی ہتسوکو کو جو کشتی کے پچھلے حصہ میں بیٹھی تھی، مسلسل دیکھ رہی تھی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اس پر کڑی نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ کیوں؟ یہ میں فی الفور بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔تاوقتیکہ میں اپنے آپ کو ماضی کے ان لمحات میں واپس نہ لے جاؤں۔اس کے بغیر میں نہیں بتا سکتی اس کے لئے خود مجھ پر واضح نہیں ہے کہ میں ایسا کیوں کر رہی تھی۔

بہت عرصے پہلے کی بات ہے جب ہتسوکو تیسری جماعت میں تھی۔ بہار کی ایک شام مساؤ اور ہتسوکو حسب معمول پھاٹک کے باہر کھیلنے نکل گئے۔ان دنوں بچے اپنے باپ کی آمد کے حوالے سے وقت کا حساب کتاب رکھتے تھے۔اور چھ بج کر بارہ یا تیرہ منٹ کو ابا کا وقت کہتے تھے۔وجہ یہ

تھی کہ میرے شوہر ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل فیکٹری کے ٹیکنیکل ڈویژن میں کام کرتے تھے۔ یہ کارخانہ شہر کے بالکل ہی آخری سرے پر پہاڑ کے دوسری جانب تھا اور یہ پہاڑ ہی ہمارے چھوٹے سے ہائی شہر کی حد بندی کا کام دے رہا تھا۔ کارخانے میں کام کرنے والوں کے وہاں تک جانے اور آنے کا یہ تھا کہ ان دنوں ہر آدھے گھنٹے کے بعد ریل گاڑی اور بیس بیس منٹ پر بس چھوٹتی تھی۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا کہ ریل یا بس کو کسی وجہ سے دیر ہو جاتی ورنہ تو میرے شوہر ہمیشہ چھ بج کر بارہ یا تیرہ منٹ پر گھر پہنچ جاتے۔ اس وقت بھی میں باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھی کہ پھاٹک کی طرف سے آتے ہوئے میرے میاں اور بچوں کی ملی جلی آوازیں آئیں۔ وہ آپس میں باتیں کرتے آرہے تھے۔ میں ان ملی جلی آوازوں کی عادی تھی۔ وہ روزاسی وقت اسی طرح گھر میں داخل ہوتے تھے اور میں وہیں سے سمجھ جاتی کہ وہ آگئے ہیں۔ ان کی ہنستی بولتی آوازیں کانوں میں آتی تھیں تو میرا زندگی پر یقین پختہ ہو جاتا تھا۔ اگر میں اس کو خوشی اور مسرت کی علامت کہوں تو ہوسکتا ہے اس بات کو مبالغہ پر محمول کیا جائے' لیکن حقیقت یہی تھی۔
ان کی آوازیں سن کر میں باہر نکل آئی۔ جاپانی پھل کے پیڑ پر نئی کونپلیں اور پتے آگئے تھے۔ کراتاچی کی باڑھ کے ساتھ۔ وہ پیڑ بھی مطمئن اور سرسبز کھڑے تھے۔ آس پاس کی فضا میں ہریالی کی سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ پتوں اور فضا کی سبزی کا عکس میرے میاں کے چہرے پر بھی پڑ رہا تھا۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں سا نظر آرہا تھا۔ لیکن وہ پتوں کے عکس کی سبزی کی وجہ سے نہ تھا اس لیے کہ جب وہ درختوں کے سائے تلے سے نکل کر سامنے آئے تب بھی ان کے چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی نظر آرہی تھی۔ میں تو کسی کا چہرہ دیکھ کر ہی بھانپ لیتی ہوں کہ وہ کس قسم کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ لیکن اس طرح گھر میں گھستے ہی پوچھ گچھ کرنا مجھے کچھ مناسب نہ معلوم ہوا۔ میرے شوہر کی عادت تھی کہ وہ کھانا بے انتہا خوش ہو کر اور مزے لے لے کر کھاتے تھے اور آرام آرام اور اطمینان سے ختم کرتے تھے۔ لیکن اس دن ان کی چاپ اسٹکس بڑے دھیرے دھیرے اور بے دلی سے چل رہی تھیں۔ وہ بہت تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ میں کھانے کی چوکور میز پر ان کے مقابل بیٹی تھی اور ہتسوکو اور مساؤ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں تمہیں سکاڈ اتمپورا دوں؟'' یہ کہتے ہوئے مساؤ نے ایک جھینگا بڑی قاب اٹھا کر ہتسوکو کی چھوٹی پلیٹ میں رکھ دیا۔
''اچھا تو پھر میں تم کو کیچوے کا کاتمپورا دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر ہتسوکو نے قاب میں ایک پین

کی ڈنڈی پکڑ کر مساؤ کی پلیٹ میں ڈال دی۔

میرا طریقہ یہ ہے کہ کھاتے وقت آنکھیں نیچی کیے اپنے شوہر کی چاپ اسٹکس پر توجہ مرکوز رکھتی ہوں کہ انہوں نے کیا لے لیا ہے اور کیا لینا چاہیں گے۔ سیاہ لاکھ کے کام والی چاپ اسٹکس تموار کی قاب کی طرف بڑھیں۔ پھر تذبذب کے عالم میں انہوں نے دانی مچھلی کی قاب سے ایک چھوٹی سی مچھلی اٹھا کر دھیرے سے منہ میں ڈال لی۔ یوں چبانے لگے جیسے دانت کریدنے والا تنکا منہ میں ڈال کر چبار ہے ہوں۔ پھر ایسی ہی بے یقینی کے انداز میں ان کا ہاتھ پالک سر کے کے پیالے کی طرف بڑھا اور چاپ اسٹکس سے پکڑ لیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید آج ان کو بھوک نہیں ہے کہ اسی وقت انہوں نے اپنی چاپ اسٹکس چاولوں کے پیالوں میں رکھ دیں۔ پیالے میں چاول ابھی باقی تھے جو انہوں نے نہیں کھائے تھے۔ میں کہنے ہی والی تھی کہ کیا بات ہے آج طبیعت کیسی ہے؟ کہ خیال آیا کہ پہلے ان کو چائے تو پکڑا دوں لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی ان کی بھوک رفع نہیں ہوئی۔ اس لئے اب دوبارہ انہوں نے چاپ اسٹکس اٹھالی تھیں اور پلیٹوں، ڈونگوں اور قابوں اور پیالوں سے بھری میز کو بڑی غائب دماغی سے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے انہیں کسی چیز کی تلاش ہو۔ میں سمجھی کہ ان کو خوبانی کا اچار چاہیے۔ میں نے ابھی اچار کی چھوٹی سی پیالی اٹھانے کو ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ اسی وقت ہتسو کو کا ہاتھ بڑھا اور اس نے پیالی اٹھا کر ان کی طرف بڑھا دی۔ اور بولی

''ابا، آپ کو یہ چاہیے ہے نا؟ اومی بوشی؟''

میں نے اپنا ہاتھ وہیں روک لیا۔ اور وہ اٹھا کا اٹھا ہی رہ گیا۔ اچانک ہی میرا دھیان ہتسو کو کے ہاتھوں کی طرف چلا گیا اور میں نے غور کیا کہ اس کے اور میرے ہاتھ کی ساخت اور رنگت میں کوئی فرق نہ تھا۔ بجز چھوٹے اور بڑے کے۔

پھر وہ اپنے باپ سے مخاطب ہوئی ''ابو آج کچھ خراب ہے آپ کی طبیعت؟''

بالکل یہی فقرہ میری زبان تک آتے آتے رہ گیا تھا چنانچہ میں نے اس کی بات فوراً رد کر دی۔

''ارے نہیں بالکل ٹھیک ہیں۔ غور سے دیکھو جیسے روز ہوتے ہیں ویسے ہی ہیں۔''

''نہیں بھئی شاید ہتسو کو ہی ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' وہ ناتوانی سے مسکرائے۔ قاعدے سے تو مجھے اس بات پر فخر اور مسرت محسوس کرنا چاہیئے کہ میری نو سال کی بچی اتنی زیرک اور سمجھدار ہے۔

کسی کے چہرے بشرے ہی سے اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ کر سکتی ہے۔ تاہم کسی نامعلوم سبب سے مجھے یہ بات بری سی لگی اور جیسے دل میں کانٹا سا کھب کر رہ گیا۔ چہرے مہرے سے ہتسو کو باپ کی بہ نسبت مجھ سے زیادہ مشابہ تھی۔ وہی غلافی پپوٹے، ایک ذرا اوپر کو اٹھتی ہوئی ناک۔ اس کی جلد کی رنگت اس کے بال غرض ہر چیز میری ہی جیسی تھی۔ اس مشابہت کا مجھے شروع ہی سے احساس تھا۔ لیکن آج کے اس چھوٹے سے اور نہایت معمولی واقعہ نے اس مشابہت میں ایک گہیر معنویت پیدا کر دی تھی۔ اب مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک یہ چھوٹا سا ننھا سا ہم زاد ساتھ ساتھ موجود ہے۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد میری نند مجھ سے ملنے آگئیں۔ اس نند کے آنے سے مجھے ناگواری سی ہوتی تھی۔ وہ اس بات پر بہت اتراتی تھی کہ اس کی شادی ایک بہت بڑے شہر کے اونچے گھرانیت میں ہوئی ہے۔ وہ ہر وقت بڑے شہر کی شہری زندگی کی باتیں کر کے میری زندگی کا موازنہ اپنی زندگی سے کرتی رہتی تھی۔ بس یہی ایک ہتھیار تھا اس کے پاس مجھے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کا۔ اس نے آتے ہی حسب عادت وہی باتیں شروع کر دیں۔ ذرا سننے کی بات ہے۔ بیٹھے بیٹھے فرمانے لگیں

''بھابی آپ تو جیسی لا ابالی اور سہل پسند پہلے تھیں، اب بھی ویسی ہی ہیں۔'' یہ کہتے کہتے اس نے ہونٹ سکیڑے جو سرخ لپ اسٹک سے لال ہو رہے تھے۔ میں خوب سمجھ رہی تھی کہ یہ نیا طریقہ اور انداز بات کرنے کا کسی سے سیکھا ہے کہ دوسروں پر انچھر چھینکے جاؤ، گویا اگلا بالکل ہی احمق ہے۔ بات ہی نہیں سمجھتا۔ وہ جب بھی شہر سے آتی کوئی نہ کوئی نیا ڈھنگ، نئے طور طریق سیکھ کر آتی اور اس کا مظاہر بھی کرتی۔ پچھلے طریق اور فیشنوں کو یکسر فراموش اور نظر انداز کر دیتی۔

اس کی بات سن کر میں بھی ایک دم بھولی بن گئی اور ہنس کر پوچھا ''اچھا تو کیا واقعی میں لا ابالی اور سہل پسند نظر آتی ہوں؟''

حالانکہ میں ذرا بھی لا ابالی نہ تھی۔ آخر اپنی سسرال کا یہ قدیم اور اتنا بڑا گھر چلا رہی تھی جس میں ان لوگوں کی کئی نسلوں نے جنم لیا اور پروان چڑھیں۔ میں اس قدیم پرانے خاندانی گھر کو اپنی مرحومہ ساس کی وصیت اور ہدایت کے بموجب سنبھال رہی ہوں۔ میری ساس کا انتقال ہوا تو گھر اور اس میں موجود ہر فرسودہ اور پرانی شے فرنیچر سے لے کر کاٹھ کباڑ کو نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ اس سے تعلق خاطر بھی پیدا کیا۔ ایسی آشنائی اور انس کہ اب اس گھر کی ہر شے پر میری ہی

انگلیوں اور ہاتھوں کے نشان اور چھاپ ملے گی۔

''بھئی میں جب بھی یہاں آتی ہوں ایک رات گذارنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''ہاں اماں کے بغیر گھر برا لگتا ہوگا۔'' میں چائے بنا بنا کر دینے لگی۔

ہتسو کو میز سے کافی پرے بیٹھی تھی۔ ایک آنکھ بند کر کے ایک کھلی بغور میری نند یعنی اپنی پھوپی کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔''

''میں سمجھ گئی ہوں تم یہاں آ کر بے چین ہو جاتی ہو۔''

''یہ بات بھی نہیں، دراصل میں جب یہاں آتی ہوں تو بہت ہی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ بے حد مانوس لگتی ہے ہر شے۔ اتنی کہ ڈر لگنے لگتا ہے کہ جیسے میں اپنے زمانے اور وقت سے نکل کر پیچھے کی طرف اور بہت دور نکل گئی ہوں۔''

میری نند آنکھیں گھما گھما کر کمرے کو یوں دیکھ رہی تھی گویا وہ اس پورے کمرے کو اپنی آنکھوں کے محیط میں لے لینا چاہ رہی ہو۔

''دیکھو بات سنو! میرا گھر ٹھیک ہے یہ مجھے تمہارے بڑوں سے ورثے میں ملا ہے لیکن اب اس پر میرا اختیار ہے اور میں جس طرح چاہوں گی اسے رکھوں گی۔'' میں نے اس دفعہ بڑے جارحانہ انداز میں کہا۔

''ہاں یہی تو اصل بات ہے کہ آپ کے اندر تخیل اور جدت کی کمی ہے۔''

''مثلاً؟''

''ہتسو کو تم ایک بار میرے گھر آ کر دیکھو تو پتہ چلے کہ گھر کیسے رکھتے ہیں؟''

میری نند نے ہتسو کو کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

ہتسو کو نے منہ دوسری طرف پھیرا، اپنی ٹانگیں پھیلائیں اور ورزش کرنے لگی۔ اپنے پیروں کے انگوٹھوں کو اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے چھونے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے سامنے والے لکڑی کے برآمدے میں ایک سفید پروانہ اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔

''ہر چیز سے زیادہ تو رنگوں کی بات ہے۔ دیکھو نا دیواریں تو ہیں بالکل سفید اور اس پر سے تیز تیز رنگوں کے پردے ڈال رکھے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں بھابھی کہ آپ میں یہ ہمت ہے کہ پیلے اور ہرے جیسے بنیادی رنگوں کے لباس پہنیں؟''

میں خاموش بیٹھی رہی۔ دراصل میری نند بغیر کسی جھجک کے منہ اٹھا کر بولنا شروع کر دیتی ہے تو میں اس کی باتوں کا جواب دینے کے بجائے دم بخود ہو جاتی ہوں۔ میرے نزدیک بازی جیتنے کی ایک ہی ترکیب ہے فیصلہ کن، کہ اپنے مقابل اور حریف کی بات کا جواب نہ دیا جائے۔ ایک دم نظر انداز کر دو تو وہ چاروں شانے چت ہو جائے گا۔لیکن میری نند اس کا اور ہی مطلب نکالتی ہے۔ وہ میری خاموشی کو میری شکست سمجھنے لگتی ہے اور مجھے ایسی یک طرفہ قسم کی باتوں سے سخت کوفت ہوتی ہے اور میں کیک کا ڈبہ اٹھا کر جانے کے لئے کھڑی ہو گی

''بھئی آپ تو بالکل ہماری اماں مرحومہ پر گئی ہیں۔ ہمارے شہر میں تو یہ رواج ہے کہ جب کوئی اس قسم کی چیز تحفہ میں آتی ہے، تو وہیں پر لانے والے کے سامنے کھول لی جاتی ہے تاکہ مہمان اور میزبان سب مل جل کر لطف اٹھا سکیں۔ اور ہمارے اس گھر میں سدا سے یہ رواج ہے کہ اسے فوراً اٹھا کر باورچی خانے کی کسی الماری میں حفاظت سے رکھ دیا جاتا ہے اور وہاں پڑے پڑے اس میں پھپھوندی لگ جاتی ہے۔''

اس کی بات سن کر میں بیٹھ گئی اور ڈبہ میز پر رکھ دیا۔ میری نند نے ڈبہ کھولا۔ میں نے از سر نو پیالوں میں چائے ڈالی اور میں، ہتسو کو اور میری نند خاموشی سے کیک کھانے لگے۔

''میری بھنوؤں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

نند صاحبہ ایک دم ہی پھر بول پڑیں۔

''ہاں ٹھیک ہی ہیں جیسے پہلے تھیں ویسی ہیں۔'' اس کے میک اپ سے لیپے پوتے چہرے پر فقط ایک ہی چیز قدرتی نظر آتی تھی۔ سیاہ اور کمان جیسی بھنویں۔

''یہ زیادہ گھنی نہیں لگتیں؟''

''کیوں اچھی تو لگتی ہیں۔''

''میں نہ تو ان کو مونڈتی ہوں نہ ہی پنسل سے بناتی ہوں؟''

''ہاں بھئی تمہاری بھنویں اماں مرحومہ کی طرح ہیں۔''

''بھئی میں کسی اور جیسی نظر آنا نہیں چاہتی اور نہ ہوں۔''

''ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ اماں کی بھنویں اتنی نمایاں نہیں تھیں جتنی تمہاری ہیں۔'' مجھے مجبوراً کہنا پڑا۔

''ہتسو کو جانی! تمہارا کیا خیال ہے؟''

''کسی بارے میں؟''تسو کو کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھلی کھلی نظر آرہی تھیں۔

''تمہاری پھپھو کی بھنویں کچھ زیادہ گھنی اور موٹی نہیں ہیں کیا؟''

''نہیں تو...... بالکل بھی نہیں۔''

''اچھا سچ...... میرا تو خیال نہیں تم سچ کہہ رہی ہو؟''

پروانہ جو اتنی دیر سے برآمدے میں پر پھڑ پھڑا رہا تھا، میری نظر بچا کر اندر گھس آیا تھا۔ اور اب وہ چٹائی پر رینگ رہا تھا۔ اپنا جسم چٹائی پر رگڑ رہا تھا اور اس کے پروں سے سفید سفید پوڈر سا نکل رہا تھا۔

''بھئی تم کچھ بھی کہو۔ یہ ہیں بہت گھنی اور موٹی موٹی۔''اس نے اپنے بٹوے میں سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اس میں اپنی بھنویں خوبصورت ہیں۔''

''تو اور! یہ بالکل سچ ہے۔''

''اچھا بھابھی آپ بتائیں۔''

''ارے اچھی بھلی تو ہیں۔''

''نہیں! ہو ہی نہیں سکتیں۔''

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ چائے دان اٹھا کر میں نے یہ ظاہر کیا گویا میں تازہ چائے دم دینے جا رہی ہو۔ تسو کو ساتھ ہی کھڑی ہوگئی اور میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ پروانہ چٹائی پر اب تک پھڑ پھڑا رہا تھا۔ میں نے سوچا پاؤں کی ٹھوکر سے باہر گرا دوں۔ یہ جو تماشہ اس نے لگا رکھا ہے کہ مسلسل پھڑکے جا رہا ہے، وہ تو بند ہو جائیگا۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ تسو کو نے پاؤں مار کر اس کو گرا دیا۔ وہ برآمدے میں گرا، تسو کو نے اپنی کھڑاؤں والا پیر رکھ کر اس کو کچل ڈالا۔

اس مرتبہ بھی مجھے تو فخر محسوس ہونا چاہئے تھا کہ میری بیٹی نے میری نند کو گھاس نہ ڈالی اور اس کے ساتھ بے توجہی کے ساتھ پیش آئی۔ لیکن اس کے بجائے عجیب سے کوفت ہو رہی تھی جیسے میرے دوش بدوش کوئی عورت ہمہ وقت موجود ہے۔ اور ہر دم میری نقالی کر رہی ہے۔ اس خیال سے مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ اتنی کہ اب تک نند کی باتوں سے جو بیزاری اور کوفت میں محسوس کر رہی تھی اس کی جگہ تسو کو کی اس حرکت نے لے لی۔

یہ واقعی اچنبھے کی بات تھی۔ اب سے پہلے تسو کو کے ہاتھ نے میری سوچ کی اطاعت کی تھی اور وہی حرکت اس سے سرزد ہوئی جو در اصل میں خود کرنا چاہ رہی تھی۔ اور اب یہ دوسری بار تھی

جب اس کے پیر نے میری سوچ کی اطاعت اس طرح کی جیسے میرے خون کی گردش اور روانی میرے اندر سے نکل نکل کر باہر آ رہی ہے اور برقی رو کی طرح گرد و پیش کو متاثر کر رہی ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ ہتسو کو کے ہاتھ پیر اور اعصابی نظام میرے اعضا اور نظام پر حملہ آور ہو کر اس طرح حاوی ہو گیا کہ میرے ہاتھ پیر میری سوچ کے پابند نہیں رہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہتسو کو کے نظام اعضاء نے میرے اعضا کو شل کر رکھا ہو۔ یہ احساس جیسے میرے دل و دماغ سے چپک کر رہ گیا ہے۔ اب یہ بھی ہوتا ہے کوئی خیال ایسا چمٹتا ہے جتنا جھٹک کر دور کرنا چاہو وہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ ایسے عالم میں اور اس ذہنی کیفیت کے تحت اب میں ہتسو کو کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھ رہی تھی۔

ہتسو کو بچوں کے لئے ایک سلسلہ وار ناول کے لئے چندہ دیتی تھی اور ہر بار وہ بذریعہ پارسل ملتا تھا۔ وہ اسے کھولنے کے لئے اتنی بے تاب ہو جاتی تھی کہ جلدی جلدی پارسل کے ساتھ بندھی ڈوری کی گرہ کانپتی لرزتی انگلیوں کی چٹکیوں سے کھولنے کی بے صبری سے کوشش کرتی۔ گرہ اتنی مضبوطی سے لگی ہوتی تھی کہ کھلنے میں نہ آتی۔ زچ ہو کر وہ قینچی سے ڈوری ہی کاٹ دیتی تھی۔ پہلی کوشش ایک خاص سگھڑاپے سے شروع ہوتی اور خاتمہ لاپرواہی اور بے ڈھنگے پن کی اس حرکت پر ہوتا۔ اس کی اس بے تابی اور بے صبری کو دیکھ کر مجھے اپنی بے تابی اور بے صبری یاد آنے لگتی۔ جب میں اس کی عمر میں کسی ڈوری وغیرہ کی گرہ کھلونے میں بے تابی کا اظہار کرتی تھی۔ ہتسو کو کو اپنی پنسل کو چاقو سے گھڑنے کا شوق تھا اور وہ کبھی شارپنر استعمال نہ کرتی تھی۔ وہ بڑی تسلی سے بیٹھ کر بڑی مہارت اور صفائی سے دھیرے دھیرے لکڑی کو چھیلتی تھی۔ پنسل کی لکڑی چھیلنے کے بعد وہ اس کی نوک تراشنا شروع کرتی اور جس قدر صفائی اور سہولت سے تراشا جا سکتا تھا، اسے تراشتی۔ جو پنسل بالکل ہی چھوٹی رہ جاتی، وہ اسے بلا تامل پھینک دیتی۔ وہ اپنے پنسل کیس میں چھوٹی بڑی پنسلیں دیکھ ہی نہ سکتی تھی۔ ان کے رنگوں کی میچنگ کے اعتبار سے انہیں برابر جما کر رکھتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ اس کا پنسل کیس تو ہو بہو میرا اپنا کیس لگتا ہے۔ میں اپنی پنسلیں اسی ترتیب اور احتیاط سے سجاتی تھی۔ وہ پنسل جو کتابوں اور اپنی ڈائری کے قریب رکھا کرتی تھی۔ اس کی ایک اور عادت پر میں غور کرتی تھی کہ وہ جب کہیں باہر سے آتی تو اپنا رومال خواہ وہ میلا ہو یا نہ ہو گھر میں گھستے ہی واشنگ مشین میں ڈال دیتی۔ پھر جس انداز میں وہ جھپٹ کر بس میں یا ٹرین میں گھستی اور گھستے ہی جس تیزی سے تمام مسافروں سے پہلے خالی سیٹ پر قبضہ کرتی، ایک یہ حرکت اور ایک یہ کہ جس انداز میں وہ اپنی انگلی سے پروانے کو نیچے بلاتی

اس کی انگلی اس وقت تک اشارے کرتے ہی رہتی تھی جب تک وہ کھلے برآمدے میں اتر آتا۔ وہ تمامی پر بیٹھے پروانے اسی طرح اپنی انگلی ہلا ہلا کر وہاں سے ہٹایا کرتی تھی۔

میرے اور اس کے درمیان ہم آہنگی اور اتنی مشابہت بھی نہ تھی۔ ہماری بہت سی باتیں ایک دوسرے سے مختلف بھی تھیں۔ لیکن جن باتوں اور عادتوں میں مشابہت ہوتی، وہ میری نظر میں فوراً آ جاتیں اور میں ان کو فوری طور پر محسوس کر لیتی تھی۔ ان میں ایک ایسا توارد پایا جاتا گویا ہتسو کی ساخت میں سنگریزے اور لوہے کا برادہ شامل ہو اور وہ ایک مقناطیسی کشش اور قوت کے تحت نقل و حرکت کر سکتی ہو اور مقناطیسی قوت کی باگ ڈور میرے خیال اور ارادے میں مضمر ہو۔ اس کے چہرے مہرے، بند اور عادات اور خصائل کے جن جن حصوں اور زاویوں میں مجھ سے مشابہت تھی وہ تو میرے ذہن اور ضمیر پر سیاہ داغ بن چکے تھے۔

جہاں تک میری ذاتی عادتوں اور طریقوں کی بات ہے اس کے بارے میں ظاہر ہے کہ ہر بیٹی اپنی ماں کے ظاہری طور وطریق کی تقلید بھی کرتی ہے اور ان سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ میں مانتی ہوں کہ اس حد تک تو یہی بات ہے کہ بلا ارادہ اور بے خیالی میں وہ میرے طور وطریق کو اپنا لیتی ہے۔

لیکن ایک دن مجھ پر یہ انکشاف بھی ہو گیا کہ ہر وقت یہ بات نہیں ہوتی۔ ہوا یوں کہ ایک دن میں نے ہتسو کو سے کہا کہ بڑا گلدان لا کر ڈرائنگ روم کے طاق میں سجا دو۔ وہ گلدان اٹھانے گئی تو میں اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ گلدان اس کے لئے بہت بھاری ہو اور اس سے اٹھا کر رکھا نہ جائے، اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ وہاں پہنچی تو دیکھا کہ ہتسو کو جھکی ہوئی گلدان اٹھا کر طاق میں سجانے کی کوشش کر رہی ہے۔ گلدان کے بوجھ سے اس کے شانے بالکل چور نظر آ رہے تھے۔ اور ایک دم تنے ہوئے جیسے بوجھ کے دباؤ تلے اٹھانے والے کے کندھوں میں سختی آ جاتی ہے۔ پھر وہ کمرے سے نکل کر باہر جانے لگی اور جاتے جاتے ایک ذرا کی ذرا ٹھٹکی، مڑ کر طاق کی طرف دیکھا۔ واپس طاق تک دونوں ہاتھوں سے گلدان کو پکڑ کر درست کیا۔ لیکن اس خیال کے تحت اسے نہیں پکڑا تھا کہ وہ اس کی پوزیشن درست کرنا چاہ رہی تھی۔ بلکہ لگتا تھا جیسے وہ اپنے ہاتھوں سے چھو کر گلدان کی موجودگی کو محسوس کر رہی ہو۔ پھر وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔

میں نے وہیں دہلیز پر کھڑے کھڑے اسے واپس آتے دیکھ کر پوچھا

''تم واپس کیوں چلی گئی تھیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا تم واپس اس طرح گئی تھیں کہ گلدان کو چھو کر اطمینان کرلو کہ وہ وہاں موجود ہے یا نہیں؟''

''ہاں بالکل یہی بات ہے۔'' ہتسو کو ہنس پڑی۔

''اچھا تو تم میری نقل کر رہی تھیں؟''

''اماں! کیا آپ بھی ایسا کرتی ہیں۔'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں تو میں تو نہیں کرتی۔'' میں نے ذرا کڑے لہجہ میں کہا۔

''بات یہ ہے کہ میں اتنی بھاری سی ایک چیز وہاں تک لے کر گئی۔ واپس آتے وقت یوں لگا جیسے میں خالی ہاتھ لوٹ آئی ہوں۔''

''اچھا تو پھر؟''

''پھر کیا...... میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کیا وجہ تھی جو میں نے گلدان کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر دیکھا اور محسوس کیا۔''

''کیا خیال ہے تمہارا کہ تم نے اس کو دیکھ لیا، چھو لیا تو پھر تمہارے ہاتھوں کو چین آ گیا؟''

''کیا آپ جانتی ہیں یہ بات! پتہ ہے آپ کو؟''

''لو اور ہوئی، مجھے کیا خبر میں کیا جانوں؟'' میں نے پھر منفی انداز میں جواب دیا۔ لیکن اندر ہی اندر میں سوچ رہی تھی ''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہتسو کو مجھ سے صرف پیروی اور نقالی کی حد تک ہی نہیں متاثر ہے بلکہ اس کی سوچ میری سوچ کی مطیع اور پابند ہے۔''

چند دنوں میں اس کی حرکات و سکنات کا بغور اور مشکوک انداز میں مطالعہ اور مشاہدہ بڑی خاموشی سے کر رہی تھی۔ ان ہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آ گیا۔ وہ اس طرح کہ ہتسو کو کے اسکول میں گرما کی تعطیلات سے قبل استادوں اور والدین کی میٹنگ تھی۔ میں وہاں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئی۔ ہمارے ساتھ کئی اور لوگ بھی گئے تھے۔ ہم دوسری منزل کو جانے والے زینہ کے پاس انتظار میں کھڑے تھے۔ اسی اثنا میں کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم سب وہیں کھڑے تھے کہ اوپر کی کلاسوں سے نکلتے ہوئے، بچوں کے شور میں کچھ پریشان کن سی آوازیں سنائی دیں یہ آوازیں پورے اسکول کو ہی اپنی لپیٹ میں لے ہوئے تھیں۔ اتنے میں ایک نوجوان استانی جو تمام لڑکیوں میں ہر دلعزیز تھی، بھاگتی ہوئی اوپر سے نیچے کی طرف آئی اور ہم تمام والدین کے

پاس سے گذر کر نیچے اتر گئی۔ پھر ایک زبردست چیخ سنائی دی اور سات آٹھ لڑکیاں دوڑتی ہوئی دھمادھم اتر

کر کوریڈور میں جمع ہوگئیں۔ ان سب سے آگے سایوکو تھی۔ اور ان ہی کے درمیان ہتسوکو بھی نظر آ رہی تھی۔ یہ سب کی سب بڑے غضبناک انداز میں ایک برفانی تودے کی طرح اوپر سے نیچے کو آئیں اور اپنی ٹیچر کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ ان کے بھاگتے ہوئے قدموں تلے فرش کی لکڑی چر چرانے لگی اور دھول کا ایک ایسا مرغولہ سا اٹھا کہ اس کے غبار سے گرما کے سورج کی کرنیں بھی دھندلا گئیں۔ اسی دم ایک لنگڑی لڑکی نظر آئی جو اپنی لنگڑی ٹانگ کو موڑ موڑ کر زینہ زینہ قدم رکھتی ہوئی اتر رہی تھی کہ اچانک ہی نیچے آتی ہوئی لڑکیوں کا غول لپکا اور اس کو پکڑ لیا۔ اور میں نے وہیں کھڑے کھڑے جنگلے سے نیچے جھک کر دیکھا تو لڑکیوں کے ہجوم میں میری نظر اس کی ٹانگ پر پڑی جو پٹیوں سے جکڑی ہوئی تھی اور یہ جکڑا ہوا پیر اسایوکو کی پنڈلی میں الجھا ہوا تھا۔ جیسے کسی نے پنڈلی کو ہک لگا دیا ہو۔ سایوکو جو اس دوڑ میں آگے آگے ہونے کی کوشش میں مصروف تھی، نیچے گری پڑی تھی۔ اچانک ہی حیرت زدہ ہو کر لڑکیوں نے ایسی چیخیں مارنا شروع کر دیں جیسے جانور چلا رہے ہوں۔ اس تمام چیخ پکار میں سایا کو آخری زینے کے پاس اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

''یہ سب اس لڑکی کا کیا دھرا ہے۔'' ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ہتسوکو کی تھی۔ اس نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے زینہ کے درمیان کھڑی لنگڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ہتسوکو نے اشارہ کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو میں نے دیکھا اس کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس دن اسکول میں اس کی کلائی میں موچ آ گئی تھی۔ یہ دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں برف کی ایک سلاخ گھستی چلی گئی ہے۔

''یہ سب اس لئے ہوا ہے کہ اس نے سیڑھیوں پر ہمارا راستہ روک رکھا تھا۔'' ہتسوکو غصہ سے دہکتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم اس سے ٹکرا گئی تھیں۔'' نوجوان استانی نے اوپر جا کر اس لڑکی سے دو یا تین قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو کر لنگڑی لڑکی سے سوال کیا، بولو تم گری تھیں اس پر...... بتاؤ؟''

''اول!'' سہمی ہوئی لڑکی کی آنکھوں میں خوف اور دہشت تھی۔

''اوں...... اوں سے کیا مطلب ہے۔ ٹھیک سے میری بات کا جواب دو۔''

لنگڑی لڑکی جواب دینے کے بجائے خالی خالی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی۔

اس کی اس حرکت پر استانی نے اونچی آواز میں کہا

''ارے بھئی بتاؤ تم میں سے کسی کو معلوم ہے اس اوں کا مطلب؟''

لڑکیوں نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اسی وقت کسی طرف سے ایک نرس آ گئی اس نے سایوکو کو اٹھا کر پیٹھ پر لا دلیا ور اسکول کے کلینک میں لے گئی۔ استانی نے اب تک لنگڑی لڑکی کی جان نہیں چھوڑی تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نہ کہ تم جب نیچے اترا کرو تو جنگلہ پکڑ لیا کرو۔''

''میں نے پکڑا ہوا تھا۔''

''پھر تو ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔''

''میں نے تو کچھ نہیں کیا......''

''تم نے نہیں کیا تمہارے پیر نے تو کیا۔'' اس کے ساتھ ہی ایک اور زوردار قہقہہ طالبات میں سے بلند ہوا۔ اب میرا دل اس میٹنگ میں شریک ہونے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے میرے دماغ کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرا سر گھوم رہا ہے۔ جیسے میرا دماغ پانی میں تیر رہا ہے۔ جیسے وہ ایک دم ہی بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ چنانچہ میں میٹنگ میں شرکت کئے بغیر ہی واپس آ گئی۔

کچھ دن کے بعد ہم لوگ ساحل پر گئے۔ دراصل یہ پروگرام میرے میاں نے بنایا تھا کہ مساؤ اور ہتسو کو ابھی تک دریا ہی میں تیرنے کا تجربہ تھا، اب وہ ان کو دن کے لئے ساحل پر لے گئے تھے کہ وہاں پر تیرنے کی مشق اور تجربہ کر سکیں ساحل پر ہم دوپہر سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ میرے میاں اور دنوں بچے وہاں پہنچتے ہی تیرنے کے لئے چل دیئے اور مجھے تنہا چھوڑ گئے۔ سہ پہر کو ہم چاروں کشتی کی سیر کو گئے۔ میرے میاں جو کالج کے زمانے میں بوٹ کلب کے صدر تھے اور بہت اچھے کشتی ران تھے، ہمیں لے کر دور تک سمندر کی سیر کرانے لے گئے۔ ہم کافی دور نکل آئے تھے۔ زمین اور خشکی کا حصہ اب بہت پتلی سی لکیر کی مانند نظر آ رہا تھا۔ جیسے کسی نے پنسل سے ایک باریک لکیر کھینچ دی ہو۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا گیا سمندر کی ابھری ہوئی سطح پر ہمارے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ بس ہم چاروں ہی اس مقام پر موجود تھے۔ اور میرے سامنے میرے میاں کی پشت تھی جس کو سورج کی تمازت اور دھوپ کی حدت تک نے سنولا دیا تھا۔ اب وہ پتوار ہلانے کی

وجہ سے ایک گلابی داغ کی طرح میری آنکھوں کے آگے پیچھے ہو رہی تھیں۔ جس سے میری آنکھوں میں چکا چوندسی ہو رہی تھی۔ روشنی ایک دھول کی طرح میری نگاہوں پر چھائی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ مساؤ اور ہتسو کو کی مرتعش آوازوں میں عجیب سی بھیگی بھیگی آب وتاب اور دمک کا احساس ہو رہا تھا۔

''اتنا مت ہلے جاؤ۔''

''میں چپ بیٹھے بیٹھے بور ہو گئی ہوں۔''

''دیکھو اب ہم جزیرے کی طرف جا رہے ہیں۔ اب بس بیس منٹ اور لگیں گے۔''

''میں اماں کے پاس جاؤں گی۔''

''تم کشتی میں کھڑی نہیں ہو سکتیں گر جاؤ گی۔''

''جی مجھے تیرنا آتا ہے۔''

''تمہیں معلوم نہیں ہے وہاں شارک ہوں گی۔''

''کیا یہ سچ ہے ؟'' ہتسو کو کا سوال مجھ تک پہنچا۔

میں نے سمندر کی سطح پر جھکا ہوا اپنا چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ اپنے باپ کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔

''بالکل یقیناً'' میرے شوہر نے کہا ان کی آواز جیسے ہنس رہی تھی۔

''آپ نے کبھی دیکھی ہے شارک۔''

''تو اور کیا۔ جب ابا لڑائی پر جنوبی سمندروں کی طرف گئے۔ توبہ بڑے بڑے شارک دیکھے تھے۔'' مساؤ نے ہاتھ اونچا کر کے شارک کی لمبائی بتائی۔

''مگر یہاں تو نہیں ہوں گے۔''

''بھئی جب ہتسو کو پانی میں گر جائے گی نا تو پھر وہ فوراً جنوب کے سمندروں سے بھاگتے ہوئے آجائیں گے۔'' میرے میاں مساؤ کے ساتھ مل کر ہتسو کو کو چھیڑتے رہے۔

اس وقت میری نظروں کے سامنے ایک مسرور اور خوش باش تصویر تھی جو سمندر اور آسمان کی تحلیل ہوتی ہوئی روشنیوں میں بہت شفاف اور نمایاں محسوس ہو رہی تھی۔ میرے میاں کے بائیں کندھے کی طرف نیوی بلیو جانگیہ میں مساؤ بیٹھا تھا۔ اور دائیں جانب کالی سوئمنگ کاسٹیوم میں ہتسو کو بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ میں ہتسو کو کے مقابل اسی کی طرف منہ

کئے بیٹھی ہوں اور اس طرح اسی پوزیشن میں بیٹھے آدھا گھنٹہ ہوگیا ہے۔ یوں کہ رخ بدلنے کا موقع ہی نہ تھا۔حتیٰ کہ کشتی ساحل پر واپس آ گئی۔

اس وقت اپنے مقابل بیٹھی ہتسو کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے مجھے لگ رہا تھا کہ میں آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی ہوں۔ وہ دیکھنے میں میری طرح تھی۔اس کی عادتیں میری جیسی تھیں۔اس کے محسوسات بھی میرے ہی جیسے تھے۔ یہ بھی کوئی ایسی خاص بات نہ تھی۔ دراصل مجھے تو اس واقعے کا دکھ تھا جو چند روز پہلے ہتسو کو سے سرزد ہوا۔اس کے ساتھ ہی میرا اپنا ایک تجربہ میرے ذہن میں تازہ ہو رہا تھا،لیکن اس وقت جبکہ سطح سمندر ڈوبتے سورج کی طلائی روشنیوں سے معمور تھا۔اور میرے شوہر اور بچوں کی خوش باش آوازوں میں کسی قسم کے ملال یا تاسف کا شائبہ بھی نہ تھا۔ایسی کسی بات اور واقعہ کا اعادہ بے معنی تھا اور واقعہ بھی کوئی دس سال پہلے کا:

ہمارے اسکول ٹیچر ایک بوڑھے آدمی تھے جن کو تمام بچے سخت ناپسند کرتے تھے،ان کی مکاری کی وجہ سے۔ان کے بال بچے نہ تھے۔اور اکثر وہ سکول ہی میں سو جاتے تھے۔رضا کارانہ طور پر اسکول کی چوکیداری کی خدمات بھی پیش کر دیا کرتے تھے۔ان کے پاس مچھلیاں پالنے والا ایک بلوریں مرتبان تھا جس میں ایک اکیلی سنہری مچھلی پڑی رہتی تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے وہ پڑھاتے پڑھاتے کلاس چھوڑ کر چوکیدار کی کوٹھری میں جا کر مچھلی سے باتیں کیا کرتے تھے۔ کہو بھئی کیا حال ہے سنہری مچھلی۔'' ایک دن یہ ہوا کہ میں نے اسکول کے بعد خود اپنے طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں کہ میں آپ کی مچھلی والا مرتبان دھو کر صاف کر دوں گی۔ چنانچہ میں اور میری ہم جماعت یاشیکو مل کر ان کی مچھلی کا مرتبان صاف کرنے پہنچے۔ماسٹر صاحب روز اس کا پانی تبدیل کرتے تھے۔اس لئے پانی بالکل صاف تھا۔تاہم مرتبان کا کنڈا اور اوپری حصہ جس پر ہاتھوں اور انگلیوں کے نشان تھے' کے علاوہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔وہ بالکل دھندلا دھندلا نظر آتا تھا۔ یوشیکو میری ہم جماعت ہونے کے علاوہ میرے پیچھے بھی ہر دم لگی رہتی تھی۔وہ ہر وقت میری نقل کرتی تھی۔ چنانچہ اس کام میں بھی وہ میرے ساتھ ساتھ ہی چوکیدار والے کمرے میں پہنچی۔ ہمارے ٹیچر نے بڑی منت سماجت سے کہا دیکھو بڑی احتیاط سے پکڑنا ایسا نہ ہو کہ ٹوٹ جائے۔ بہر حال ہم دونوں نے اس کا ایک ایک کنڈا پکڑ کر اٹھایا اور لے کر چلے۔ پیچھے سے ماسٹر صاحب کی آواز چلی آ رہی تھی۔ دیکھنا۔ سنبھل کے......احتیاط سے' احتیاط سے۔ خیر اب ہم اس کو لے کر اسکول کے میدان کی طرف چلے گئے۔ مرتبان بڑا بھاری تھا۔ جسے اٹھانا مشکل تھا۔ایک بار میں

نے مڑ کر دیکھا تو ماسٹر صاحب کھڑکی سے منہ نکالے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ان کے چہرے پر وحشت اور پریشانی برس رہی تھی۔مرتبان کو اٹھانا واقعی محال تھا۔ایک تو بھاری اوپر سے اندر کا پانی بُری طرح اچھل رہا تھا...... میرے تو ہاتھ پھولنے لگے۔جتنی جتنی وحشت بڑھ رہی تھی اسی قدر اعتماد کی کمی ہوتی گئی۔اور اب تو واقعی ڈر لگنے لگا تھا۔اور مجھے یہاں سے اور اس جگہ تک کا فاصلہ جہاں نلکے کی ٹونٹی لگی تھی بہت کٹھن اور دشوار نظر آ رہا تھا۔اس کے ساتھ ہی ان کی متواتر اور مسلسل ہدایات اور تاکیدیں ایک تو ''دیکھنا سنبھل کر، ہوشیاری سے۔احتیاط سے۔'' میدان کے اس حصہ میں جہاں دھوپ نہیں پہنچتی تھی، کائی جمی ہوئی تھی۔دوسرے یاشیکو کی سانسوں کی کھٹی کھٹی بو الگ نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔اچانک ہی مجھے سخت تھکن محسوس ہونے لگی اور میرا ایک جوتا کائی پر پھسل گیا۔اس کے ساتھ ہی وہ بڑا سا مرتبان ہاتھ سے چھوٹا اور ہوا میں معلق ہو گیا۔پھر زمین پر گر کر شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور پانی بہنے لگا۔بڈھے ماسٹر کی تاسف اور ناراضگی کی ملی جلی آوازیں چیخوں کی صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ادھر تڑپتی ہوئی مچھلی کا سرخ پیٹ شیشے کی ٹوٹی ہوئی کرچیوں پر تڑپ رہا تھا۔بڑے میاں چیختے چلاتے واویلا مچاتے ہماری طرف آ رہے تھے۔بے ساختہ فضیحتے اور دہائیاں ان کے منہ سے نکلتی چلی آ رہی تھیں۔اب میں نے بھی کہنا شروع کر دیا ''یہ کیا کیا تم نے یاشیکو۔تم نے اس کا دستہ ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا...... یاشیکو یہ تمہارا قصور ہے۔تمہاری غلطی ہے۔''

یاشیکو ہونق اور پریشان سی ہو کر بڑے میاں کی طرف دیکھنے لگی۔ڈری ڈری سہمی سہمی آنکھوں سے۔

''مجھے تو پتہ نہیں یہ کیسے ہو گیا۔''

اچانک ہی جھپٹ کر ماسٹر صاحب نے اسے نیچے گرا دیا اور اس کے سر پر تھپڑ مارا۔وہ بے ہوش ہو گئی۔اس کا سر کچے فرش سے ٹکرایا تھا۔

میرے میاں نے چپو چلاتے ہوئے کمر سیدھی کی۔اب مجھے ہتسو کو کے جسم کا اوپری حصہ نظر آ رہا تھا۔پھر وہ جھکے تو وہ مجھے پوری کی پوری نظر آنے لگی۔اور پھر اس کا جسم سیاہ سوئمنگ کا سٹیوم میں لپٹا ہوا۔اس کے بال اور کپڑے کشتی میں بیٹھے بیٹھے خشک ہو چکے تھے۔ساحل کی ریت پر لیٹنے کی وجہ سے اس کی بانہوں پر ریت کے ذرات چمک رہے تھے۔اس کے جسم میں اس کی

رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا جو میرے اندر دوڑتا ہے۔ آج سے پہلے یہ احساس اتنی مضبوطی سے کبھی نہ ہوا تھا۔

اچانک ہی ہتسو کو کھڑی ہوگی ۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی ہی تھی کہ ڈگمگا کر سمندر میں جا گری۔ سارا نمکین پانی اس کے حلق اور آنکھوں میں گھس گیا۔ لیکن خیر اس کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا۔ مساؤ نے کہا:

''کہا تھا نہ تم سے کہ تم کھڑی نہ ہونا۔ کہا تھا کہ نہیں۔''

ہتسو کو نے ہنستے ہوئے کہا

''مگر وہاں شارک تو تھی ہی نہیں۔''

میں نے دور سامنے کی طرف دیکھا اور ہتسو کو پر سے نظریں ہٹا لیں۔ پھیلتی ہوئی موجوں کی دھاریاں سطح سمندر پر نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

موجوں کے تلاطم میں ایک تسلسل تھا۔ لیکن وہ دھاریاں وہیں اپنے مقام پر نمونے کی طرح موجود رہیں۔ میں خالی خالی نظروں سے انہیں تک رہی تھی۔ سمندر ساکت نظر آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اسٹیل کی چمکتی ہوئی چادر سامنے پھیلی ہے۔ اسی دم ایک شارک کا ہیولہ سا میری نگاہوں کے سامنے ابھرا۔ جیسے وہ پانی کی تہہ سے اچھل کر اوپر کی سطح تک آ گئی ہو اور عجیب آسیبی انداز میں میری نظروں میں سما گئی ہو۔ میں نے تصور میں شارک کو اپنا بڑا سا منہ پھاڑ کر ہتسو کو کو نگلتے دیکھا اور مجھے یوں لگا کہ اس کا پھاڑا ہوا منہ اندر سے اتنا سرخ نظر آ رہا ہے جتنا حقیقت میں نہیں ہوتا۔

ہتسو کو نے اپنے خط میں یہ بات لکھی تھی کہ ''کسی نامعلوم سبب کے تحت میری ماں مجھ سے نفرت کرتی تھی۔'' وہ یہ سبب کبھی جان بھی نہیں سکتی تھی اس لئے کہ اس کو تو میں نے ایک راز بنا کر مخفی رکھا ہوا تھا۔ بچاری ہتسو کو۔ میں نے تو جس قدر چھپا سکتی تھی اسی قدر سختی سے اس سے چھپائے ہوئے تھی۔ بس یوں سمجھو کہ میں مثبت اعداد سے اوپر جانے کے بجائے منفی اعداد کی طرف لپک رہی تھی۔ یعنی میں اثبات میں منفی کی تلاش میں تھی۔ اس لئے کہ میں سوچتی تھی کہ کسی ایسی شے یا ذات کے لئے کوشش کرنا جس نے خود میرے اندر وجود کو بنجر، بے کار اور خالی زمین بنا کر ڈال دیا ہو۔

شادی کے بعد کے ابتدائی برسوں میں جب میں اس گھر میں نئی نئی آ کر رہی تھی تو مجھے یہاں ایک عجیب سی بو کا احساس ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد اس بو کا احساس مٹ گیا تھا۔ اب شعوری طور پر مجھے اس کا احساس نہیں ہوتا۔ تھا۔ لیکن جب کبھی میں تنہا کسی سوچ میں کھڑی ہوتی تو اسی بے خیالی میں وہ میرے نتھنوں میں گھسنے لگتی۔ بڑے واضح طور پر۔ کسی بند کمرے میں داخل ہوتی۔ اسٹور والے کمرے میں جاتی تو یہ بو زیادہ تیز ہو جاتی۔ پھر مجھے رفتہ رفتہ یہ احساس ہونے لگا کہ یہ تو پھپھوند کی بو ہے جو پرانی تتامی چٹائیوں، کاغذی دروازے اور ایسے ہی دوسرے سامان سے اٹھتی ہے اور ان تمام چیزوں کا جز و لازم بن کر رہ گئی ہے وقت کے ساتھ ساتھ۔ وہ ان کے ریشے ریشے میں رچ چکی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے اندر ایک اور عجیب سے احساس نے جنم لیا کہ اس مکان میں بسنے والی مجھ سے پہلی نسلیں اور ان سے پہلے والی نسلیں بھی اسی بو کے ساتھ رہ کر راہی ملک عدم ہو گئیں۔ اور اب میں بھی اپنا تمام وقت اسی بو باس کے درمیان گذاروں گی۔ میں جب بیاہ کر اس گھر میں آئی تو میری نند شادی ہو کر جا چکی تھی۔ گھر میں ایک نوجوان عورت کی مہک اپنے ساتھ لائی ہوں جس سے یہ محروم تھا۔ ساس کی وفات کے بعد اس گھر میں ایک نئی مہک کا اضافہ ہوا۔ یعنی میرے نوخیز گداز بدن کی بھینی بھینی خوشبو، اور میرے شوہر کے جسم کی خوشبو کو جنم دیا ہے۔ جس کی تہہ میں سلین اور پھپھوند کی مہک کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس گھر میں شوہر کے وجود سے نکل کر ماحول کو اپنی لپیٹ میں لینے والی واحد مردانہ مہک تھی جسے آدم بو، کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جب مساؤ ہائی اسکول میں پہنچا تو اس گھر میں ایک اور انسانی مہک یا '' آدم بو '' کا اضافہ ہوا۔ لیکن یہ چکنی، چپچی اور کچھ کچھ جانوروں جیسی چھچھلاندی اور کھراندی سی بو تھی۔ جو ناک کے نتھوں کو جلا سا دیتی تھی۔ شوہر اور مساؤ کی مہک کو دن بھر میں کئی کئی بار جھیلنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ جب بھی میں پاجامہ یا تکیہ غلاف اٹھاتی تو ان کے جسموں سے آنے والی مخصوص بو کا بھبکا سا میرے اندر داخل ہو کر میرے اندر کی مہک میں گھل مل جاتا۔ یوں مجھے اپنی زندگی میں اور اپنے گھر میں مساؤ اور اپنے شوہر کی رفاقت اور شراکت کا ہمہ وقت احساس رہتا۔

جن دنوں ہتسو کو جونئیر ہائی اسکول کی تیسری جماعت میں تھی، ان دنوں کی بات ہے کہ ایک صبح میں مساؤ ہتسو کو ان کے باپ کو روانہ کرنے کے بعد آئینہ کے سامنے بیٹھی اپنے بال بنا رہی تھی۔

عام طور پر تو میں صبح صبح اٹھ کر نہا دھو کر اپنے بال بنانے کے بعد ان لوگوں کو ناشتہ کرواتی ہوں۔ اور ان کو رخصت کر دینے کے بعد پھر دوسری طرف متوجہ ہو جاتی ہوں۔ لیکن اس دن ایسا ہوا کہ آنکھ کچھ دیر سے کھلی اس لئے ان کے چلے جانے کے بعد بال بنانے بیٹھی۔ جیسے ہی میں کشن پر بیٹھی تو ایسا لگا جیسے کشن خلاف معمول کچھ گرم گرم سا ہے اور وہاں پر جس قسم کی ایک مہک سی پھیلی ہوئی تھی وہ لگتی تو کچھ میری اپنی ہی خوشبو تھی لیکن کچھ زیادہ ہی سہانی سی تھی۔ یقیناً جانے سے قبل ہتسو کو اس کشن پر بیٹھی ہوگی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اب تو اس کے وجود سے آنے والی خوشبو بھی میری خوشبو سے مشابہ ہو گئی ہے کہ میں نے پچھلی طرف کی روش پر اس کے قدموں کی آواز سنی۔ اس نے مجھے اونچی آواز سے پکارا۔ میں اسی خوشبو کے بارے میں سوچتی ہوئی صدر دروازے تک آئی اس کے یوں دوڑتے ہوئے آنے اور چلا کر پکارنے سے میں تو گھبرا گئی کہ لو بس اب یہ پھر شروع ہو گیا۔ لیکن وہ یہ کہہ کر بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی ''میں بس کا پاس بھول گئی تھی۔''

میں اس کو آواز دی۔

''دیکھو ہتسو کو تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ ہے نا۔ دیکھو بیٹا تمہارے ساتھ کوئی غیر معمولی بات ہو تو اماں سے چھپانا نہیں۔'' ہتسو کو جو نیچے اتر رہی تھی۔ میری اتنی سنجیدہ اور حواس باختہ سے انداز میں کہی ہوئی بات پر کھل کھلا کر ہنس دی۔

''فکر نہ کریں۔ یہ غیر معمولی بات بہت دیر سے ہوگی۔''

''کیوں تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ دیر سے ہوگی؟''

''آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ مجھے بہت دیر سے ہوا تھا۔''

''تو تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہارے ساتھ بھی ایسے ہی ہوگا۔'' میری آواز میں سنجیدگی تھی۔

''میری بس چھوٹ جائے گی۔'' وہ بھاگتی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں اس کو جاتے دیکھ رہی تھی اس کے شولڈر کٹ بالوں کی رنگت بالکل میرے بالوں ہی جیسی تھی۔ میں گھوم کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں کا ایک گچھا کشن پر گرا پڑا تھا۔ میں نے اپنے بال کو اس کے بالوں سے ملا کر دیکھا۔ پھر اطمینان نہ ہوا تو روشنی کے رخ کر کے دیکھا۔ وہ دونوں ہی بالوں کی سیاہی میں ایک نیلگوں پن سا نمایاں تھا بلکہ سورج کے مقابل وہ نیلگوں

رنگت چمک کر زیادہ واضح نظر آ رہی تھی۔ دروازہ کھول کر میں برآمدے میں آ گئی اور ماچس کی ڈبیہ پکڑے ہوئے باورچی خانے میں جا کر دونوں بالوں کو انگشت شہادت کے بیچ کر کے جدا کیا اور ان کی نوک کو آگ دکھا دی۔ یہ حرکت میں نے اس لئے کی تھی کہ جنگ کے زمانے میں نقلی ریشم اور اصلی ریشم کا فرق معلوم کرنے کے لئے میں اس کے تار جلا کر معلوم کر لیتی تھی کہ ریان کا ریشہ کون سا ہے اور اصلی ریشم کون سا ہے۔ نقلی ریشہ جل کر چڑ چڑ کرنے لگتا ہے۔ بالکل ایسی آواز میں جیسے پھلجھڑیوں میں سی آواز نکلتی ہے اور جلا ہوا سر گولیوں کی صورت میں مڑ جاتا ہے۔ دو تین مرتبہ میں نے ماچس جلا کر دونوں بالوں کو آگ دکھائی۔ ان کے سرے جل کر گولیاں بن کر رہ گئے۔ پھر میں نے ان کو اپنی انگلی سے چھوا تو میرے اندر سے ایک سوال ابھرا۔ آخر تم یہ سب کس لئے کر رہی ہو؟

کوئی ایک ماہ ہی گذرا تھا کہ ہتسو کو کو پہلی مرتبہ پیریڈ ہو گئے۔ اب مجھے ہر وقت واضح طور پر اپنی ہی جیسی مہک کا ہر سو احساس ہونے لگا۔ اسی مہک اور خوشبو کا جو اس دن فقط اپنی ذات سے اٹھتی ہوئی محسوس کی تھی۔ کوئی ایک جگہ مقرر نہ تھی۔ کبھی کسی کمرے، کبھی برآمدے، کبھی بیٹھک والے کمرے کی تتامی سے اور حد یہ کہ غسل خانے اور خود اس کے کمرے میں ہر طرف وہی میرے جسم اور وجود کی مہک بوئے گل کی طرح ہر شے پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی۔ اب سے پہلے یہ صرف میرے اندر سے نکلتی تھی اور میرے شوہر کے جسم اور سگریٹ کی ملی جلی خوشبو اور مساؤ کے وجود سے نکلنے والی وہ مخصوص بو جو سن بلوغت میں داخل ہوتے ہوئے لڑکوں کے جسم سے اٹھتی ہے۔ میں ان دونوں کے جسم سے اٹھنے والی بو کا مقابلہ کرتی تھی۔ جہاں بھی ہوتی جدھر بھی جاتی اس کا سامنا ہوتا تھا۔

ہتسو کو کے بدن میں گداز پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے تمام اعضا ہاتھ، پیر، گردن اور چہرے کی جلد میں ایک بڑی توانا سی آب و تاب سرایت کرتی جا رہی تھی۔ اکثر وہ نہا کر نکلتی تو اس کی پشت کے توانا پٹھوں کو دیکھ کر میں حیران رہ جاتی اور سوچتی۔ ''ارے کیا اسی لڑکی کا بدن ہے اور پھر وہ اس کی چھلا سی پتلی بل کھاتی کمر، اٹھے ہوئے کولہے دیکھ کر یہ احساس ہوتا کہ یہ وہ نہیں میں کھڑی ہوں۔''

ایک دن مجھے سخت زکام ہو گیا اور میں بستر ہی میں پڑی رہی۔ ہلکی ہلکی حرارت بھی تھی۔ سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اور ایسا بوجھل اور پھولا پھولا لگ رہا تھا جیسے پانی سے بھری مشک۔ میں

نے پرانی خادمہ والے کمرے میں جو صدر دروازے کے ساتھ ہی تھا، ایک گدا بچھا رکھا تھا، اس خیال سے کہ اگر کوئی اچانک ہی اندر داخل ہو جائے تو میں آسانی سے اٹھ کر وہاں جاسکوں۔ وہاں اسی گدے پر لیٹی ہوئی میں خانہ داری کے معاملات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اوندھی لیٹی ہوئی رجسٹر کے اعداد و شمار پڑھتے پڑھتے تھک کر میں چھت کی طرف تکنے لگی۔ چھت کے بڑے بڑے پلیٹوں کے پھولوں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ کاغذی اسکرین کو کھینچ کر برابر کر دیا گیا تھا تاکہ مغربی دریچے سے آنے والی دھوپ کی روئش ہو سکے۔ میں دن کے وقت یہاں آ کر کبھی لیٹی ہی نہ تھی۔ اس لئے آج پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا۔ اس جانب دھوپ بہت آب و تاب سے داخل ہوتی ہے اور شوجی یعنی کاغذی اسکرین سے بڑے دلچسپ طریقے سے چھن چھن کر اندر آتی ہے۔ ایک دم ہموار اور روشنی کی شفاف چادر سے پھیلتی جاتی ہے۔ جس میں کوئی سلوٹ یا کشن کی ناہمواری محسوس نہیں ہوتی۔ دن کے وقت اندھیرے کمرے میں طاری ہونے والی غنودگی مجھ پر طاری ہوتی رہی۔ میں روشنی کی لہروں پر ڈولتی ڈولتی نیند کی وادی میں اترتی جا رہی تھی۔

''اچھے بھئی یہ بالکل ٹھیک ہے۔''

ایک چھلکتی ہوئی سی صدا میرے کانوں میں اس انداز سے داخل ہوئی گویا یہ کہیں خارج سے آئی ہے۔ لیکن پھر وہی آواز میرے اندر سے داخلی طور پر مجھے سنائی دی۔ میں حیران سی ہو کر چونکی کہ ایک ہی آواز ایک دوسرے پر کس طرح حاوی ہو کر میری سماعت سے گذری ہے۔

''یہ جو ہیں نا یہ عام اخروٹوں سے بالکل مختلف ہیں اور ایک مرتبہ کھا کر دیکھو گی تو فرق پتہ چلے گا۔''

ارے یہ تو ایک دہقان عورت کی آواز تھی جو چند دن پہلے اخروٹ بیچنے آئی تھی۔ یہ وہ آواز تھی جس میں اس کی سانسوں کا ارتعاش بھی شامل تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو وہی گفتگو تھی اس دن میرے اور اس عورت کے درمیان ہوئی تھی۔ اور اب خواب میں میں اس کا اعادہ کر رہی ہوں۔

ہمارے پہاڑی علاقوں میں اخروٹ بڑی افرات سے ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کو خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں جواب میں یہ الفاظ دہرا رہی تھی۔

دہقان عورت کے چہرے پر ایک عیارانہ ملائمت چھپی ہوئی تھی۔ اس نے مخصوص روایتی انداز میں اپنا سیدھا ہاتھ نیلے رنگ کے سوتی پاجامے پر پھیرتے ہوئے دو تین بار یہ فقرہ دہرایا

''بی بی میں تو تم کو اتنے سستے دے رہی۔ اچھا چلو تم ساروں کے سو ین دے دو۔ اتنے میں تو تمہیں کبھی ملیں گے ہی نہیں۔''

اب میں بیدار ہو رہی تھی اور مجھے اسکرین کے پیچھے سے چمکتی دھوپ کی روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ چھت کی چوبی پلیٹوں کا نمونہ بھی واضح طور پر سمجھ میں آ رہا تھا۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ میرے کانوں میں پڑنے والی آوازیں صدر دروازے کی طرف سے آ رہی ہیں۔

''ارے بھئی کہہ دیا نا۔ ہمیں بالکل ضرورت نہیں۔''

''چاہے سستے ہوں یا مہنگے، ہمارے یہاں ڈھیروں پڑے ہیں، ہم تو ان سے کھیل کھیل کر اچھال دیتے ہیں ہاہاہا'' میں جس آواز کو عالم خواب میں اپنی سمجھ رہی تھی وہ ہتسو کو کی آواز تھی۔ اب گفتگو بند ہو گئی تھی۔ اور میں سوچ رہی تھی یہ آواز پختگی کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی اونچی تھی۔ بالکل میری ہی طرح۔ دہقان عورت کی ربر کی جوتیوں کی پھٹا پھٹ آہستہ آہستہ دور ہوتی چلی گئی۔ اور اس کے بعد ہتسو کو کے جاندار قدموں کی دھمک بھی آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ اب گھر میں ایک خلائی سناٹا سا طاری تھا۔ اور میں سوچ رہی تھی۔ یہ بھی کیسی پراسرار اور دہشتناک سی بات ہے کہ میں یہاں ایک طرف کونے میں لیٹی ہوں اور اسی گھر میں اندر باہر میری ہی جیسی عورت پھر رہی ہے۔ اور میری ہی طرح اس دہقان عورت سے بات چیت کر رہی ہے۔

اسی طرح لیٹے لیٹے میں نے گردن اٹھا کر مشرقی دریچہ کی جانب دیکھا۔ اس دریچے سے وہ ڈھلوان راستہ نظر آ رہا تھا جو ہمارے گھر سے جنگل کو جاتا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں اس طرف پڑ رہی تھیں۔ دریچہ سے نظر آتا ہوا یہ منظر نہایت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے منظر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دریچے کے فریم میں فٹ کر دیا ہوں۔ میل کے زردی مائل پتے اس وقت پیلے رنگ میں ڈوب کر نکلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اسی مقام پر میری نظر مساؤ پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گیند تھی۔ پھر ہتسو کو بھی وہاں پہنچ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دونوں اس گیند کی تلاش میں تھے جو چند روز قبل جنگل میں گم ہو گئی تھی۔ ہتسو کو آگے کو تھوڑا سا جھک گئی تھی شاید کسی سے ٹھوکر لگ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ منہ کھول کر مساؤ سے کچھ کہہ رہی ہے۔ جواب مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ ڈھلان پر جھک گئی۔ پھر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی مٹھی میں کچھ دبا ہوا تھا۔ اور وہ اس مٹھی کو زور زور سے ہلا رہی تھی۔ لگ رہا تھا کہ مٹھی میں پتھر ہیں۔ وہ پھر جھک گئی۔ پھر کھڑی ہوئی اس کا چہرہ اب سورج کے مقابل تھا۔ دریچے کے خلا میں بہت روشنی تھی۔

جسے دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسکرین کو اسپاٹ لائٹ ڈالنے کی خاطر خالی کر دیا ہو۔ اور اس پر ہتسو کو کا توانا اور جاذب نظر وجود واضح اور صاف طور پر نظر آ رہا تھا۔ سرخ سوئیٹر چیک کی اسکرٹ شفاف گال بلکہ نیم شفاف کہ جیسے کسی کی سانس کے اثر سے شیشہ دھندلا دھندلا نظر آئے۔ چمکتے ہوئے سیاہ نیلگوں بال۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کے لباس کے چمکیلے رنگوں کی شوخی شفق کی سرخی کی نہیں بلکہ اس کے اپنے اندر سے پھوٹتے ہوئے زندگی کے توانا رنگوں کی مرہون منت ہے۔ خانہ داری کے امور کی آمد و خرچ والا رجسٹر میرے تکیہ کے قریب پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر قدرے فاصلے پر پڑی ہوئی پنسل اٹھالی اور اس کو غور سے دیکھا نوک کی سلیقہ سے چھیلی ہوئی لکڑی اور اس کے ساتھ لگی ہوئی پتلی اور ترشی ہوئی نوک۔ پنسل کو میں نے انگشت شہادت اور اپنے انگوٹھے میں بالکل درمیان سے پکڑا اور اپنی دائیں آنکھ کے قریب اس طرح لائی جیسے نشانہ لے رہی ہوں۔ اور پھر میں نے اپنی بائیں آنکھ بند کر لی تھی۔ اور جیسے بندوق کو اس کے ہدف کے مقابل لائی۔ ہتسو کو وہیں اپنی جگہ پر ڈوبتے سورج کی روشنی میں کھڑی تھی، اور کہیں دور دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا ایک رخ میرے سامنے تھا۔ میرے اندر کسی نے کہا: ہتسو کو سامنے سے ہٹ کر کھڑی ہو جاؤ۔ ادھر سے ہٹ کر کسی اور طرف کو کھڑی ہو جاؤ۔ ورنہ تمہاری ماں تم پر گولی چلا دے گی۔ جلدی کرو سامنے سے ہٹو اور کسی ایسی جگہ چلی جاؤ جہاں تمہاری ماں کی نظر تم پر نہ پڑ سکے۔ اسی وقت ہاتھ میں پکڑی ہوئی پنسل اتنی بوجھل محسوس ہوئی کہ دل بیزار ہو گیا۔ اور جب ہتسو کو میرے سامنے سے سرک کر کسی اور طرف کو مڑ گئی تو میرے دم میں دم آ گیا۔ لیکن میں بڑی خستگی سی محسوس کر رہی تھی۔

ایک روز بازار کی خریداری سے واپسی پر راستے میں ہتسو کو مل گئی۔ وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی۔ ہم دونوں باتیں کرتی ہوئی پل پر پہنچیں تو ایک دم ہی یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں۔ دریا کے بالائی دہانے کی طرف والی موجوں کی روانی سے ہم کنار ہوتی ہوا ہمارے چہروں کو جیسے منجمد کیے جا رہی تھی۔ دریا کی سطح پر ابھرتے ہوئے سیاہ بھنور ایسے لگ رہے تھے، جیسے بے شمار سا رڈین مچھلیاں اپنے تیز کٹیلے سفنوں سے پانی کی سطح کو کاٹ رہی ہیں۔ پل کے پار پرانے رہائشی علاقے کی توسیع ہو رہی تھی اور وہ دھیرے دھیرے جیسے پہاڑ کی بلندیوں کی جانب بڑھا چلا آتا تھا۔ جیسا کہ میری عادت ہے کہ میاں اور بچوں کی واپسی پر ان سے ان کی دن بھر کی مصروفیتوں کے بارے میں پوچھ گچھ، سوال جواب کیا کرتی ہوں۔ اس وقت بھی میں ہتسو کو سے اس کے

اسکول کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ ہم دونوں ایسی ہی باتیں کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں، کہ ایک سفید بالوں والی بڑھیا تیز تیز قدموں سے لاٹھی ٹیکتی ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بوڑھی عورت کا ہم دونوں کو گھور گھور کر دیکھنا کوئی ایسا قابل اعتراض فعل نہ تھا۔

''ہا...... ہا......'' بوڑھی عورت نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے ایک سرد سی آہ بھری۔

''تم دونوں ماں بیٹی ہونا۔'' اس کی کھلی کھلی گول گول آنکھیں بات کرتے وقت قدرے ترچھی نظر آئی تھیں۔

''تم کیا ہمیں جانتی ہو؟ میں متسو یاما ہوں یہ سامنے کراتاچی کی باڑھ والا ہمارا گھر ہے۔'' میں بوڑھی عورت سے زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے مختصر جواب دیا۔

وہ اپنے کنبے سے الگ ایک کھنڈر سے مکان میں رہتی تھی۔ اور لوگوں میں سنکی بڑھیا مشہور تھی۔ اور اکثر بیشتر اپنی بے تکی باتوں سے لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیا کرتی تھی۔

''اچھا؟'' یہ کہہ کر بڑھیا آگے چل پڑی۔

مگر اس نے مڑ کر ہمیں ایک بار پھر گھور کر دیکھا۔ رکی اور ہماری طرف دیکھا کر بولی۔

''ایک ہی سا سراپا، ایک جیسی شکلیں ارے پیچھے سے بھی تو ایک ہی جیسی لگتی ہیں۔''

''ارے بھئی یہ میری بیٹی ہے۔'' میں نے ذرا برا مان کر کہا۔

''ہاں ...... ہاں......'' بوڑھی عورت مسکرائی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں تبسم یا مسکراہٹ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جھریوں کی وجہ سے اس کا چہرہ سکڑا سکڑا نظر آتا تھا۔ البتہ اس کے چہرے کی ساخت ایسی تھی کہ لگتا تھا جیسے مسکرا رہی ہے۔ پھر رہائشی علاقے کی طرف گھوم کر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تاہم اس کے دامن کی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی تھی۔

کوئی چھ ماہ بعد دوبارہ اس عورت سے سامنا ہوگیا۔ یہ اوائل بہار کا بھیگا دن تھا۔ جب خزاں رسیدہ درختوں کی بے برگ و بار ڈالیں اور شاخیں سفید سفید ہڈیوں کی مانند چمک رہی تھیں اچانک وہی بڑھیا غیر متوقع طور پر جنگل کی طرف سے نمودار ہوگئی۔ جنگل کے ساتھ ساتھ ایک سفید دیوار تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ درخت کھڑے تھے۔ بس اسی دیوار کے اور درختوں کے بیچ میں سے وہ نمودار ہوگئی۔

''آج تمہاری لڑکی کدھر رہ گئی؟'' اس نے اپنی چھڑی کی نوک کو زمین پر مار کر پوچھا۔

''میں ہمیشہ تو اس کو ساتھ لے کر نہیں چلتی۔''

''ہاں اچھا ہے۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اکیلی گھوما کرو۔''

مجھے اس کی باتوں سے کوفت ہو رہی تھی۔ اور میں اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ میرے پیچھے ہی چل پڑی۔

''دیکھو دو بالکل ایک جیسی شکلوں والوں کا ساتھ ساتھ رہنا ٹھیک نہیں ہوتا ان کا الگ الگ ہو جانا بہتر ہوتا ہے۔ ہاں یہ تو مصیبت کو دعوت دینا ہے، ایک جیسے لوگوں کا ساتھ ساتھ پھرنا۔ رہنا سہنا۔'' ایک فلک شگاف چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔ میں ہونق ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور گھبرا کر پیچھے کو ہٹ گئی۔ وہ بڑھیا اچانک لڑکھڑا کر گر پڑی اور لرزنے لگی۔ اس نے اپنی کمر کو یوں دہرا کر لیا جیسے وہ کوئی گیند ہو۔ جب اس کا تشنج ختم ہوا تو اس کے اندر سے ایک ہوک سی اٹھی۔ پہلے ہلکی سی تھی پھر وہ اونچی ہوتی گئی۔ پھر اسی پر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ یقیناً یہ دمے کا دورہ تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس بدشکل اور سکڑے سہمے وجود کے اندر دوسروں کے سوچ اور خیالات کا اندازہ لگانے والی کوئی منحوس قوت موجود ہے۔ تھوڑی دیر تو میں سوچتی رہی کہ اس کو سہارا دے کر اٹھاؤں یا نہ اٹھاؤں۔ پھر میری ہمت نہ پڑی اور میں تیز قدموں وہاں سے چلی آئی۔

گرمی کی ایک شام میں پسینے سے گھبرا کر غسل خانے میں نہانے چلی گئی۔ پھر نہا دھو کر ایک دھلا اور کلف ہوا سوتی ایوننگ گاؤن پہن کر آئینہ کے سامنے جا بیٹھی۔ نہا کر خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔، تو جلد پر گلابی سی رنگت چھلک آتی ہے۔ اگرچہ میں چالیس سے اوپر ہو چکی تھی، لیکن میری جلد کی چکنائی اور رنگت پر عمر کا اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے دراز کھول کر سرخ لپ اسٹک نکالی، عام طور پر میں اتنی شوخ لپ اسٹک نہیں استعمال کرتی۔ لپ اسٹک کے کیس کو کہیں کہیں زنگ لگ گیا تھا اور اس کے اندر بھری لپٹ اسٹک میں بھی جا بجا سفیدی سی جھلک رہی تھی۔ اور نظر آ رہا تھا کہ اس کو پھپھوندی لگ رہی ہے۔ بہرحال میں نے اس کو صاف کر کے اپنے ہونٹوں پر استعمال کیا۔ لپ اسٹک کی نمایاں سرخی کے اثر سے میرے چہرے کی رنگت اور بھی صاف ہو گئی۔ لپ اسٹک کی ہلکی ہلکی پیاری پیاری سی خوشبو نے میرے جذبات کو اکسا دیا تھا۔ اب میرے سامنے آئینہ میں ایک طرحدار خاتون کا چہرہ تھا۔ یہ وہ چہرہ تھا جو اب تک زندگی کی دبیز اور تاریک تہوں تلے دبا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا میں ایسا چہرہ لے کر بھی تو زندگی گذار سکتی تھی۔ آخر میری نند

نے اسی طرز اور انداز کا انتخاب اپنے لئے کر ہی لیا تھا۔لیکن مجھ سے یہ کبھی نہ ہوا۔اور مجھے یہ سب سنگھار پٹار نہ کرنے کا کوئی ملال یا تاسف بھی نہ تھا۔لیکن اس کے باوجود مجھے کبھی کبھی اس دلکش اور شاندار خاتون کا خیال آتا رہتا تھا جو اندر ہی اندر میرے وجود کے دباؤ سے کچلی گئی تھی اور گھٹ کے رہ گئی تھی۔اگر موقع مل جاتا تو وہ کنول کے پھول کی طرح کھل اٹھتی۔جیسے کنول ایک انگڑائی کے ساتھ اپنی گلابی گلابی پتیاں پھیلا رہا ہے،اوراس کے چاروں طرف ایک کومل سہانی سی خوشبو پھیل جاتی ہے۔یہ پھول جو میرے اندر کھل تو نہ سکا تھا،اور نہ ہی میرے وجود سے باہر آسکا تھا،مگر میرے اندر قائم اور موجود تھا۔ایک غنچہ نادمیدہ کے طور پر سدا تر وتازہ،جو نہ کبھی مرجھایا اور نہ ہی خشک ہوا۔اب اس کی مہک کچھ اور توانا اور تیز محسوس ہو رہی تھی۔اور اس تندی اور شدت کا سبب بھی شاید یہی تھا کہ وہ مہک وہیں ٹھہری اور بند رہی۔باہر آکر ادھر ادھر پھیل سکی نہ معدوم ہو سکی۔

کچھ دیر کھڑے کھڑے آئینہ میں اپنے سراپا کو دیکھتے رہنے کے بعد میں ٹہلتی ہوئی مہمان خانے میں آگئی۔اوپر سے ہتسو کو چلی آ رہی تھی۔میں نے اس کے کریم کلر لباس اور سج دھج کو دیکھ کر پوچھا:

''کہاں جا رہی ہو تم؟''

''کہیں بھی نہیں۔میں تو کہیں نہیں جا رہی۔''

''تو پھر یہ کپڑے کیوں پہنے ہیں؟''

''اچھا! آپ کہاں چلیں؟ اماں پہلے یہ تو بتایئے کدھر کے ارادے ہیں؟''

اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے لپ اسٹک لگاتے وقت سوچا تھا کہ ابھی اتار دوں گی۔لیکن یاد ہی نہ رہا یوں ہی اٹھ کر آ گئی۔

''ہمارے یہاں ایک مہمان جو آئے ہیں۔'' میں نے بات ہی الٹ دی۔

میں واپس آئینے کے سامنے گئی اور لپ اسٹک صاف کی۔مہمان خانے میں میرے شوہر ایک مہمان کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔یہ مہمان دریا پار والی بیکری کے مالک کا نوجوان بیٹا تھا۔اس نے کاروبار ملازموں پر چھوڑ رکھا تھا اور خود اپنا وقت مچھلی کے شکار اور قدیم نوادرات جمع کرنے میں گذارتا تھا۔جب بھی ملتا اسی طرح بات کرتا۔''یہ دیکھیں یہ آیو آج ہی تازہ پکڑی ہے۔''......''اوکستان یہ میں خاص طور پر آپ کے لئے لایا ہوں۔''اس کا دستور تھا کہ سال کے

سال جیسے ہی شکار پر سے ممانعت ختم ہوتی وہ سوئیٹ فش لے آتا اور مجھے پیش کرتے ہوئے کہا کرتا ''مادام یہ میں آپ کے لئے لایا ہوں۔'' وہ مجھ سے عمر میں کوئی چار یا پانچ سال چھوٹا تھا۔لیکن میں اس سے چھوٹی نظر آتی تھی۔اگر چہ وہ ٹھنڈے مزاج والا تھا لیکن بڑا احساس تھا۔کبھی کبھی اس کی مسکراہٹ میں ایک ایسا انداز اور اشارہ سا ملتا جو میرے اندر ایک عجیب مجنونانہ سے جذبے کو ہوا دیتا۔اور شاید یہ اس مہمان کی موجودگی ہی تھی جس نے مجھے لپ اسٹک لگانے پر اکسایا تھا۔لپ اسٹک صاف کر لینے کے بعد میری چہرے پر وہی ادوڑھاپن اور کرختگی سی آ گئی اور میں نے اپنا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا: اب ٹھیک ہے۔پھر میں باہر والے کمرے کی طرف پنکھا لینے چلی گئی۔ مجھے وہاں صرف تین پنکھے نظر آئے۔حالانکہ چار ہوا کرتے تھے۔تین پنکھوں پر ایک ہی وضع کے ایوننگ پرم روز گلابوں کے علاوہ ڈیزی اور بلیوبیل کے پھولوں کے نمونے بنے ہوئے تھے۔یہ پنکھے میرے شوہر، مساؤ اور ہتسو کو جھلا کرتے تھے۔وہ جو بڑا سا پنکھا جس کی سرخ اور سنہری زمین پر ایک مور بنا ہوا تھا، موجود نہیں تھا۔یہ خاص میرا پنکھا تھا اور میری ایک دوست نے جو مصوری اور پینٹنگ سیکھ رہی تھی، میرے لئے پینٹ کیا تھا۔اپنا پنکھا نظر نہ آیا تو مجبوراً وہی بلیوبیل کے پھولوں والا پنکھا اٹھا کر میں مہمان خانے میں آ گئی۔

دروازے پر پہنچتے ہی میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ہتسو کو میرے میاں اور مہمان کے درمیان بیٹھی تھی۔وہ دونوں بڑی خاموشی سے شطرنج کھیل رہے تھے۔اس کے ہاتھ میں وہی مور والا پنکھا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ جھل رہی تھی۔اور کہہ رہی تھی

''بھئی چچا، یہاں کمرے میں بڑا حبس ہے۔شام کے وقت پتہ نہیں کیوں یہاں ہوا کا گذر نہیں ہوتا۔''

''دیکھو گرمی ختم ہو سکتی ہے اگر تم دونوں ہمیں پنکھا جھلتی رہو۔'' میرے میاں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا...... میں اب تک دہلیز پر ہی کھڑی تھی۔بجائے اس کے کہ ان کی گفتگو میں شریک ہوتی' چپ چاپ واپس کمرے میں گئی وہ بلیوبیل والا پنکھا اس کی جگہ پر رکھا' پھر ایک ٹرے میں سوڈے کی بوتل اور دو گلاس باورچی خانے سے لا کر رکھے اور واپس مہمان خانے میں آ گئی۔جیسے ہی میں نے ٹرے رکھی۔ہتسو کو نے ہاتھ آگے بڑھایا۔اس نے دھیرے سے بوتل کھولی اور گلاسوں میں ڈالنے لگی۔

''لیجئے جناب......'' اس نے ٹرے شطرنج کی بساط کے قریب سرکاتے ہوئے بیگماتی انداز

میں کہا۔ گویا میرے حصہ کے کام پر قبضہ مخالفانہ ہوگیا اور ہاتھ ہلا کر رہ گئی۔ بیزاری اور کوفت کا طوفان میرے اندر ہو رہا تھا۔ جیسے ریت کا ذرہ ذرہ یکجا ہو کر چھوٹے پتھروں میں تبدیل ہونے لگے۔ یہ ذرے میرے اندر ہی اندر پرشور انداز میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ میں خاموشی سے کھلے برآمدے میں جا کھڑی ہوئی۔ برآمدے کے فرش کے چوبی تختے جو مدتوں سے دھوپ، حدت اور تمازت کو سہہ رہے تھے، اس وقت مجھے نہایت کھردرے اور ریت سے آلودہ محسوس ہوئے۔ مچھروں کو بھگانے والی خوشبو کے جلنے سے دھوئیں کی ایک ارغوانی لکیر برآمدے کے سرے پر اٹھ رہی تھی۔ ہمیشہ اس کی تیز ناگواری کا کوئی احساس نہیں تھا۔

ہتسو کو کی آواز سن کر میں واپس مہمان خانے میں آ گئی۔ میرے شوہر نے پیالی پکڑنے کی کوشش میں پیالی اوندھا دی تھی۔ یہ ان کی سدا سے عادت تھی کہ شطرنج کھیلتے وقت محویت کا وہ عالم ہوتا کہ پیالیاں اوندھ جاتیں، ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتی تھیں۔ اب ہتسو کو اپنے گاؤن کے دامن کو اپنے رومال سے رگڑ رہی تھی۔ وہ سخت بھنائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''یہ تو ہونا تھا۔ تم جو بڑے ٹھسے سے یہ لباس پہن کر بیٹھی ہو۔'' میں نے سختی سے کہا اور کمرے سے باہر آ گئی کہ جھاڑ لا کر صاف کر دوں۔ جاتے جاتے میری نگاہ ہتسو کو کی نگاہوں سے ملی۔ اس نے مہمان کی طرف دیکھا اور بولی

''چچا یاد ہے آپ کو کچھ دن پہلے آپ مجھے پل پر سے گذرتے ہوئے ملے تھے، اور میں یہی لباس پہنے ہوئے تھی۔ آپ نے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔ ہتسو کو تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔''

''ہاں یہ سچ کہہ رہی ہے۔'' مہمان نے میری طرف دیکھ کر ذومعنی انداز میں کہا۔

میرے شوہر نے کھٹ سے بساط پر ایک چال چلتے ہوئے کہا ''یہ بتاؤ تم انکل کی دلہن بن کر جانا چاہو گی؟ بولو کیا خیال ہے؟''

ہتسو کو ہنس دی۔ بڑی خوبصورت سی نقرئی آواز میں کھل کھلا کر۔ پھر اپنے آپ کو پنکھا جھلنے لگی۔ اس کے چہرے اور رخساروں پر جیسے شفق کی گلابیاں جھک آئی تھیں۔ وہ اس وقت بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔

''ہمارے یہاں بجلی کا ایک پرانا پنکھا ہے۔ پر کوئی اسے چلانا پسند ہی نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ دستی پنکھے کی ہوا زیادہ نرم اور خوش گوار ہوتی ہے۔' وہ بالکل میری ہی آواز میں میرے ہی انداز میں کہہ رہی تھی۔

میں باورچی خانے میں بے حس وحرکت کھڑی جھاڑن ہاتھ میں لئے خلا میں گھور رہی تھی۔
ہتسوکو کی یہ حرکت مکمل طور پر بے ارادہ اور قطعی بے ساختہ تھی۔لیکن سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کو یہ احساس ہی نہ تھا کہ اس حرکت نے جو زخم خوردہ سی فضا پیدا کر دی ہے وہ ایک باریک نقاب کی طرح سے سرک رہی ہے۔کیسی مضحکہ خیز رشتوں کی یہ تثلیث قائم ہوگئی ہے۔اب مجھے آئینہ میں گہری گہری، گاڑھی گاڑھی لپ اسٹک لگائے عورت کا وہ چہرہ یاد آیا۔ میں نے اس کو پہنچا لیا۔ یہ ہتسوکو کا ہی تو چہرہ تھا۔فرق صرف لباس کا تھا، یہ گاؤن نما میکسی ٹائپ لباس ہے اور وہ عورت یکوتا یعنی جاپانیوں کا مخصوص ایوننگ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔اور یہ کہ ہتسوکو اب اس عورت کا کردار ادا کر رہی تھی جو لمحاتی طور پر میرے تصور اور خوابوں کے پردے پر نمودار ہوئی تھی۔ ہاں، مجھے اسی سے کوفت ہو رہی تھی اور اسی کا ملال تھا۔اس وقت کوئی بات نہ ہوتی اگر وہ نئی عورت جو ایک دم ہی ہر موقع پر میری جگہ خاموشی سے پر کر لیتی ہے؛ مجھ سے مشابہ اور عین مین میری ہی تصویر نہ ہوتی۔لیکن اب تو یوں لگ رہا تھا کہ جس عورت کو میں نے سالہا سال سے اپنے اندر چھپا کر مقفل کر کے رکھا ہوا ہے، ہتسوکو اس کو لے اڑی ہے۔اس نے اس کو چرایا نہیں ہتھیا لیا ہے۔ حالانکہ ایک بار لپ اسٹک لگا کر جس عورت کو میں نے باہر نکالا اس عورت کو میں نے ہی لپ اسٹک صاف کر کے دوبارہ اپنی ذات کی کھوٹھری میں مقفل کر دیا تھا۔

کچھ دن بعد جاپانی بیکری کا نوجوان مالک ایک اسٹرا ہیٹ لگائے آیا۔وہ ہتسوکو کو مچھلی کے شکار پر لے جا رہا تھا۔اس واقعہ سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی بلکہ میں نے اس کو بند جوتے پہنوا دیئے تاکہ ڈھلوان پر چڑھنے اترنے میں دقت نہ ہو۔ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں کچھ کھوئی کھوئی سی بیٹھک میں بیٹھ گئی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے غیر متوقع طور پر ایک منظر میری آنکھوں کے سامنے جیسے تصویر بن کر آ گیا۔اور یہی وہ لمحہ تھا جس وقت سے میں نے آنے والے واقعات کو اپنے چشم تصور سے بالکل واضح اور شفاف طور پر دیکھنا شروع کیا۔

اب جو منظر میں نے تصور میں دیکھا وہ کچھ یوں تھا کہ ہتسوکو اور وہ شخص ڈھلان سے اترتے ہوئے رہائشی علاقے کی جانب چلے جا رہے ہیں۔اور دھول اڑ اڑ کر ان کی پسینہ میں بھیگی ٹانگوں سے لپٹی جا رہی ہے۔مندر کی جانب مڑتی ہوئی سڑک، مٹی کی کچی اور پیلی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔جب وہ پکی سڑک پر پہنچتے ہیں تو ہوا صاف ہو جاتی ہے۔گرمیوں کی روشن

دھوپ کے اجالوں میں بہتے دریا کی سطح دھوئی ہوئی اور شفاف نظر آ رہی ہے۔ اور پھر کیا دیکھتی ہوں کہ وہ دونوں بس پر سوار ہو رہے ہیں۔ وہ اس سیٹ پر بیٹھ گئے ہیں جو رومانس سیٹ کہلاتی ہے۔ بس کے سفر کے دوران دریا کی جانب سے آتی ہوئی ہوا کی بھیگی بھیگی سی خوشبو ہتسو کو کی سانسوں میں سمائی جا رہی ہے۔ لیکن ساتھ بیٹھے مرد کے جسم سے اٹھنے والی مہک دریائی ہوا کی باس میں مدغم ہونے لگتی ہے۔ تو ہتسو کو خوشبوؤں کے اس اجنبی اور نامانوس سنگم کے احساس کے ساتھ ہی حیران پریشان سی نظر آ رہی ہے۔ دریا رفتہ رفتہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پیچ و خم کی گہرائی اور نمی میں پہاڑوں کا عکس دکھائی دے رہا ہے۔ اچانک ہوا کا ایک تیز جھکڑ بس کی کھڑکی سے داخل ہو کر مرد کے اسٹرا ہیٹ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ہتسو کو چیخ مارتی ہے۔ ''چچا'' اور یہ کہہ کر وہ ہیٹ دبوچ لیتی ہے۔ اس چھوٹے سے حادثے نے ان کے درمیان تکلف اور فاصلے کو قربت اور یگانت میں بدل دیا ہے۔

پھر دیکھتی ہوں کہ وہ دونوں بس سے اتر کر ڈھلانوں کی طرف دریا کے کنارے کی طرف جا رہے ہیں۔ دریا کے کنارے بچھے ہوئے سنگریزے ان کے جوتوں تلے آ کر چرمرا رہے ہیں۔ دریا کی نزدیکی سمت میں پانی کا پیچ و خم شفاف اور گہرا ہے۔ لیکن دور فاصلے پر دریا کے کنارے کھڑی چٹان اس کے بہاؤ اور اس کی روانی کے لئے رکاوٹ بن گئی ہے اور یہاں پر پانی ٹھہرا ہوا متعفن اور کائی زدہ ہے۔ وہاں دریا بھی تنگ تنگ ہو گیا ہے۔ وہ دونوں بہت احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر آدمی ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہے۔ لیکن ہتسو کو یہ کہتے ہوئے ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔

''انکل میں ٹھیک ہوں۔'' اسی وقت اس کا پیر گیلی چٹان پر پھسلتا ہے۔ مرد جلدی سے اس کا بازو تھام لیتا ہے۔ لیکن ہتسو کو آدھا نچلا دھڑ پانی میں پھسل گیا ہے۔ ایک لحظہ کے لئے میں مبہوت اور ساکت ہو جاتی ہوں، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے پانی میں میں گری ہوں اور ٹھنڈے پانی کا لمس بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ اب مجھے یوں لگ رہا ہے کہ اس مرد کا ہاتھ دھیرے دھیرے میرے بازو پر رینگ رہا ہے اس کے جسم کی حدت میرے اندر اس طرح داخل ہو رہی ہے کہ اس نے میرے اندر چراغاں کر دیا ہے۔ میرے اندر کی شمعیں جل اٹھی ہیں۔ اب ان جلتی ہوئی شمعوں کے شعلوں کی تمازت سے میرا جسم پگھل رہا ہے۔ موم بن کر قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔ میرے اوپر سے دریا بہتا ہوا گذر رہا ہے۔ دریا کے پانی کی حرارت سے میرے بدن کا موم پگھل

رہا ہے۔ پگھلتا موم اور بہتا پانی باہم دگر ہو کر ساتھ ساتھ بہہ رہے ہیں۔

وہ مرد مسکرا رہا ہے۔ وہ اکسانے والی ترغیب سے مملو مسکراہٹ جو کبھی میری نظروں میں اترتی چلی جاتی تھی، لیکن آج وہ شخص میری جانب سے قبولیت یا کسی اعتراف کی پروا کیئے بغیر مسکراتا ہے۔ اور میرا سارا بدن قطرہ قطرہ پگھل رہا ہے مسلسل تواتر کے ساتھ یہاں تک کہ میرا وجود مکمل طور پر تحلیل ہو کر دریا کے قطرۂ موج وحباب سے ہم کنار ہو کر بے کنار دریا کی روانی میں شریک ہو جاتا ہے۔ بہتا جاتا ہے۔ بے بسی اور سرور کے عالم میں بے اختیار روانی اور خیال آتا ہے کہ ہتسو کو کہاں ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہو گا؟ اور ہتسو کو گویا ایک خواب کے عالم میں مسکراتی ہے۔

جب میں دوبارہ اپنے عالم میں، اپنے آپ میں واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ بیٹھک کے وسط میں کھڑی ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس شخص کے ہمراہ گئی ہی نہ تھی۔ میں تو اپنی جگہ پر موجود ہوں۔ اس کے ساتھ تو ہتسو کو گئی ہے۔ مجھے تنہا چھوڑ کر۔ اس خیال کے آتے ہی میں لپک کر صدر دروازے سے نکلی اور راہداری سے پتھریلے فرش پر سے دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔ تیزی سے بھاگتی۔ مگر وقت بہت گذر چکا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ ہتسو کو اور وہ مرد اب تو بہت دور جا چکے ہوں گے۔ اور میں اب اپنے آپ کو واپس اپنے اندر نہیں لے جا سکتی تھی۔ اسے تو ہتسو کو نے ہتھیا لیا تھا اور اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔

جب میں بھاری قدموں چلتی پھاٹک سے باہر نکل رہی تھی تو اسی وقت اس بڑھیا سے پھر مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔ مگر اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی میں سن نہ سکی۔ وہ مجھے گھور رہی تھی۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں۔ وہی منحوس نظریں جو دوسروں کے ذہن میں تیر کی مانند پیوست ہو جاتی ہیں۔ وہ پیچھے مڑی اور اپنی چھڑی زمین پر مار مار کر تیزی سے چکر کاٹنا شروع کر دیئے جیسے وہ رقص کے عالم میں ہو۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کے پیچھے لپکی۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکی۔ اس عورت نے میری سوچ کو بھانپ لیا تھا۔ شاید میرے چہرے بشرے سے میرے خیال کو پڑھ لیا تھا۔ میں چپ چاپ پھاٹک کے اندر واپس آ گئی۔ پسپائی اور شکستگی کے عالم میں۔

رات والا اس بڑھیا کا تعاقب میرے عالم خواب سے تعلق رکھتا ہے۔ جب وہ مجھے دیکھ رہی تھی تو اس بڑھیا کا ہیولہ جو سدا چھڑی کے سہارے چلتی ہے، تین ٹانگوں پر چلتا نظر آ رہا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ جیسے تاریکی کے مرغولوں نے اس کو نگل لیا۔ اندھیرے اس پر حاوی ہو گئے۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اندھیرا ابلتے ہوئے تیل سے اٹھتے سیاہ مرغولوں کی طرح چپچپا چپچپا نظر آ رہا تھا۔ اور مجھے یوں لگ رہا تھا گویا میں اپنے ہاتھ فضا میں اٹھائے آگے کو اس طرح لپک رہی ہوں کہ سیاہی کے ان مرغولوں کو دھوئیں کے ان تاریک بادلوں کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے صاف کر رہی ہوں۔ پھر دامن کوہ تک پہنچ کر کیا دیکھتی ہوں کہ وہاں ایک بوسیدہ اور شکستہ مکان ہے۔ وہ تاریکی اور ظلمت سے بھی زیادہ اندھیرا اور تاریک نظر آ رہا ہے۔ میں اس کے عقبی دروازے سے نکل کر مکان کے ساتھ والے چھپر میں پہنچ جاتی ہوں۔ یہ بڑھیا کا مسکن ہے جہاں وہ تن تنہا رہتی ہے اگرچہ میں نے آواز دے کر اس کو پکارا بھی ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کوئی بھی موجود نہیں۔ پہلے میں جب کبھی برآمدے میں بیٹھ کر اس طرف کو دیکھتی تو اسی بے برگ و بار سوکھے جانکڑ درخت پر بے شمار پرندے پھدکتے نظر آیا کرتے تھے۔ اور اس درخت پر خاص طور سے روشنی کا ارتکاز ہوتا تھا۔ لیکن اب قریب سے دیکھنے پر یوں لگ رہا ہے کہ پرندے ایک سکوت کے عالم میں جامد بیٹھے ہیں اور ان کا ایک پر بھی ہلتا نظر نہیں آ رہا ہے۔

''میں تو تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' بڑھیا نہ جانے کدھر سے نکل پڑی۔ اس کے چہرے کی جھریوں کے درمیان سے مسکراہٹ سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سیاہی مائل صندوقچہ سا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ میرے قریب آ کر برآمدے میں بیٹھتی وہ ایک تامی والے کمرے میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے ایک پھندے لگی ارغوانی رنگ کی ریشمی ڈوری کو کھولا اور پھر صندوقچے میں سے ایک بہت پرانا پیتل کے فریم میں جڑا ہوا آئینہ نکالا اور میری طرف بڑھا کر بولی ''لو یہ آئینہ، اس میں دیکھو۔''

''یہ کیا ہے؟'' میں نے ٹھنڈا پرانا آئینہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہ! یہ میری آنکھ ہے۔ اپنے چہرے کا عکس میری آنکھوں میں ڈالو۔'' میں نے جھجکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سفید بال ادھر ادھر جھول رہے تھے۔ خشک گھاس کی طرح۔ سوکھے کہ جیسے اس میں تری کا نام نہ ہو۔ اس کی کھال بالکل چمڑا ہو رہی تھی۔

''اس آئینے میں دیکھو۔'' بڑھیا نے سختی سے اصرار کیا۔ میں نے آئینہ میں دیکھا۔ آئینہ کی مدھم سطح پر میرا چہرا مبہم نظر آ رہا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ چہرے میں تبدیلی آنے لگی۔ میں اس کو بغور دیکھتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے آئینہ کے پیچھے سے ایک اجنبی اور ناموس چہرہ ابھر کر سامنے آنے لگا۔

اور وہ میرے چہرے پر غالب آ گیا۔ اب یہ نیا چہرہ جو سامنے آیا تھا، اس پر ناراضگی اور غصے کی کیفیت تھی۔

''یہ ماں کا چہرہ ہے۔'' بوڑھی عورت نے کہا اور اس کے ساتھ ہی آئینہ میں نظر آنے والی شکل غائب ہوگئی۔

''یہ میری ماں کا چہرہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی پتیل کا آئینہ جو میرے ہاتھ میں تھا، ایک دم غائب ہو گیا۔ اب میں نے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ بڑھیا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آئینہ کی سطح والی بھوری اور نیلی نیلی سی رنگت نظر آ رہی تھی۔

بوڑھی عورت ہنس کر اپنی مخصوص کھر کھرائی ہوئی آواز میں بولی ''عام طور پر ماؤں کے چہرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اس انداز میں اونچا کیا جیسے وہ کسی چاقو یا استرے کا پھل ہو اور اپنی بائیں کلائی پر اسے مارا۔ کلائی کی نس کٹ گئی اور اس میں سے خون ابلنے لگا۔ خون کا ابلتا ہوا دھارا بڑھیا کے اور میرے درمیان حائل ہو گیا۔ اور جیسے ایک پردہ سا بیچ میں گیا۔ اور پھر وہ بھی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ البتہ اس کے قہقہے ابھی تک سنائی دے رہے تھے۔ جو بہت دور سے آتے معلوم ہو رہے تھے۔ اب یوں لگ رہا تھا جیسے وہی خون اب آسمان پر بہنا شروع ہو گیا ہے۔ پورے آسمان پر سیاہی مائل سرخ خون چھاتا چلا جا رہا تھا۔ اور پیچھے سے وہ بڑھیا مسلسل چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی یہ عورت کا خون ہے۔ عورت کا خون۔ عورت کا خون ہے یہ۔ ہاں یہ ایک وقت پر آ کر اس عورت میں منتقل ہو جاتا ہے جو تمہارے پیٹ میں سے نکل کر باہر آتی ہے اور پھر یہ ایک سے دوسری میں منتقل ہوتا رہے گا۔ عورت کا کرم بن کر۔ لو لو تم بھی بھر لو نا اپنا چلو۔ اور یہ جو ہے نا وہ ماما وغیرہ کا چکر وہ تو کچھ بھی نہیں۔ مرد کا بنایا ہوا ایک ڈھونگ ہے۔ اور اب تم ہی دیکھ لو نا اس میں ماں کی محبت یا ممتا کا ہے کوئی شائبہ؟ بس یہ خون ہے خون اور کچھ نہیں۔

''اکتوبر کی چوبیس تاریخ کو میں آپ لوگوں کے درمیان ہوں گی۔ بہت مدت کے بعد۔''
ہتسو کو نے اپنے خط میں لکھا تھا، صبح ہی سے میرے دل میں ایک ہلچل سی مچی تھی...... لیکن یہ کوئی

ایسی بات تو نہ تھی، ظاہر ہے وہ اتنی مدت کے بعد آ رہی تھی۔ ناشتہ پر میرے شوہر اپنے پہلے نواسے ہی کی باتیں کرتے رہے۔ جو آج پہلی بار اس گھر میں آ رہا تھا۔ مساؤ کہنے لگا میرے گھر کے راستہ میں جو متسو کا وایا کی ویسٹرن بیکری ہے۔ وہاں سے وہ ہتسو کو کا پسندیدہ کیک لے کر آئیگا۔ خیر ''فرنچ کیک تو کسی بھی بیکری سے لیا جا سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ ویسٹرن بیکری سے لیا جائے۔'' میں نے خاصی کڑوی آواز میں کہا۔

جب دونوں ناشتہ ختم کر کے گھر سے نکل گئے تو گھر کی صفائی اور بازار کی خریداری سے فارغ ہونے کے بعد ایسا لگ رہا تھا گویا اب سارے کام ختم ہو گئے ہیں اور کچھ کرنے کو نہیں۔ ہر روز دوپہر کے بعد ایک کے بعد ایک کام نکلتے ہی چلے آتے تھے۔ اور آج ہتسو کو کے انتظار کی گھڑیاں ہی گننا رہ گئی تھیں۔

اس نے یہ تو لکھا ہی نہیں کہ وہ کس وقت پہنچ رہی ہے۔ میں نے دراز سے ریلوے ٹائم ٹیبل نکال لیا۔ میں یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ اگر وہ فلاں فلاں گاڑی فلاں فلاں پر لے گی تو یہاں کس وقت پہنچے گی۔ لیکن یہ بہت پرانا ٹائم ٹیبل تھا۔ اس لئے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دراصل میں ہتسو کو کا تن تنہا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ مساؤ اور میرے شوہر کے آنے سے پہلے ہی وہ پہنچ جائے۔

دن ابر آلود تھا، اور نرم نرم سی دھوپ بالوں میں چھنتی ہوئی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ جاپانی پھل کے درختوں کے تمام پتے گذشتہ رات کے طوفان سے جھڑ چکے تھے۔ البتہ سرخ سرخ پھل ٹہنیوں پر لگے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یاقوت سے بنے ہوئے بالوں میں لگانے والے کلپ ڈالوں اور ٹہنیوں سے اٹکے ہوئے آسمان کو اشارے کرتے ہوں۔

میں نے اپنا کیمونو بدل لیا۔ گرے زمین پر سرخ دھاریوں دار کیمونو۔ گویا وہ ہتسو کو کے استقبال کے لئے پہنا تھا۔ ان دنوں میں عموماً مغربی لباس پہنتی ہوں۔ گرمیوں کے موسم میں بھی اور سردیوں میں بھی۔ لیکن آج میں نے یہ کیمونو عمداً اسی لئے پہنا تھا کہ میں ہتسو کو سے مختلف نظر آؤں۔ مجھے اپنے اوپر ہنسی بھی آتی ہے کہ میں اب تک ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دیتی ہوں۔ ہتسو کو کو اپنے آپ سے دور کر کے کالج میں رہ کر پڑھنے کے لئے بھیجنے کے بعد میں یوں محسوس کرتی تھی کہ جیسے میرے جذبات کا سوتا خشک ہو گیا۔ اور اس کے ردعمل کے طور پر میں نے بے حد شوخ کپڑے پہننا شروع کر دیئے تھے۔ میرا حال تو ایسی دلدل کا سا ہو گیا تھا جس کی تلی

خشک ہو چکی ہو۔ اور تہہ میں اب خاک دھول ہی رہ گئی ہو۔ کالج کے زمانے میں ہتسو کو گھر بہت کم آئی تھی۔ بس نئے سال کے موقع ہی پر آئی۔ اور تو اور گرما کی تعطیلات بھی گھر پر نہیں گذارتی تھی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم جاب بھی کر رہی تھی۔ پھر وہیں اس کو ملازمت مل گئی۔ بعد میں شادی بھی خود ہی کر لی۔ اور اب میں سوچ رہی تھی کہ ایک عرصے سے اس کو دیکھا نہیں ہے۔ اب اس استقبال کس طرح کروں گی۔

وقت گذاری کی خاطر میں جاپانی پھل توڑنے لگی۔ اور سیڑھی درخت سے لگا کر اوپر چڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ نظر کھلے آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ مغربی پہاڑیوں کی طرف سے شفق کی سرخی پھیل رہی تھی مگر آسمان کے اس حصہ کی طرف آتے آتے سرخی اور لالی میں وہ شوخی اور گہرائی باقی نہ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دور آسمان کے حصے پر کہیں کسی طرف کو گہرا زخم لگ گیا ہے اور اسی میں سے بہتا بہتا خون پورے آسمان کو خون آلود کر رہا ہے۔ میں قینچی سے جاپانی پھل ڈالوں سے کاٹ کاٹ کر بانس کی ایک ٹوکری میں رکھتی جا رہی تھی۔ شام کی خنک ہوا کا لمس مجھے اپنے گالوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ اور بے حد خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔

ابھی میں سیڑھی پر پھل توڑنے میں مصروف ہی تھی کہ کسی کے نرم نرم قدموں سے چلنے کی آواز آئی۔ جیسے روش کے پتھریلے فرش پر کوئی سینڈل پہنے چل رہا ہو۔ سیڑھی پر کھڑے ہی کھڑے میں نے گردن اٹھا کر کراتاچی کی باڑھ کی طرف دیکھا۔ میں تو یقین بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ جو کیمونو میں لپٹی لپٹائی درختوں کے درمیان سے چلی آ رہی تھی وہ ہتسو کو تھی۔ پھل توڑتے وقت میں سوچ رہی تھی وہ مغربی ڈریس میں اونچی ایڑی کا جوتا پہنے ہوئے ہوگی۔ اور میرے کانوں میں اس کے چلنے سے ٹک ٹک کی آواز ہی آئے گی۔ وہ بالکل سامنے آ گئی تھی لیکن اس نے اب تک مجھے درخت پر چڑھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس کے قدموں کی نرم نرم چاپ پر منہ اٹھ کر دیکھا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ بھورے رنگ کا کیمونو پہنے ہوئے تھی۔ بہت سرخی اوبی ٹپکا اور اوبی پر گلابی ٹائی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں بچہ اٹھا رکھا تھا، اور سیدھے ہاتھ میں ایک بڑا سا بیگ پکڑے تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے سے میرا ماضی چلا آ رہا ہے۔ آج سے بیس سال قبل جیسے میں اسی طرح روش پر چلتی ہتسو کو گود میں اٹھائے چلی آ رہی ہوں۔

ہتسو کو نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا، اگر چہ وہ مسکرائی نہیں لیکن اس کو پتہ تھا کہ یہ میں ہی

ہوں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کا تاثر ایک دم ہی بدل گیا۔

''لو...... میں یہ پھل اچھالتی ہوں تمہارے استقبال میں۔ تمہاری آمد کو زیادہ مسرت افزا بنانے کے لئے تم اس کو پکڑو۔ تو جانیں۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے آہستہ سے ایک پھل اس کی طرف اچھال دیا۔ ہتسو کو نے ہاتھ کا تھیلا زمین پر رکھا اور برسی من کو ایک ہاتھ سے کیچ کرایا۔ اس نے دوسرے ہاتھ میں بچہ پکڑے پکڑے ہی بڑی آسانی سے کیچ لیا تھا۔

''کیوں کیسا کیچ لیا؟ کیا خیال ہے؟'' ہتسو کو ہنسی۔

اس قسم کی مہارت میرے اندر بہت زبردست تھی تاہم اس وقت میں نے اس بات کو زیادہ طرح نہ دی اور اتر کر سامنے والے پھاٹک کی طرف آ گئی۔

''لو دیکھو، یہ تمہاری نانی اماں ہیں۔ ان سے ملو۔''

ہتسو کو نے بچے کا چہرہ میری طرف کر دیا۔

''مجھے نانی کہلوانا اچھا نہیں لگتا۔''

''اچھا تو آپ کا خیال ہے کہ آپ ابھی تک جوان ہیں؟''

''ہاں بھئی ٹھیک ہے اب عمر آ گئی ہے اور بڑھیا ہو گئی ہوں۔''

''میں نے اس کا نام میسا کو رکھا ہے۔'' اون سے بنی ہوئی ٹوپی بچی کے منہ پر سے ہٹاتے ہوئے اس نے اس کی شکل دکھائی۔

''اچھا تو یہ لڑکی ہے۔'' میں اس کے آگے آگے چل رہی تھی۔ مجھے بڑا سکون ہوتا اگر یہ لڑکا ہوتا۔

رات کا کھانا ہم نے مہمان خانے میں کھایا۔ مکمل خاندان آپس میں مگن تھا۔ اور میرے شوہر تو پورے نانا ابا بنے تھے۔ جب وہ بچی کی انگلی پکڑ کر چلتے تو چہرہ فخر اور مسرت سے دمکتا ہوتا۔

ہتسو کو اور مساؤ دنیا جہاں کی باتیں بے تحاشہ کر رہے تھے جیسے وہ لڑکپن میں کیا کرتے تھے۔ میں بھی اب مخل نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ ان کی مرضی پر چل رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی خوشیوں اور مسرتوں سے معمور دنیا اور فضا میں میری بھی ایک چھوٹی سی چوکی قائم ہے۔

میں کھلے برآمدے میں چلی آئی تھی۔ باغ پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان کے ایک حصہ پر ہلکی ہلکی دودھیا سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ چاند بادلوں میں جا چھپا تھا۔ خنکی اور سردی جیسے زمین

کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر پھیلتی جا رہی تھی۔ باہر سکوت تھا۔ بڑی خاموشی ایسے جیسے ماحول نے سانس روک رکھی ہو، جیسے وہ سرما کی گہری نیند سونے کی تیاری میں مصروف ہو۔لیکن اندر کمرے میں باتیں، قہقہے اور مسرتوں سے معمور وہ شور تھا جس سے زندگی کی لطیف خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

ہتسو کونکل کر برآمدے میں آ گئی۔ اپنی بچی کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی ''ایک بار تو اسے گود میں لے لیجئے۔''

میں اس نرم، گرم، بھاری اور گلگلے سے وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لینے اور سینے سے لگانے پر مجبور تھی۔ وہ میرا اپنا ہی خون تھا جو دونوں ماں بیٹیوں کی رگوں میں جاری تھا۔ میں نے ہتسو کو اور ہتسو کو نے اس کو جنم دیا۔ میرے ہی خون سے نکلی دو شاخیں۔ اور اب بھی میرے خون کو فراغت اور فرصت کہاں۔ اب تو دریا کی شاخ در شاخ موج کو ادھر سے ادھر بڑھنا ہے۔ اب مساؤ کا بھی بیاہ ہوگا۔ اور میرے خون کی دھاریں اور شاخیں اس طرف پلٹ جائیں گی۔ مساؤ کی بیٹی اور پھر اس کی بیٹی...... میں اسی طرح منتقل اور تقسیم ہوتی رہوں گی۔ مستقبل کے تاریک انجان اندھیروں میں میرا خون سمندر کی شاخوں کی طرح پھیلتا اور منقسم ہوتا رہے گا۔ مجھے اس خیال سے وحشت سی ہونے لگی۔

بچی کھنکھنانے لگی۔ جو ہڑ کی مچھلی جیسا ننھا سا منہ کھلا تو اوپر تلے ننھے ننھے سے چار دانت نظر آئے۔ اور اس کے منہ کا گلابی گلابی حصہ بھی۔ میں نے بچی کو واپس ہتسو کو کی گود میں دے دیا۔

''یہ میری طرح ہے نا بالکل میری جیسی۔'' ہتسو کو نے کہا۔ بچی کے خدوخال ابھی نمایاں نہ تھے۔ گول مٹول سا چہرہ ہی نمایاں تھا۔ میں نے خیال میں دیکھا کہ بچی بڑھتے بڑھتے بالکل ہتسو کو کی تصویر بن گئی ہے۔

''ہاں دیکھو! تمہاری بھی پہلے لڑکی ہی ہوئی ہے۔'' میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اور اسی وقت اپنی زبان روک لی اس لئے کہ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا۔

''اچھا تو یہ تمہارے ساتھ یہی شروع ہو گیا۔''

او ہبا منیا کو

چڑیل کی ہنسی

آج میں آپ کو کوہستان کی اس آسیبی چڑیل کا قصہ سنانا چاہتی ہوں جو علاقے کے دور نزدیک میں سدا سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں یہ چڑیل ان پہاڑوں میں رہتی ہے۔ کوہساتنی گاؤں اور دیہات میں اس کے بڑے قصے مشہور ہیں۔ اس کے سفید جھاڑ جھنکار بال ایک رسی سے بندھے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ ایسے بھولے بھٹکے مرد مسافر کے انتظار میں رہتی ہے جو کوہستان کے پیچ وخم میں بھٹک کر راستہ بھول جائے۔ وہ اس کو اپنے جال میں پھنسا کر کھا جاتی ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک پردیسی نوجوان مسافر راہ بھٹک کر ادھر پہنچ گیا۔ وہ رات بسر کرنے کے لئے کسی ٹھکانے کی تلاش میں تھا۔ وہ التجا کرتا ہے کہ مجھے رات گذارنے کو کوئی ٹھکانہ دے دو۔ اس پر وہ مسکراتی ہے۔ اس کے دانت ایسے ہیں جیسے اس نے ٹوٹے ہوئے دندانوں والی کنگھی منہ میں دبا رکھی ہو۔ اس کی ہنسی اتنی لرزہ خیز ہوتی ہے کہ مسافر کی ریڑھ کی ہڈی میں برفانی سلاخ سی اترتی چلی جاتی ہے۔ مسافر سوچتا ہے کہ یہ کیسی پراسرار اور منحوس بڈھی کھوسٹ ہے۔ اس کے پیلے سڑے سڑے سے دانت چراغ کی جھلملاتی روشنی میں کتنے بھیانک لگ رہے ہیں۔ پھر وہ اپنے پیلے پیلے سڑے دانت نکوس کر کہتی ہے۔ ''تم یہی تو سوچ رہے ہو نا کہ کیسی

لاابالی سڑیل بڑھیا ہے۔ بالکل جنگلی بلی جیسی۔''

اس کی بات سن کر اجنبی درماندہ مسافر چونک اٹھتا ہے۔

''ارے یہ تو اندر کے خیالات لے اڑتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آدھی رات کو اٹھ کر یہ مجھے کچا چبا جائے۔''

اس خیال کے آتے ہی باجرے کا دلیہ کھاتے کھاتے وہ نیچی نگاہوں سے چوری چوری اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اب وہ پھر بیچ میں ٹپک پڑتی ہے۔

''دیکھو اب تم یہی سوچ رہے ہو نا کہ یہ بڑھیا آدھی رات کو مجھے کچا چبا جانے کی فکر میں ہے۔''

اس شخص کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔ بوکھلا کر جلدی سے کہتا ہے۔''ارے نہیں میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ گرم گرم دلیہ کھا کر میرے اندر جان پڑ گئی ہے۔ بڑا آرام آ گیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں اتنا تھک گیا ہوں کہ الٹے سیدھے خیالات آ جاتے ہیں۔''

لیکن اندر ہی اندر جیسے خوف سے اس کا خون جما جا رہا ہے۔ بالکل ٹھنڈا یخ بدن ہو رہا ہے۔ شاید بڑھیا جو اتنے بڑے دیگچے میں پانی ابال رہی ہے وہ اسی لئے ہے کہ مجھے ابلتے پانی میں ڈال کر پکا لے۔ اس خیال کے آتے ہی بڑھیا پھر اپنے پیلے پیلے سڑے سڑے دانت نکوس کر کہتی ہے''اچھا تو اب یہ سوچ رہے ہو کہ بڑھیا یہ پانی اس لئے ابال رہی ہے کہ مجھے اس میں پکائے۔ کیوں بھئی غلط کہہ رہی ہوں میں کیا؟''

اب آدمی بالکل ہی سہم جاتا ہے۔ اور خوفزدہ ہو کر کہتا ہے'' آپ مجھ پر غلط گمان کر رہی ہیں۔ میں تو واقعی اتنا تھک کر چور ہو گیا ہوں کہ سونا چاہتا ہوں۔ وہ تو کہو کہ یہ دلیہ کھا کر بدن میں اتنی گرمی آ گئی ہے کہ میں اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر رہا ہوں۔ صبح اٹھتے ہی اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ لیکن دل ہی دل میں وہ گھریاں گھوٹتا ہے، کیا چال باز آسیبی بڑھیا ہے، جیسے چرخے پر بیٹھی تکلا گھماتی ہوئی جادوگرنی۔ یقیناً یہ جنگلی بلیوں جیسی بھوت پریت ہے۔ کہیں ویسی ہی بوڑھی چڑیل نہ ہو جو پہاڑیوں میں بستی ہے۔ کتنے قصے اور ہول ناک کہانیاں سن رکھی ہیں ان کے بارے میں۔ اور اب کہیں یہ بھی نہ جان لے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ ادھر اس نے سوچا اور ادھر بڑھیا نے یہ کہتے ہوئے کہ کیوں بھئی اب یہ سوچ رہے ہو نا کہ کیا چکر باز آسیبی بڑھیا ہے۔ یہ جنگلی بلی چڑیل جیسی نہ ہو، جو چرخے پر بیٹھی تکلا گھماتی ہوئی جادوگرنی ہوتی ہے، بھوت پریت اور

ویسی ہی چڑیل جو پہاڑوں میں بستی ہے۔ کہیں اب یہ بھی نہ جانے لے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔
اب تو آدمی اتنا ڈر جاتا ہے کہ خوف کے مارے اس کا دانت سے دانت بجنے لگتا ہے۔ بمشکل اپنے لرزتے گھٹنے تھامتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ''اچھا اب مہربانی سے مجھے اجازت دیجئے کہ میں لیٹ کر سو جاؤں۔''

واقعی جیسے کوئی رینگتا ہوا کمرے میں گھسے وہ اس کمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور سفری لباس تبدیل کئے بغیر ہی پرالی پر لگے بستر میں گھس جاتا ہے۔ لیکن وہ بوڑھی چڑیل بھی پیچھے پیچھے اندر داخل ہوتی ہے۔ ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔ ''اب یہ سوچ رہے ہو نا کہ ذرا موقع مل جائے تو بھاگ نکلوں؟'' اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ یہی سوچ رہا ہے کہ ذرا بڑھیا کی آنکھ بچے تو وہ نکل بھاگے۔

بہر حال جو بات بھی ہو، یہ پہاڑی بھتنیاں دوسرے شخص کی سوچ اور مافی الضمیر کو بھانپنے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، اور ان سے کسی کے بھی دل کی بات اور سوچ مخفی نہیں رہتی۔ پھر آخر میں یہ ہوا ہے کہ اس کے جال میں پھنسا ہوا شخص اس کی آنکھ بچا کر نکل بھاگتا ہے۔ بوڑھی چڑیل اس کا تعاقب کرتی ہے۔ لیکن وہ آدمی ہانپتا کانپتا بمشکل اپنی جان بچا ہی لیتا ہے۔ کم از کم قدیم کلاسیکی بھوت پریت والی کہانیوں کا ماحصل یہی ہوتا ہے۔

لیکن ایک بات تو یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ چڑیلیں اور ڈائنیں پیدائشی تو بوڑھی کھوسٹ نہیں ہوتی۔ کبھی تو وہ ٹھیک ٹھاک ہی ہوا کرتی ہوں گی۔ خاص طور سے اپنے بچپن میں وہی نرم و ملائم مکھن کا گولا جیسے چاولوں کا پھینٹا ہوا سفید سفید کیک اور ان کے پاس سے وہی کھٹی کھٹی سی پیاری پیاری سی نوزائیدہ بچوں جیسی مہک بھی آتی ہو گی۔ پھر وہی گول مٹول مکھن کے گولوں جیسی بچیاں، نوجوان دوشیزاؤں کا روپ بھی دھار لیتی ہوں گی۔ جو مردوں کو اپنے شبنمی اور روشن روشن رخساروں اور ریشم جیسی چکنی سہانی رنگت کے بل بوتے پر پھانستی ہوں گی۔ اور پھر وہ اپنے گلابی سیپیوں کی رنگت والے ناخنوں کی نوکوں کو ان کے بازوؤں اور شانوں میں اس وقت گاڑ دیتی ہوں گی جب وہ ان کے گداز سینوں میں منہ چھپا کر راحتوں کی تلاش کرتے ہوں گے۔

پتہ نہیں وجہ کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے کبھی کسی پہاڑی علاقے میں کسی نوجوان بھتنی یا ڈائن کا سنا نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ نوجوان بھتنیاں اور چڑیلیں اپنے مسکنوں سے دور نکل جاتی ہیں اور ان کی کہانیاں اور ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ سارسوں، لومڑیوں اور برف سے سفید

بگلوں کی کہانیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ کچھ خوفناک درندوں اور دوسرے پرندوں کی کہانیوں میں بدل جاتی ہیں۔ پھر وہ خوبصورت نازنین اور نازک اندام بیگموں کی شکلوں میں آبادیوں اور بستیوں میں گھر بساتی ہیں۔ اور پھر جب یہ وحشی درندے وہ مادر ہوں یا نر، عجب انسانی روپ دھارتے ہیں تو وہ بہترین جوڑے ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھی کے ہمدم اور رفیق۔ نہایت حسین وجمیل، نازک اندام اور لطیف جذبوں سے مملو۔ لیکن ان سب کہانیوں کا انجام المناک ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بے بال و پر چلی ہوئی کھالوں اور نچے ہوئے پروں کے ساتھ اپنے مسکنوں اور ٹھکانوں کو واپس لوٹ آتے ہیں۔ اور شاید یہی دل گیر، دل گرفتہ اور درماندہ بدنصیب مخلوق اپنی بدنصیبوں اور تلخیوں کے نتیجے میں پہاڑی چڑیلوں اور آسیبوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اور غالباً یہ خلق خدا خصوصاً نر مخلوق کو کھا لینے والی بات اس انتہائی محبت اور انسیت کی علامت ہوگئی جیسے کبھی کبھی مائیں جب کوئی بچہ بہت ہی پیارا لگتا ہے تو اس کو بھینچ لیتی ہیں اور انتہائی شفقت اور محبت سے کہتی ہیں ''ارے تو تو اتنا پیارا ہے کہ جی چاہتا ہے تجھے کھا جاؤں۔''

اچھا خیر، اب میں جس کوہستانی چڑیل کی بات کرنے والی ہوں، وہ واقعی ایک اصلی چڑیل تھی۔ سچ مچ کی چڑیل۔ وہ باسٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئی۔

باسٹھ سال کی عمر میں جب اس کے بے روح جسد خاکی کو مردوں کے نہلانے والے الکحل سے رگڑ رگڑ کر دھویا اور صاف کیا گیا تو اس کا بدن اتنا شفات اور اجلا اجلا نکل آیا کہ لگتا تھا کسی دیوی کا مومی مجسمہ پڑا ہے۔ اس کے سر کے بال آدھے کالے اور آدھے سفید تھے۔ پیٹ نرم نازک اور پچکا ہوا تھا۔ پیٹ کے ابھار پر نقرئی ڈوریاں بندھی تھیں۔ آنکھیں بڑے سکون سے بند تھیں اس کے لبوں پر معصوم اور شرمائی ہوئی مسکراہٹ تھی جس کے پیچھے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی خواہش دبی ہوئی تھی۔

بلاشبہ وہ پہاڑی چڑیل تھی۔ پہاڑی چڑیلوں کے قبیلے سے تھی۔ اگرچہ کئی دفعہ اس نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر تارک الدنیا ہوجانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لیکن وہ تمام عمر انسانی آبادیوں کے درمیان ہی رہی۔

جب سے اسے یاد تھا وہ پہاڑی چڑیل ہی تھی۔

وہ ابھی چھوٹی ہی تھی۔ عمر کے نازک دور میں۔ ابھی اسے بیت الخلا استعمال کرنے کا طریقہ بھی نہ آیا تھا۔ وہ کھیل میں اتنی مصروف ہوجاتی تھی کہ اس کو پتہ بھی نہ چلتا اور اپنی ماں کو بتانا

بھی بھول جاتی۔ ماں کو پتہ چلتا تو وہ دوڑی دوڑی اوراس کے اوپر چیختی ناراض ہوتی۔ ''بد ذات لڑکی پہلے سے نہیں بتاتی اور جب کام خراب ہو جاتا ہے تو آواز دیتی ہے۔ اب کام خراب ہی ہو گیا تو بتانے سے فائدہ؟''

پھراس کی ماں ہنستے ہوئے یہ بھی کہنے لگتی ''بھئی میرے بس کی تو نہیں ہے یہ لڑکی۔ میں اب کیا کہہ سکتی ہوں۔''

رات کو جب اس کا باپ دیر سے آتا اور ماں بار بار دیوار پر لگے گھنٹے کی طرف دیکھتی تو وہ فوراً بول پڑتی

''خدا جانے ایسا کیا کام لاحق رہتا ہے اس شخص کو۔ کہتے تو رہتے ہیں کہ کام ہے کام ہے۔ لیکن مجھے پتہ نہیں کہ جان بوجھ کر جتنی دیر ہو سکتی ہے کرتے ہیں۔''

''بات یہ ہے کہ اس گھر میں بوریت اتنی ہے کہ شاید ہی کوئی ٹھہرنے کی جرارت اور ہمت کر سکتا ہے۔''

اس کے منہ سے نکلی ہوئی یہ باتیں سن کر اس کی ماں خشکی سے مسکراتی۔ اوراسے گھورتی۔ وہ پھر بول پڑتی۔ بالکل اپنی ماں کے انداز میں۔

''بیوقوف نالائق لڑکی چلو، اب سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ جو بچے رات گئے تک جاگتے رہتے ہیں، وہ بڑے نہیں ہوتے۔ بس چھوٹے ہی رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹے رہ جاتے ہیں۔''

اس کی ماں اس کی ان باتوں پر حیران رہ جاتی۔ وہ اس کا منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی۔ وہ حیران تھی کہ جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ اس لڑکی کی زبان پر کیسے آجاتا ہے۔ پھر وہ زچ ہو کر کہتی۔ یہ بچی ذہین ہے۔ جو کچھ میرے دماغ میں ہوتا ہے وہ اس کی زبان پر آجاتا ہے۔

جب وہ ذرا بڑی ہو گئی تو ماں جب بھی کوئی نیا کھلونا اس کے لئے لے کر آتی وہ ماں کے انداز میں ہی کہتی۔ ''شاید اس کی وجہ سے کچھ دیر اس کی زبان بند رہے۔''

اوراس کی ماں حقیقت میں رنجیدہ ہو کر اس کی طرف دیکھتی۔ پھر کہنا شروع کر دیتی۔

''اللہ ہی جانے یہ لڑکی دوسروں کے دلوں کی باتیں کس طرح جان جاتی ہے۔ اور پھر ان کو بیان کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ تو ہم نے پہاڑی ڈائن کے بارے میں سنا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ لوگ اس سے ڈرنا شروع کر دیں۔ نفرت نہ کرنے لگیں۔

دائن سمجھ کر دور نہ بھاگنا شروع کر دیں۔''

اس کی ماں کے ذہن کو یہی تفکرات پراگندہ رکھتے اور وہ لڑکی تھی، کہ ماں کے دل کی ہر بات اس کی نوک زباں پر رہتی تھی۔

جب اس نے سکول جانا شروع کیا تو ماں کو ایک گونہ اطمینان ہو گیا کہ کچھ دیر تو اس سے نجات ملا کرے گی۔ لیکن اب ایک نئی بات ہوئی کہ لڑکی نے لوگوں کے دلوں کی باتیں سمجھنا اور بیان کرنا چھوڑ دیں۔ اب زیادہ تر وہ خاموش رہا کرتی تھی۔ تب ایک دن ماں سے نہ رہا گیا اور وہ اس سے پوچھ ہی بیٹھی۔

''کیا بات ہے جب سے تم نے اسکول جانا شروع کیا ہے۔ روز بروز خاموش ہوتی جاتی ہو؟''

ماں کی بات کا اس نے یہ جواب دیا کہ ''جب میں اپنے ذہن کی سوچی ہوئی باتیں بیان کرتی ہوں تو لوگ مجھے بری نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے اب میں نے سوچا ہے کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ بچے احمقانہ حرکتیں کریں تو بڑے لوگ زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ بڑوں کو خوش ہونے کا موقع دیا کروں گی۔''

اس کی بات سن کر اس کی ماں نے ایسی بات کہی جو وہی ماں کہہ سکتی ہے جس نے پہاڑوں کی ڈائن کو جنم دیا ہو۔ وہ کہنے لگی

''تم کہتی ہو کہ میں اپنی سوچی ہوئی باتیں کہتی ہوں لیکن یہ بات تم خوب اچھی طرح جانتی ہو کہ تم صرف ظاہر کرتی ہو کہ وہ باتیں تمہاری سوچی ہوئی نہیں ہوتی ہیں۔ تم یہ نہ بھولو کہ تم ابھی بہت چھوٹی اور محض ایک بچہ ہو۔ بھلا تمہارے دماغ میں ایسی باتیں کیسے اتر سکتی ہیں۔''

ماں کی باتوں کے جواب میں وہ حقارت سے مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ اور تو اور وہ تو اسکول میں بھی بڑی اچھی چل رہی تھی۔ اور بڑے اچھے نمبر لیا کرتی تھی۔ اور اگر کبھی اچھے نمبر نہ ملتے تو وہ نتیجہ پھاڑ ڈالتی۔ وہ ماں کو دکھاتی ہی نہ تھی۔ ماں جو لنچ دیتی وہ اکثر کھائے بغیر ہی واپس لے آتی۔ اس پر ماں بہت ناراض ہوتی۔ پھر اس نے یوں کرنا شروع کیا کہ جب اس کو بھوک نہ ہوتی تو وہ لنچ کا ڈبہ کوڑے کی بالٹی میں الٹ دیا کرتی۔ تھوڑا بہت ڈبے میں باقی رہنے دیتی۔ پھر گھر جا کر

ماں سے کہتی ''آج ٹیچر نے روک لیا اور اتنی باتیں کرتی رہیں کہ میں لنچ پورا نہیں کھا سکتی۔
''ماں یقین کر لیتی اسے کبھی شبہ نہ ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے یا اسے بے وقوف بنا رہی ہے۔

وقت گذرتا رہا۔ اب وہ بچی سے نوجوان دوشیزہ بن چکی تھی۔ بہت خوش شکل اور دلکش لیکن اس کا کنبہ غریب تھا اور اتنی حیثیت نہ تھی کہ اس کے لئے قیمتی اور خوش وضع پوشاکیں بنوا سکیں۔ جب کبھی ماں بیٹی مل کر بازار جاتیں تو وہ اسی کپڑے کو پسند کرتی جو اس کی ماں اسے دلوانے کے لئے سوچ رہی ہوتی۔ وہ ماں پر یہی ظاہر کرتی تھی کہ یہ کپڑا از خود اسے پسند ہے اور خود اس کا انتخاب ہے۔ وہ سستے اور گھٹیا کپڑے خریدنے کا یہ بہانہ پیش کرتی۔

''میرے خیال میں میرے لئے یہی کپڑا مناسب ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اس عمر میں اتنا قیمتی لباس پہنوں گی تو لوگ کیا سمجھیں گے۔ یہی نا کہ میں کسی دولت مند بوڑھے کی داشتہ ہوں۔''

ایسی باتیں اس کے منہ سے نکلتیں تو اس کی ماں بڑے رنج سے اس کی شکل دیکھتی۔ وہ اپنی ماں پر یہی ظاہر کرتی کہ وہ گھٹیا اور سستا لباس اسے بے حد پسند آیا ہے اور وہ اپنے شوق سے اس کو خرید رہی ہے۔

لڑکی سمجھ جاتی تھی کہ لوگ اس سے کس قسم کے رویئے کی توقع رکھتے ہیں۔ پھر وہی بات از خود اس کے ذہن کا حصہ بن کر باہر آنے لگتی۔ نہ صرف اپنے خاندان والوں کے ساتھ اس کا یہ حال تھا بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتی تھی۔ وہ جن کی نظروں میں پسندیدہ بننا چاہتی تھی ان کیساتھ اس کا یہی حال تھا کہ ان کی سوچ کے مطابق اپنے عمل کو تابع کر لیتی تھی۔ جب ان کی خواہش ہوتی کہ وہ ہنسے تو وہ ہنس دیا کرتی تھی۔ جب لوگوں کی خواہش ہوتی کہ یہ خاموش رہے تو وہ بالکل خاموش ہو جاتی تھی۔ جب لوگوں کا دل چاہتا کہ وہ باتیں کرے تو وہ خوب گپ شپ لگاتی اور خوب چہچہانے لگتی۔ جب وہ کسی ایسے شخص کے سامنے ہوتی جو اپنے آپ کو بڑا ذہین اور عاقل سمجھتا تھا تو وہ اس کے سامنے بالکل نادان اور بھولی بن جایا کرتی۔ لیکن وہ بے وقوف اتنی بھی نہیں بنتی تھی کہ وہ شخص یہ سمجھنے لگے کہ یہ تو بالکل احمق ہے اور اتنی احمق لڑکی سے کون سر مارے۔ وقت ہی ضائع ہوگا ایسے احمق سے بات کر کے۔ جو لوگ واقعی خود احمق ہوتے تو وہ ان کی سادگی کو سراہنے لگتی۔

اس سب کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ سے بڑی توقعات رکھتی تھی۔ اور اس کی آرزو تھی کہ وہ سب کی نظروں میں چڑھ جائے اور ہر شخص اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے۔ اسی وجہ سے وہ

اپنے دماغ پر بے حد بوجھ ڈالتی اور دماغ خرچتی۔ آہستہ آہستہ جب اس کو اس بات کا احساس ہونے لگا تو وہ آدم بیزار ہوگئی۔ اپنا زیادہ وقت کتابیں پڑھ کر اپنے کمرے میں گزارتی اور لوگوں سے ملنے جلنے سے احتراز کرتی۔

جب کبھی اس کی ماں اس سے پوچھتی ''بیٹا تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کیوں نہیں جاتی ہو؟'' تو وہ فقط دو لفظوں میں جواب دے دیتی۔ ''تھک جاتی ہوں۔''

اب کچھ دن سے ماں بھی محسوس کرنے لگی تھی کہ جب اس کی بیٹی اس کے آس پاس یا ساتھ ہوتی ہے تو وہ بہت تھک جاتی ہے۔ جیسے اس پر کسی نے بوجھ لاد دیا ہو۔ اور جب وہ کہیں ادھر ادھر ہوتی تو وہ بڑا سکون محسوس کرتی جیسے وہ ہلکی پھلکی ہوگئی ہو۔ اب وہ اس دن کے انتظار میں تھی کہ اس کی بیٹی کو کوئی معقول نوجوان مل جائے اور وہ بیاہ کر اس کے پاس سے چلی جائے۔ گویا اس کی ماں کا خیال تھا کہ ماں اور بیٹی کی فطری زندگی کا نقطہ آغاز ان کے درمیان جدائی ہوتی ہے۔

بیٹی کو بھی احساس تھا کہ وہ اب ماں پر بوجھ بنتی جا رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو یہ احساس تھا کہ وہ سدا ہی سے اپنی ماں پر بوجھ تھی۔ اسے تو جب سے یاد تھا ماں کو اپنے سے بیزار ہی دیکھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح ماں کو اپنی قید سے اور بوجھ سے آزاد اور ہلکا کردے۔ کبھی کبھی اس کے دل میں ماں کے خلاف بڑا غصہ اور گلہ پیدا ہونے لگتا۔ کبھی کبھی تو ماں کے خلاف اس کے طیش اور غصہ کا ابال اٹھ کھڑا ہوتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اپنی عمر کے اس دور سے گذر رہی تھی جس کو بلوغت کہا جاتا ہے۔ اور اس عمر میں بغاوت اور جھنجھلاہٹ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے یہ احساس ہوتا کہ اس کے غصے کا اصل سبب ماں کی عیاری اور مکاری ہے۔ اور جس طرح وہ ہر دم اپنی بیٹی سے مقابلے اور دو بدو پر اتری رہتی تھی، وہی اس کے اندر جھنجھلاہٹ پیدا کرتا ہے۔ پھر اسے خود ہی خیال ہوتا کہ ماں کا اب جاتا وقت ہے۔ عمر ڈھل رہی ہے۔ اور پھر خود وہ بھی اب عاقل اور بالغ ہو چکی ہے۔

ایک جوان اور باشعور دوشیزہ ہونے کی حیثیت سے ظاہر ہے کہ اس کی واقفیت ایک شخص سے ہوگئی۔ وہ معمولی سا آدمی تھا۔ ایسی کوئی خاص بات بھی نہ تھی۔ بس اس کا ٹائپ مختلف تھا۔

اماں کے لاڈلے ہونے کی وجہ سے جیسے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ اماں بالکل مختلف جنس سے ہے اس لئے اس کو کھلی چھٹی ہے کہ جس قدر لاڈ ہو سکتے ہیں اپنے لئے کروالے۔ جیسی

چاہے حرکتیں کرے اور جب پورا جوان مرد ہو جائے تو پھر ایسی عورت سے شادی کرلے جو ماں کا متبادل ہو سکے۔ ماں کی سی فراخ دل اور بھرپور محبت دے سکے۔ جو کسی دیوی کی طرح باوقار اور پر تمکنت ہو۔ اور اس سے آنکھ بند کر کے بیکراں اور بے انتہا محبت کر سکے۔ بالکل ہی بے عقل اور احمق عورت کی مانند اور پھر اس عورت میں شرکی اہلیت اور صلاحیت بھی ہو۔ وہ کسی وحشی اور شیطان صفت درندے کی سی خصلت واہی بھی ہو۔ اس شخص کی فطرت میں اچھی شریک زندگی کا ایک ایسا یہ معیار موجود تھا جو خالص مردانہ پسند کہی جا سکتی ہے۔

اس شخص سے وہ اتنی متاثر تھی اور اتنی ممنون تھی اس کی کہ اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ اس کو خوش رکھنے کے لئے جو کچھ بھی اس کے بس میں ہوگا کرے گی۔ لیکن یہ کوشش اور محبت اس کے لئے بھاری پتھر بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شخص کے ذہن کا ہر ہر گوشہ اس کے لئے ایک کھلی کتاب بن گیا تھا۔ بات یہ ہے کہ اگر انسان پر کسی کے پوشیدہ خیالات عیاں نہ ہوں تو پھر زندگی بڑے چین سے خوش وخرم گذر جاتی ہے مگر وہاں تو یہ قصہ ہی نہ تھا۔ اس شخص کے دل کا ہر ہر خیال اور جذبہ اس پر ہویدا تھا۔

سب سے پہلے تو اس شخص کی یہ خواہش تھی کہ عورت حسد اور رقابت کی آگ میں مسلسل جلتی رہے۔ چنانچہ اس کی بھی انتہائی کوشش یہ ہوتی کہ یہ ظاہر کرتی رہے کہ وہ رشک وحسد کی آگ میں جھلسی جارہی ہے۔ کسی عورت کا سایہ بھی اس مرد کی زندگی میں آجاتا تو وہ ایسی اداکاری شروع کر دیتی جس سے ظاہر ہوتا کہ اس عورت کے مقابلے میں وہ ڈٹ گئی ہے اور اس سایہ کو برداشت کرنے کو قطعی تیار نہیں ہے۔ اس کو یوں رشک وحسد میں مبتلا دیکھ کر اس شخص کو بڑی تسکین ملتی۔

اب آئے دن یہی ہوتا کہ وہ سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان اس کے ساتھ چمٹی ہوئی التجائیں کرتی ہوتی۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ کر چلے نہ جانا میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تمہارے بغیر تو میں تنکا بھی نہیں ہلا سکتی۔ بالکل ہی بے دست و پا ہو جاتی ہوں۔ اور جب وہ اس کو مطمئن کرنے کے لئے اس اداکاری اور مکالمہ بازی میں مصروف ہوتی تو چشم تصور میں یہی دیکھتی کہ وہ بے حد کمزور اور بے بس ہے۔ اس آدمی کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ یہ نہیں برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی عورت کسی دوسرے میں کوئی خوبی دیکھے، اور اس کا اعتراف بھی کرے۔ اس کی اس جبلت اور خواہش کی تسکین کے لئے وہ دنیا جہان کے مردوں کی خوبیوں کی

طرف سے آنکھیں بند کر کے ان کی عیب جوئی میں لگی رہتی۔ اور ان کی ہر ہر بات میں کیڑے ڈالتی رہتی تھی۔ وہ آدمی اب اتنا احمق بھی نہ تھا۔ اس لئے وہ اس کو اس حرکت پر سختی سے ٹوکتا اور بالکل اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ ہر وقت ان کی تحقیر کرتی رہے۔ اور ہر بات میں کیڑے ڈالتی رہے۔ چنانچہ اس کی تسلی کے لئے وہ کبھی کبھی منصفانہ رویہ بھی اپنا لیتی۔ لیکن ان کی کسی اچھی عادت کا ذکر کرتے ہوئے بھی یوں کہتی ''ہوسکتا ہے کسی کو فلاں فلاں شخص کی یہ بات پسند ہو، لیکن بھئی میں تو نہیں پسند کرتی۔ میں تو ایسی کسی بات کی تعریف نہیں کرسکتی۔'' غرض اس کی اپنی رائے اور نظریہ کھل کر سامنے نہیں آسکتا تھا۔ ان تمام باتوں سے بڑھ کر اس کے اندر ایک اور جذبہ بھی بڑا عجیب تھا کہ وہ اس بات پر بڑا ناز اور فخر کرتا تھا کہ وہ جس عورت کا خاوند ہے اس پر تو دوسرے مرد بھی مرتے ہیں۔ ایسی باتوں سے وہ اس کی عشوہ طرازی اور دوسرے مردوں کو لبھانے والی حرکت یا اداکاری کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ بات یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں میں ہر مرد کے اندر وہ جذبہ موجود ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ اس کو دلال بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی بیوی یا کسی بھی عورت کو دوسرے مرد کا کھلونا بنا دینے پر قادر ہوتا ہے۔

اب وہ پورے وقت اس کے انہی جذبات اور خواہشات کے احترام اور تسکین کی خاطر اداکاری میں مصروف رہتی تھی۔ لیکن کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو غلطی بھی ہوتی ہی رہتی ہے۔ مثلاً کسی وقت حسد کی بات کو ٹال دیا یا نہیں دل چاہا کہ کسی وقت غیر مرد سے چاہت اور لگاوٹ کا اظہار کرے۔ چنانچہ اس کو ٹرخا دیا۔ یا پھر دل سے کسی نہایت دلکش شخص کے سراپا اور جمال کی بے ساختہ تعریف کردی۔ ایسے میں وہ شخص پھر نہایت بیزاری کا اظہار کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ عورت انتہائی سست اور ڈھیٹ ہے۔ اس کے اندر کسی قسم کی حساسیت یا لطیف جذبہ موجود ہی رہتا۔ پھر وہ کسی رشی منی کے انداز میں بولنا شروع کردیتا۔

بات یہ ہے کہ عورت سے بڑھ کر بے قابو مخلوق تو پیدا ہی نہیں ہوئی۔ حسد تو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اس میں۔ بس سوائے چھچھورے اور سطحی خیالات اور جھوٹ مبالغہ کے ان کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں۔ چھوٹے چھوٹے جھوٹ بولنا ان کی عادت ہوتی ہے۔ پھر ڈرپوک اور احمق اتنی کہ کیا بتایا جائے۔ کہتے ہیں انگریزی میں ایک لفظ ہوتا ہے مرد کے لئے اور اس سے مطلب ہے انسان لیکن عورت ایسی مخلوق ہے جو مرد کی جان سے چمٹی رہتی ہے اور بس۔

عدم مساوات کے اس نامعقول اعلان کے بعد دونوں ہی ایک طرح سے ہنسی خوشی بسر

کرنے لگے۔آخر دونوں ہی کا بڑھاپا آ گیا۔اوراب مرد بڑھاپے کے اس موڑ پرآ گیا تھا جب وہ اپنی رگ رگ ٹٹولنے لگا۔اب وہ ہر وقت کسی نہ کسی جسمانی عارضے اور تکلیف کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اس کی عورت ہمہ وقت اس کی گرتی ہوئی صحت کے بارے میں پریشان اور سراسیمہ رہے۔اور یادرکھے کہ اگر وہ مرگیا تو پھراس کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ وہ رہ رہ کر یہ کہتا تھا '' مجھے تو تمہاری فکر کھائے جاتی ہے ۔ میں تو چین سے مر بھی نہیں سکتا۔''اوراس کا تو یہ تھا کہ اس نے اول دن سے یہ تہیہ کررکھا تھا کہ وہ جیسا چاہے گا وہی کرے گی۔اس نے تو اپنے قول وفعل کواس کی خواہشات کا پابند کررکھا تھا۔چنانچہ وہ ہروقت حواس باختہ اور سراسیمہ نظر آتی۔کرتی بھی کیا اس کے مرد کی خوشی اسی میں تھی۔ وہ اس کو ہروقت پریشان اورحواس باختہ دیکھنا چاہتا تھا۔اس نے تمام زندگی ہرادا کاری بڑی کامیابی سے کی تھی۔اتنی کہ آخر میں وہ اس کی عادت ثانیہ بن جاتی۔اور یہ بھی اس نے ایسی نباہی ، ایسی نباہی کہ اب وہ حقیقتاً پریشان اورسراسیمہ رہنے لگی۔ ہروقت اس کے ہاتھ پاؤں پھولے رہتے۔اس لئے کہ اب اس کوواقعی یقینی ہوگیا تھا کہ اس کے جیون ساتھی کی حالت ابتر ہے۔وہ بہت بیمار ہےاور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔اس کے سوا چارۂ کار بھی تو نہ تھا۔بات یہ تھی کہ اگر وہ اس کی بیماری پریقین نہ کرتی اوراسے سمجھانے کی کوشش کرتی تو وہ اور بھی بے چین اور کبیدہ ہوجاتا۔چنانچہ یہی ایک ایسا راستہ تھا جواس نے اختیار کیا۔یعنی اس کی ہاں میں ہاں ملانا،اور حد سے زیادہ پریشانی کا اظہار کرنا۔ ایک بات یہ تھی کہ اس کو تیمارداری کے خیال سے ہی جھرجھری آتی اور وحشت ہوتی تھی۔اتنی کہ وہ سوچتی تھی کہ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ مرجائے۔قہر درویش بجان درویش کے مصداق کو یہ بھی کرنا پڑااوروہ تیمارداری کرتے کرتے نرس بن کررہ گئی۔کرتی بھی کیا۔یہ بھی اسی قسم کی مجبوری تھی جیسے ایک عورت کوگھیر کراس کے فرار کا ہرراستہ بند کردیا جائے تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوکر اپنی عصمت کا سودا کرنے پر مجبور ہوجائے۔اب جب وہ ایک مکمل نرس کی سی مہارت اور توجہ سے اس کی تیمارداری میں لگ گئی تو اب بڈھے کوایک اور شوشہ مل گیا۔اب وہ یہ کہنے لگا کہ بھئی یہ نرسنگ تو تمہارے مزاج کا حصہ ہےاور خدمت اور تیمارداری کا جذبہ تمہاری فطرت میں چھپا ہوا تھا۔ پھر وہ یہ بھی کہہ دیتا کہ ہاں بھئی یہ خدمات کا جذبہ تو تم عورتوں کی فطرت ہے، ہم مرد بھلا کب اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

ان ہی دنوں میں اس پر مٹاپا چڑھنا شروع ہوگیا۔ وہ اتنی موٹی ہوگئی کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ دوقدم چلتی تو ہانپ جاتی۔ اس کا حال پیٹ والی عورتوں کا سا ہوگیا کہ پیٹ میں سانس نہ سماتی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس کی صحت اور توانائی قابل رشک تھی۔ ہاضمہ بھی بہت اچھا تھا جو کھاتی ہضم ہوجاتا۔ جان کو لگ جاتا۔ ہر وقت ہی بھوک لگی رہتی تھی اور منہ چلتا ہی رہتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ کسی کا دل توڑنا جانتی ہی نہ تھی۔ جو کوئی کچھ کھانے پر اصرار کرتا انکار نہ کرسکتی تھی۔ بعض وقت تو بغیر خواہش اور اشتہا کے کھالیا کرتی۔ اس کی اس عادت کا لوگ یہ مطلب نکالتے کہ کھانے پینے کی شوقین اور چٹوری ہے اور جو بھی سامنے رکھ دو کھالیتی ہے۔ لہٰذا اگر کبھی وہ ان کی پیش کی ہوئی کوئی چیز کھانے سے انکار کردیتی تو وہ برامان جاتے۔ چنانچہ جو بھی اس سے کچھ کھانے کی صلاح کرتا یا خاطر تواضع کرتا تو وہ انکار نہ کرتی۔ اگرچہ یہ کہتی رہتی "اللہ مجھ پر رحم کرے، لو میں پھر کھانے بیٹھ گئی۔" اس کے برعکس۔ اس کے شوہر کا مزاج اکھڑ تھا اور وہ اس کا مذاق اڑاتا اور کہتا تمہارا کیا ہے تم تو کمزور طبیعت اور کچے ارادے کی مالک ہو۔ تمہارے آگے تو کوئی زہر بھی رکھ دے تو تم انکار نہ کروگی۔ اور خود اس کا یہ حال تھا کہ کوئی کتنی مہارت اور خلوص سے کچھ ہی پکادے اور رکھائی سے انکار کردیتا۔ اور ہٹ دھرم اتنا کہ بس ایک دفعہ منہ سے نہیں کردی تو کردی۔ وہ بے حس اور دوسروں کے جذبات سے لاپرواہ شخص تھا۔

وہ ہر وقت اس کے بارے میں ایسے ایسے الفاظ استعمال کرتا۔ مثلاً قوت ارادی کا نقدان ہے، بے حس ہو، کاہل ہو۔ اور ایسی ایسی بے شمار باتیں جنہیں سن سن کر وہ شدید قسم کے احساس تنہائی میں مبتلا ہوجاتی۔ اس لئے کہ اس کے دیئے ان تمام القابات اور خطابات میں سے ایک بھی اس پر پورا نہ اترتا تھا۔ تب اس کو اپنی تنہائی اور بے کسی کا احساس ہونے لگتا۔ پھر اس کا شوہر ہی نہیں گرد و پیش کے دوسرے لوگ بھی بہ آواز بلند اس پر رائے زنی اور اعتراض اس طرح کرتے گویا وہ کسی اجنبی دیس سے تعلق رکھتی ہے۔ اور وہ ان کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے۔ کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ تارک الدنیا ہوجائے۔ کہیں پہاڑوں اور جنگلوں میں نکل جائے اور وہیں کسی پہاڑ کی کھوہ میں رہنے لگے۔ سب کی نظروں سے اوجھل اور سب سے دور جیسے کبھی اپنے بچپن میں سب کی نظروں سے چھپ کر سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی تھی۔

اس کا یہ خیال تھا کہ وہاں دور جنگل اور پہاڑوں میں نہ تو وہ کسی کی چبھتی ہوئی نظروں کا

نشانہ بنے گی اور نہ ہی لوگوں کی الٹی سیدھی باتیں اس کے کان میں پڑیں گی۔ نہ کوئی اس کو کسی بات پر مجبور کرے گا۔ جو چاہے گی سوچے گی جو چاہے گی کرے گی۔ ان تمام لوگوں کو اپنی زندگی سے خارج کر دینے کا تصور اس کے لئے بڑا جانفزا تھا۔ جن لوگوں نے اس کا جینا اجیرن کر رکھا تھا۔ اس خیال سے ہی اس کا دل دھڑکنے لگتا کہ وہ ان تمام بے مغز، کم فہم لوگوں کی دنیا سے دور ہو جائے گی۔ جو اس زمین پر اکڑ کر چلتے ہیں۔ وہ خوش و خرم، شاداں و فرحاں ہیروؤں کی طرح گردن اکڑا کر اس طرح چلتے ہیں کہ وہ دوسروں کے دلوں کے حال سے آگاہ نہیں ہوتے۔ ان کی سوچ سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کاش وہ داستانی چڑیلوں اور جادوگرنیوں کی طرح بہ آواز بلند کہہ سکتی کہ ابھی ابھی تمہارے دل میں یہ خیال آیا ہے۔ ابھی تم نے یہ سوچا تھا...... کیوں میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہی ہوں؟ ایسی باتیں سوچ کر اسے کتنی راحت اور سکون محسوس ہوتا۔ بالکل ایسا ہی سکون جیسے کسی اندر ہی اندر پکتے پھوڑے کو نشتر سے چھیڑ کر فاسد مواد کو نکال دینے کے خیال سے ہوتا ہے۔ جیسے کوئی اپنے ماتھے کے دونوں اطراف سے کھال کو چیر اگا کر ان سینگوں کے لئے باہر آ جانے کی راہ کھول دے جو نہ جانے کب سے اندر ہی اندر بیج سے پھوٹنے والے اکھوے کی مانند باہر پھوٹ نکلنے کو بے تاب ہوں۔

جب کبھی وہ پہاڑوں میں جا کر تنہا رہنے کا خیال کرتی تو اس کے ذہن میں یہ تصور ہوتا کہ خوبصورت اور نرم و نازک پری سی مانند وہ جنگل میں اڑتی پھرے گی۔ کھیتوں میں پھسکڑا مار کر بیٹھ سکے گی۔ گرم اور نرم صحت بخش دھوپ کا غسل کھلے آسمان تک برہنہ ہو کر کرے گی۔ چاروں طرف درختوں، لمبی گھاس اور جانوروں کے درمیان کلیلیں کرتی پھرے گی۔ لیکن اگر ایک مرتبہ کوئی انسانی وجود بستی سے نکل کر اس کے قریب سے بھی گذر گیا تو اس کا سرا وجود مسخ ہو جائے گا۔ اور چہرہ بھتنی کی شکل میں بدل جائے گا۔ اور وہ احمق کی طرح منہ کھولے اس کی طرف تکتا رہ جائے گا۔ پھر اس کو پاس سے بھگانے کے لئے غضبناک آواز میں برے برے الفاظ اور ناموں سے گالیاں دے گا۔

اور جب وہ اپنے تصور میں خود کو جنگل باسی کی حیثیت سے کبھی پری اور کبھی بھتنی کے روپ میں دیکھ رہی ہوتی تو اس کا خاوند بھی اسی جگہ کہیں سے نمودار ہو جاتا۔ فقیروں کی سی حالت

چیتھڑوں میں لپٹا ہوا، اب وہ اس کے مسکن میں مارا مارا پھرتا۔ شاید وہ اس کو پہچان نہ پاتا ہو۔ اس لئے کہ اس کی تو شکل ہی بدل گئی تھی۔ اور وہ جیسے شیطان بچے ہار جاتے ہیں، تو بڑ بڑ

کرتے ہیں۔اسی طرح بڑبڑ کرتا۔اب اس کے بغیر میری زندگی محال ہے۔وہ تو میری جائز اور ناجائز خواہشات کی پردہ پوشی کر کے،ان کی تکمیل کرتی رہتی اوراب میں کیسے زندہ رہوں گا۔

اس کے کان میں اس کی آواز پہنچتی تو وہ جلدی سے چشمہ کے پانی میں اپنا عکس دیکھتی اور عکس میں کیا نظر آتا کہ اس کا آدھا چہرہ ماں کی ممتا سے مملو ہے،ایک شفیق ماں کا تبسم ایک موج نور کی طرح چہرے کے اس رخ کو روشن کر رہا ہے۔پھر وہ اپنے چہرے کے دوسرے نصف حصہ پر نظر ڈالتی ہے جو شیطانی طیش وغضب کی مدت سے تمتمایا ہوا ہے۔اس حصہ کی جانب سے منہ خون ٹپکتا ہے۔جیسے اس نے کسی آدمی کو چیر پھاڑ کر اس کا گوشت کچر کچر چبایا ہو۔چہرے کے دوسرے رخ پر اس کے لب اس شخص کو چوم رہے ہیں جو شیر خوار بچے کی طرح اس کی آغوش میں دبکا ہوا اس کی چھاتی کو چوس رہا ہے۔یہ سب وہ اپنے خیالوں ہی خیالوں میں دیکھتی۔

جیسے جیسے وہ موٹی ہو رہی تھی۔اسے فشارخون کا مرض ہوتا جا رہا تھا۔وجہ یہ تھی کہ موٹاپے کے باعث اس کی شریانوں اور رگوں پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔اوراب تو اس کے مختلف اعضا سن ہوجایا کرتے تھے اور شدید درد کے دورے پڑنے لگتے تھے۔اس کے کانوں میں سیٹیاں سے بجنے لگتی تھیں۔اوراس نے ایک ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس کی تشخیص یہ تھی کہ یہ تمام تکلیفیں اور علامات عورت کی زندگی کے اس موڑ پر ظاہر ہوتی ہیں جس سے اس کے ایام یاس کا آغاز ہوتا ہے۔اس کو یہ بات تو چالیسویں سال کے آغاز میں بتائی گئی تھی اوراب تقریباً بیس سال بعد بھی اس کی مختلف جسمانی شکایت اور عارضوں کا یہی سبب بتایا جا رہا تھا۔یہ کیا بات ہوئی وہ سوچتی۔

اس کے شوہر کی کچھ اور ہی منطق تھی اس کا کہنا تھا کہ قانون قدرت کے مطابق عورت کی صحت اور ہاڑ مرد کے مقابلے میں زیادہ مضبوط اور قومی ہوتا ہے۔اوران کی روح وبدن کی تخلیق زیادہ مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر ہوتی ہے۔وہ اپنی منطق کے ثبوت کے لئے اعداد وشمار کے حوالے ثابت کرتا کہ عام طور پر شوہر بیویوں سے بہت پہلے وفات پاجاتے ہیں۔اور بیویاں اس کے بہت عرصے بعد بھی بقید حیات رہتی ہیں۔وہ اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ ہم دونوں میں سے پہلے میں مروں گا۔پہلے مجھے موت آئے گی۔اس کی باتوں کا جواب تو وہ نہیں دیتی لیکن وہ جواب دے سکتی تھی اس کا کہنا تھا کہ مرد کی عورت سے کم زندگی ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ عالم شباب میں اپنے آپ کو خرچ کر دیتا ہے۔عورت کے مقابلے میں وہ اپنی زندگی کو کم تحفظ دیتا ہے۔جنگ اور دوسری بے شمار ہیجان انگیزیاں اس کے عرصہ حیات کو مختصر کر دیتی ہیں۔لیکن اپنے میاں

کی طرح اعداد وشمار کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ ورنہ وہ بھی اپنی بات کی حمایت میں بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ مرد اپنی جسامت اور قد کاٹھ کے حساب سے عورت کے مقابلہ میں برتر اور توانا نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت حساس ہوتا ہے اور اس کا دل عورت کے مقابلے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں مردوں کو پسند کرتی ہیں۔ اور جب وہ یہ دلیل پیش کرتی تو دل میں سوچتی واقعی مرد نہ ہوتے تو یہ دنیا ان کے بغیر کتنی تاریک ہوتی۔ اور یہ وہ اب تک جو کہیں رہی ہے سب فریب خیال ہے۔ اور اس میں اصلیت کا ذرہ بھی داخل نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اس کی دیکھ بھال اور خدمت میں بے طرح مصروف رہتی۔ جہاں جہاں درد کی شکایت کرتا وہ اس کو دباتی۔ اس کے لئے ہلکی پھلکی تازہ اور صحت بخش غذائیں تیار کرتی۔ ان ہی مصروفیتوں میں اس کی زندگی کے شب وروز بسر ہوتے رہے۔

اس کو پتہ تھا کہ اس کا اپنا جسد خاکی اب بہت دن نہیں چلے گا۔ اور اس موٹے پھسپھس بدن کا عرصہ حیات دن بدن گھٹ رہا ہے۔ بھلا اتنے دباؤ اور تناؤ کے تحت اس کے اعصاب اور شریانیں کتنے دن اور اس کا ساتھ دے سکیں گی۔ ایسے میں اب اس کے پاس زندگی کا ایک ہی مصرف رہ گیا تھا کہ وہ اس شخص کے لئے جو اپنے آپ کو نہایت بیمار اور ناتواں تصور کرتا تھا، کھانا، بلکہ چڑیا کا چوگا تیار کرتی رہا کرے۔ ہاں تو اور کیا۔ وہ کھانا اتنا ہی کم کھاتا تھا کہ اس کو چڑیا کا چوگا ہی کہنا زیادہ مناسب لگتا تھا۔

ایک صبح اٹھ کر اس نے آئینہ میں اپنے سراپا جائزہ لیا تو اپنے آپ کو پہچاننا بھی مشکل نظر آیا۔ سارا چہرہ جھریوں کے جال تلے آیا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ اس کا نہیں کسی پہاڑی بھوتنی یا چڑیل کا چہرہ ہے۔ پیلے اور ناہموار دانتوں کی بدصورتی جیسے کسی جنگلی بلی نے منہ پھاڑ دیا ہو۔ سر کے بالوں پر جیسے کہرا سا برس گیا ہو۔ اور اس کے جوڑ جوڑ میں جیسے یخ بستہ کہر کی میخیں گڑ گئی ہوں اور رہ رہ کر چٹختی ہوں۔ جسم ایسا سن اور بے حس ہو رہا تھا جیسے یہ یا اس کا نہیں کسی اور کا بدن ہو۔ بدن کا اس طرح اکڑ کر سخت ہو جانا ماں کی دھندلی اور بھولی بسری یادوں کو تازہ کر رہا تھا۔ اس کو بھی تو آخر عمر میں ایسی ہی شکایتیں لاحق رہنے لگی تھیں۔ اب تو اس کی اپنی شریانوں میں جا بجا خون رکنے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے ایک غنودگی اور نیم خوابیدہ سی کیفیت طاری رہنے لگی تھی۔ اور پھر ایک دن یہی ہوا کہ یہ غفلت کی گہری نیند بن کر اس کے وجود پر چھا گئی۔ اور جب وہ بیدار ہوئی تو اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ حافظہ دھندلا گیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ بدن کے مختلف حصے سرد اور منجمد

ہو گئے تھے۔ دستور اور معمول کے مطابق تو اس وقت تک کب کی بیدار ہو چکی ہوتی تھی۔ اور اس کے لئے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ لیکن آج جب وہ بیدار ہوا تو اس کے ساتھ اسی طرح پڑی تھی، واضح رہے کہ گذشتہ چالیس سال سے وہ ایک ساتھ پہلو بہ پہلو ہی سوتے رہے تھے۔ اور آج اٹھ کر اس نے کیا دیکھا کہ وہ اوندھے منہ پڑی ہے اس کا سارا جسم اکڑ کر تختہ ہو رہا ہے۔ ایک مرد کے کی طرح۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ جو اپنے بدن کے رونگٹے رونگٹے کے آزاد اور درد کا ہر گھڑی ذکر کرتا تھا، اب بالکل مستعد ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس کو اٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ اور تعجب کی بات ہے کہ وہی ڈاکٹر جس نے ایک دن قبل اس کی تمام تکالیف کو اس کی ماہواری کے خاتمے کا سبب بتایا تھا، آج نئی بات کہہ رہا تھا۔ اس نے اس کی حالت کا سبب کو رونری تھرمبائیس (دماغی انجماد خون) بتایا۔ اور کہا اس کا بچنا محال ہے۔ بس یہی دو تین دن اور کھینچ لے جائے گی۔ یہ سن کر خاوند کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بہر حال کسی نہ کسی طور اپنے آپ کو سنبھالا اور اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بیٹے اور بیٹی کو اطلاع کر دی۔ دونوں ہی بہت دور رہتے تھے۔ دونوں بچے فوراً ہی بھاگے آئے تو باپ کو ماں کے ارد گرد پھرتے دیکھا۔ وہ بری طرح سہا ہوا تھا۔ ان کی ماں کی تو قوت گویائی بھی سلب ہو چکی تھی۔

اگلے دو دن شاید اس کی زندگی کے بہترین دن تھے۔ اس لئے کے تینوں باری باری اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی مالش کرتے رہتے تھے۔ اور حد یہ ہے کہ نرس کو پیشاب پاخانے تک کروانے اور سمیٹنے نہیں دے رہے تھے۔ اس کا ہر دم خود اپنے ہاتھوں سے کر رہے تھے۔

دو دن کے بعد ماں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ نہ حالت گری اور نہ سنبھلی۔ البتہ ہوش وحواس کچھ اور بگڑ گئے۔ اب وہ کسی کو پہچان بھی نہ پاتی تھی۔ ڈاکٹر کو ابھی تک اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ تاہم اس نے یہ بات ضرور کہی کہ ان کے وزن کو دیکھتے ہوئے دل کی حالت بہت مضبوط اور قوی ہے، ہوسکتا ہے کہ توقع سے زیادہ دن نکال لے جائیں۔ بیٹے نے جب یہ دیکھا کہ حال میں کوئی افاقہ نہیں تو دو دن بعد ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ ان کی حالت تو ایک حال پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ لیکن میری تو نوکری پر بن جائے گی۔ مجھے تو واپس جانا ہی پڑے گا کچھ دن کے لئے۔ ادھر بیٹی نے بھی لمبا سا منہ لٹکا لیا۔ وہ بھی اپنے میاں اور بچوں کے لئے پریشان ہونے لگی تھی۔ نہیں معلوم وہ کیا کر رہے ہوں گے۔

اب بے چارہ باپ حیران اور پریشان کہ بیٹی بھی چل دی تو وہ کیا کرے گا۔ وہ بیٹی کے

آگے التجائیں کرنے لگا کہ کچھ دن تو اور ٹھہر جاؤ۔اب بیٹی گومگو کے عالم میں وہ جیسے میاں اور بچوں کے لئے پریشان ہورہی تھی۔اسی طرح باپ کی بے بسی پر بھی پریشان تھی۔آخر وہ کچھ دن ٹھہرنے پر رضا مند ہوہی گئی۔

بیٹی کو وہ دن بھی یاد تھے جب اپنے بچپن میں وہ شدید بیمار ہوگئی تھی اور اس کی ماں دنوں اور ہفتوں اس کے پاس سے نہ ہٹی تھی۔وہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ عورت جو اس کے سامنے بے ہوشی کے عالم میں موت وحیات کی کشمکش میں پڑی ہے، نہ ہوتی تو اس کا بچنا محال تھا۔اور آج وہ زندہ تندرست نہ بیٹھی ہوتی۔ہوسکتا ہے اب یہ آخری بار ہو جو وہ اس کی صورت دیکھ رہی ہے۔لہٰذا وہ اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔

دو دن اور گذر گئے۔اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ آخر اس کی ماں اس حال میں کب تک پڑی رہے گی۔نہ بات کی نہ چیت کی بے حس وحرکت بس ایک سانس کی ڈور ہے جو اٹکی ہوئی ہے۔یہ جینا تو ایک لاش کی زندگی ہے۔اس نے تو اس حد تک سوچنا شروع کر دیا کہ ماں کی زندگی کے باسٹھ سال اوسط عمر سے کچھ کم ہوں گے تاہم جلد یا بدیر مرنا تو برحق ہے اور موت تو ہر ایک کو ہی آتی ہے۔بالفرض ماں اگر اس موجودہ حالت میں انتقال کر جائے تو بھی لوگ اس کی خوش نصیبی پر رشک کریں گے کہ اس کے خاوند اور بیٹی نے بڑی خدمت اور دیکھ بھال کی ہے۔

بیٹی کو ایک مریض کا حال یاد کر کے بے حد وحشت اور پریشانی ہوئی کہ وہ دو سال تک اس حال میں پڑا رہا کہ اس کی رگ کاٹ کر نلکی کے ذریعے اسے غذا دی جاتی تھی۔اب اسے ایک اور فکر لاحق ہونے لگی اگر یہ اتنے عرصہ اس حات میں پڑی رہیں تو کیا ابا کے پاس اتنے پیسے ہوں گے کہ وہ اتنے طویل عرصے تک ہسپتال کے اخراجات برداشت کرسکیں گے؟ علاوہ اخراجات کے اس عالم میں ان کی تیمارداری کون کرے گا۔نہ تو وہ خود نہ ہی اس کا بھائی اتنی لمبی مدت تک اپنے بال بچوں اور گھربار کو تج کر ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھ سکیں گے۔آخر ان کے آگے بھی تو اپنے بال بچوں اور کنبوں کا سوال تھا۔

اس کو اپنی پانچ سال کی بچی کا خیال ستا رہا تھا، جسے وہ اپنی ساس کے پاس چھوڑ آئی تھی۔پھر اسے خیال آیا۔کہ بالکل اسی بچی ہی کی عمر میں ایک مرتبہ اس کو تیز بخار چڑھا تھا اور تقریباً گردن توڑ بخار کی سی کیفیت ہوگئی تھی۔اسے جب بھی ہوش آتا تھا تو ماں کو اپنے بستر کے ساتھ ہی لگا دیکھتی تھی۔ماں کی یہ حالت تھی کہ گھربار کسی چیز کا ہوش نہ رہا تھا۔سارا گھر الٹ پلٹ ہوگیا تھا۔

اس واقعہ کے ذہن میں آتے ہی اس کے خیالات زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا بے بس اور بے حس وحرکت ماں اور اس کی تکلیف سے ہٹ کر اپنی بچی کی طرف مرکوز ہو گئے۔ ایسا نہ وہ اس کی عدم موجودگی میں بیمار پڑ جائے۔ اس خیال سے وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی۔ اور ماں کا یہ حال تھا کہ بیٹی کے تفکرات اور پریشانی سے بے خبر وہ اسی عالم میں زندہ تھی۔ حالت یہ تھی کہ آنکھیں ایسے کھلی تھیں جیسے خلا میں کسی چیز کو تک رہی ہوں۔ وہ گاہے گاہے کراہنے لگتی تھی۔ اور کبھی کبھی منہ ہی منہ میں کچھ بولنے بھی لگتی تھی۔ لیکن کوئی لفظ بھی پلے نہ پڑتا تھا۔ تیسری صبح کو اس کی بیٹی اس حال میں بیدار ہوئی کہ وہ ایک ہفتے کی بے تکان اور لگاتار خدمت سے تھک کر چور ہو رہی تھی۔ اتنی کہ بستر سے اٹھنا محال تھا۔ یہ بڑی افسردہ اور بے رنگ صبح تھی۔ بالکل خاص چیری کے موسم والا ابر آلود دن تھا۔ اب اس نے اپنی بے ہوش ماں کے چہرے کا ایک رخ دیکھا۔ دھیمی دھیمی سانسیں آ رہی تھیں اور جا رہی تھیں۔ اس کے ستے ہوئے رخسار بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ اور اس وقت وہ بہت کم عمر لگ رہی تھی۔

جب صبح کو معائنے کے لئے آنے والے ڈاکٹروں اور نرسوں کے راؤنڈ ختم ہو گئے تو بیٹی کو خیال آیا کہ اس کی ماں کا جسم بہت گندہ اور میلا ہو رہا ہے اس نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ انہیں نہلانے میں کوئی حرج تو نہیں۔ ڈاکٹر نے نرس کو صفائی کرنے کی ہدایت کی اور وہ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں نرس اسپنج اور سامان لے کر آ گئی۔ اس نے بڑے پیشہ ورانہ مشینی انداز میں مریضہ کو اوندھا کر دیا۔ بالکل ایسے جیسے وہ کوئی لکڑی کا ٹکڑا ہو۔ پھر اس کو سیدھا کر کے اس کے بدن سے پسینے اور غلاظت سے آلودہ شب خوابی کا لباس اتار کر اسے بالکل ننگا کر دیا۔ اب عجیب بات ہوئی۔ لباس سے قید سے آزاد ہوتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بیٹی جو ڈرے ڈرے سے انداز میں نرس کی مدد کر رہی تھی اور اس کو سہارا دیئے ہوئے تھی، اس کی طرف دیکھا۔ تو محسوس کیا کہ اس کی روشنی عود کر آئی ہے۔ وہ بیٹی کی طرف دیکھ کر غنودگی اور نقاہت سے مسکرائی۔ آنکھوں کی چمک تھی جیسے پھلجھڑی سے روشنی نکلتی ہو۔ لیکن اس تیز چمک میں بڑی اداسی تھی۔ اور وہ چمک تھی جیسے پھلجھڑی سے ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ فوراً ہی چنگاری جیسے بجھ گئی۔ مریضہ کی آنکھوں کی روشنی جیسے زائل ہو گئی، اس کے منہ سے رال بہہ کر دونوں باچھوں سے ٹپکنے لگی۔ گلے میں ہلکی سی گرگراہٹ ہوئی، آنکھوں کی پتلیوں نے حرکت کرنا بند کر دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے حس وحرکت ہو گئی۔ اور یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا۔

یہ دیکھ کر نرس دوڑی دوڑی ڈاکٹر کو بلانے گئی۔ ڈاکٹر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اس کو مصنوعی تنفس دینے کی کوشش کی۔ پھر اس نے کارڈیک میڈیکیشن کا ایک انجکشن موٹی سی سوئی کے ذریعہ اس کے دل میں لگایا۔ یہ سارا عمل وہ اس انداز میں سرانجام دے رہا تھا۔ جیسے کسی جانور کو جھنجھوڑا جا رہا ہو، جو کسی تجربے کے دوران دم دے دے۔ اسے ایسا کرتے دیکھ کر بالکل احساس نہ ہوتا تھا کہ کسی زندہ انسان کی زندگی بچانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ جو کچھ بھی ہو یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے تیمارداروں اور معالج نے اس کے دل اور نبض کی حرکت بحال کرنے کے لئے مختلف تدابیر کیں، جو چلتے چلتے ٹھہر گیا تھا۔

چانچہ وہ عورت مرگئی۔

نہیں، بلکہ زیادہ صحیح تو یہ بات تھی کہ اس نے اپنے حلق میں پھنسی ہوئی رال کو اپنی سانس کی نالی سے باہر نکال پھینکنے کی کوشش میں اپنی رہی سہی تمام تر قوت مجتمع کی اور اسے باہر نکال کر کے اس ملغوبے سے نجات حاصل کر لی۔ اس نے نگاہ واپسیں کے ساتھ اپنی مسکراہٹ کا تبادلہ اپنی بیٹی کے ساتھ کیا تھا تو اس کے دلی خیالات کو بڑی اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ اس کی بیٹی کی نگاہیں بڑے واضح طور پر یہ کہتی محسوس ہو رہی تھیں کہ وہ اب اس کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہ سکے گی۔ جیسے اس کی آنکھوں میں یہ پیغام تحریر تھا۔ ''اماں مجھے اب تمہارے تحفظ کی، تمہارے سائے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے اپنی افادیت کھودی۔ ہے۔ ضرورت سے زیادہ زندہ رہ کر۔ اب مجھ پر انحصار کر کے ہی زندہ رہ سکتی ہو۔ تم اب اپنے بل بوتے پر زندہ رہنے کے قابل نہیں رہیں۔ تو اماں مجھ پر رحم کرو اور خاموشی سے رخصت ہو جاؤ۔ خدا کے واسطے مجھے پر زیادہ پریشان نہ کرو۔ اس تجربے کے بعد میں اپنے آپ کو اس بات کے لئے تیار کر رہی ہوں کہ میں اپنی بیٹی کے لئے اذیت کا باعث نہ بن سکوں۔ میرا فرض ہے کہ میں آسانی سے اس جہان فانی سے گزر جاؤں۔''

اپنی بیٹی کی نگاہوں میں اس کی سوچوں اور خیالات کی تحریر پڑھ لینے کے بعد، اس نے عجیب سے آسائش اور ایک گونہ راحت محسوس کر لی تھی کہ اس کی کوکھ سے پھوٹنے والی یہ شاخ، یہ اس کی نئی نسل کے اور اس کے شوہر کے نام کو زندہ رکھنے والی بیٹی ایک خاص قوت ارادی کی مالک ہے۔ اس کے مزج کے دو رخ ہیں۔ اس کی شخصیت کی دو پرتیں ہیں۔ ایک وہ جس کے بل بوتے پر ایسے لوگ ہر قسم کی ترغیبات سے بالاتر ہو کر حد اعتدال کو ملحوظ رکھتے ہیں اور اس کو ہی

اپنے ہر عمل کی بنیاد بناتے ہیں۔ بڑی ہما ہمی اور استقامت سے زندگی کی آخری سانس تک زندہ رہتے ہیں۔ چاہے وہ سو سال کی عمر ہی کیوں نہ پائیں۔ اسی شخصیت کی دوسری تہہ یا رخ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بڑی آن بان اور پندار سے دم آخر تک خودغرضی سے زندہ رہیں۔ وہ لوگ اپنی قوت ارادی کے تحت اسی سال کی عمر میں اپنا سفر حیات اپنے ارادے سے ختم کر دیتے ہیں...... اس کی بیٹی کی شخصیت جس رخ پر بھی رواں دواں تھی وہ بہر حال اس کی طرف سے مطمئن ہو چکی تھی کہ وہ بیٹی جس کو اس نے اپنی کوکھ میں رکھا، جنم دیا اور پروان چڑھایا اب اپنے پیروں پر نہایت استقامت سے کھڑی ہے اور کسی طور بھی اس کی ممتا یا سایہ عاطفت کی محتاج نہیں ہے۔ اور یہی بات سکون سے مر جانے کے لئے کافی تھی۔

یہی نہیں اس نے تو اپنی بیٹی کے چہرے اور آنکھوں میں اپنے بیٹے کو بھی جھانکتا دیکھ لیا تھا۔ اور اس دم وہ اپنے ملک کے سب سے بڑے شہر کے بارونق اور پرشور ہجوم میں رواں دواں نظر آ رہا تھا۔ اس کے عیار چہرے پر ایک مکارانہ تبسم تھا۔ گویا وہ اس سے مخاطب تھا۔ اماں میرے گھر پر مسلسل چوں چوں کرتے بھوک سے بلکتے چوزے ہیں اور میں ان کے لئے چوگا لے جانے کی خاطر دانے دنکے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ مجھے خود بھی خبر نہیں کہ آخر میں کس مقصد اور جذبے کے تحت ان کو بھراتا چگاتا رہتا ہوں۔ جب میں اپنے آپ کو اس عمل سے روکنا چاہتا ہوں تو اضطراری طور پر ان کی طرف ہی کھنچا چلا جاتا ہوں۔ جیسے پرندہ بے خیالی میں اڑتا اڑتا اپنے ہی آشیانے کے اردگرد چکر کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ بس یہی میرا حال ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو روکنا بھی چاہوں تو بھی بلا ارادہ چونچ میں دانہ پکڑے ان کو بھرانے پہنچ جاتا ہوں۔ اب اگر میں کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اس عمل سے باز بھی رکھوں تو پھر یہ بھوکے مر جائیں گے۔ اور ماں اگر میں اور تمام دنیا کے بیٹے اپنی ماؤں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جائیں تو نسل انسان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہی قانون فطرت ہے اگر لوگوں کے لئے ایسا کرنا ممکن ہوتا تو نسل آدم کا روئے زمین پر نشان بھی نہ ملتا۔ اس کا بیج ہی مٹ جاتا۔ دیکھو ماں، میری بات سنو، میں جو یہ ساری تگ و دو کر کے ان کے رزق کی بہم رسانی کر رہا ہوں اس کے پیچھے یہی تو مقصد ہے کہ میری رگوں میں تمہارے خون کی امانت تھی وہ میں نے ان کی صورتوں میں ادا کر دی ہے۔ اور اسی خون کے چشمہ کو وسعت دینے اور نسل در نسل جاری رکھنے کا یہی تو سامان بہم پہنچا رہا ہوں۔

آخر میں اس کی نظر میں اپنے شوہر کی جانب اٹھی جو قریب ہی سرنگوں کھویا کھویا سا کھڑا تھا۔ وہ سٹھیایا ہوا عقل سے اترا ہوا اپنی بیوی کی برہنگی کے عالم سے مبہوت تھا۔ اس کے بدن کا برہنہ پن، اس کو اپنے اندر جذب کیے لئے رہا تھا۔ اس کی وفاؤں کو پابستہ کر رہا تھا۔ اتنا کہ وہ آخری سانس تک اس کے پاس ہی رہا۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی مسرت یہی ہے کہ وہ کسی کو خوشیاں دے سکے۔ وہ اس شخص کی ذات سے یوں مطمئن تھی کہ اس میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ کسی بھی پریشانی، تفکر اور ایسی ہی کسی صورت حال کو خوشیوں میں بدل دینے پر قادر تھا۔ اس نے اب اپنی زندگی کے اس نئے باب کو رحمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ وہ کچھ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ اس کی موت پر بجنے والی گھنٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی ہے۔ وہ اپنے جنازے پر بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز سن رہی ہے۔

اس نے جیسے اپنے ہاتھوں سے اپنا کفن تیار کیا ہوا اور سجایا ہو۔ دریا کی خشک تہہ میں اتر کر جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایسا لگا کہ کوئی بال پریشان کیے ہوا کے تند جھکڑوں میں گرتا پڑتا اس کے تعاقب میں چلا آتا ہے۔ اس نے ایک قریبی مردے سے، جس کی موجودگی کا احساس اسے پہلے نہیں تھا، پوچھا کہ یہ کون بال بکھیرے افتاں وخیزاں چلا آتا ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ میرا ہی جیسا ایک اور راہ گم کردہ مسافر ہے جس کا تعاقب کوہسار کی ایک ڈائن یا چڑیل کر رہی ہے۔

اس نے اپنے اس کفن تلے جو اس نے اپنے تصور میں سجایا، ہلکی ہلکی سانسوں کا ارتعاش سنا۔ جیسے خواب گراں سے کوہستان کی چڑیل بیدار ہو رہی ہو۔ پھر یہ دھڑکنیں واضح طور پر پوری توانائی کے ساتھ جاری ہو گئیں۔ جیسے ہمیشہ ہی ہوا کرتی تھیں۔ اچھا تو کوہستانی چڑیل ایک حیات نو سے سرشار ہو رہی ہے۔ اس خیال سے وہ مسکرا دی تھی۔ تو اور کیا بس اتنا ہی تو ہوا تھا کہ خون کی شریانیں اور نالیاں بند ہو گئی تھی۔ اور انہوں نے جسم میں خون کی بہم رسانی بند کر دی تھی۔ ان کے دہانے اور رگوں اور شریانوں کے منہ نلکوں کی ٹونٹیوں کی طرح کس کر بند کر دیئے گئے تھے سدا کے لئے۔

وقت آ گیا تھا کہ کوہسار کی چڑیل کا طائر بدن کی قید سے آزاد ہو۔ ایک آزاد پنچھی کی طرح اڑتا ہوا کوہسارے کے سکوت سے ہم کنار ہو جائے۔ اب وہ وقت آن پہنچا ہے۔ جب وہ ہر قسم کے رشتوں سے آزاد اور بے نیاز پہاڑ کی چٹان کے کنارے پر جا کھڑی ہو۔ تیز وتند

ہواؤں میں اڑتے ہوئے سفید اور پریشان بالوں کو لہراتی ہوئی۔ اور ہوا کے جھکڑوں کی تند آوازیں کوہسار کے قالب کی ابدی گھن گرج بن کر چارسو گونجتی ہوئی سنائی دینے لگیں۔ وہ اتنے عرصے انسانی بستیوں میں ایک بہروپ دھار کر ہی تو رہتی رہی تھی۔ جیسے کوئی جانور کسی انسانی قالب میں چھپا ہوا وقت گذار رہا ہو۔ اور پھر ایک وقت آنے پر اس کا قالب اس کا ساتھ چھوڑ جائے۔ اب قالب اور بدن کا یہ خواب تمام ہوا۔

پہاڑوں کی تنہائی اور سکوت میں جا بسنے کے خواب جو وہ تنہائی میں دیکھا کرتی تھی۔ ان تمام دنوں کی افسردگی جب ایک نوعمر لڑکی حیثیت سے اس نے انسانوں کو ناپسند کرنا اور ان سے الگ تھلگ رہنا شروع کر دیا تھا۔ غرض ہر ہر یاد اس وقت تازہ ہو رہی تھی۔ اور وہ سر جھٹک کر اس کو اپنے دماغ سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اگر اس کا مسکن کوہستانی ہوتا تو وہ یقیناً کوہستانی چڑیل بن گئی ہوتی۔ اور بستی کے لوگوں کو کچا چبایا کرتی۔

پہلے وہ سوچا کرتی تھی کہ کون سی زندگی اس کے لئے مسرور کن ہوگی۔ پہاڑوں میں جا کر آدم خور چڑیل کی حیثیت سے ملنے والی زندگی؟ یا پھر پہاڑی چڑیل کی حیثیت سے انسان کے روپ میں آدمیوں کی بستی میں رہنا؟ لیکن اس وقت جب کہ اس کی مادی کتاب حیات کا آخری باب ختم ہونے کو تھا۔ اس وقت یہ پتہ چلا کہ ایک ہی بات تھی دونوں صورتوں میں۔ اگر وہ کوہستان میں چڑیل بن کر رہتی تو وہ کوہستانی چڑیل کہلاتی۔ اور آبادیوں میں رہتی تو انسان کے بھیس میں لومڑی کا لقب پاتی۔ یا پھر ایک ایسی غیر معمولی عورت قرار پاتی جو ایک توانا اور بے حد مضبوط جسم اور ذہن کی مالک تھی اور فطری زندگی بسر کر گئی۔ بس یہی فرق تھا۔ ورنہ جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا اور یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟ بات ایک ہی تھی۔

آخری سانس اور ہچکی لینے سے لحہ بھر پہلے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ دراصل اس کی اپنی ماں ضرور خالص اور اصلی کوہستانی چڑیل تھی۔ اسلئے کہ یہ بے حد حیران کن حقیقت ہے کہ مرتے وقت اس کی ماں کا چہرہ اتنا بے ریا اور معصوم نظر آ رہا تھا، کہ اس پر ننھے سے معصوم بچے کی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

پھر وہ عورت جو اتنے سکون سے مر گئی اس کی بیٹی نے اس سے چمٹ کر بری طرح روتے ہوئے کہا تھا کہ ہائے موت کا کتنا حسین روپ آیا ہے۔ اس چہرے پر اس کی متورم آنکھیں اس بات کا کامل ثبوت تھیں کہ اب اس کے دل کو قرار آ گیا ہے۔ ”میری ماں اتنا روپ چڑھا

ہے تم پر یقیناً تم نے بڑی خوش باش اور مطمئن زندگی گذاری ہے۔'' وہ سسکیوں اور ہچکیوں سے رو رو کر کہہ رہی تھی۔ اور اس کا باپ جو مرنے والی کا خاوند تھا۔ خاموش گریہ کر رہا تھا۔ اس کی آنسو بھری آنکھیں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے مچھلیاں تالاب میں۔

ہایاشی کائی اوکو

زرد ریت

میں نے جیسے ہی برساتی دروازے کھول کر باہر دیکھا آسمان پر ایک بھورا غبار سا چھایا نظر آیا۔صبح کی خبروں میں اس غبار کو پیلی آندھی کا نام دیا گیا تھا۔

آندھی کا یہ غبار چین کے اندرون سے اٹھا تھا۔اور دریائے زرد اور جزیرہ نما کوریا پر سے مغربی ہواؤں کے دوش پر گذرتا ہوا ایک وسیع علاقے پر جو کوئی یوشو سے کانٹو اور ہوکیوریکو کے اضلاع تک پھیلا ہوا تھا، چھا گیا تھا۔مغربی ہواؤں کے ذریعہ زرد آندھی کا یہ طوفان چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہوا جاپان تک پہنچنے میں ایک یا دو دن لگاتا ہے۔دو دن کا یہ فاصلہ طے کرتے کرتے ہوتا یہ ہے کہ ریت اور غبار کے بڑے درخت جزیرہ نمائے کوریا کے پہاڑوں پر برس جاتے ہیں اور کچھ دریائے زرد کی تہہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔نسبتاً چھوٹے اور ہلکے ذرات ہی جاپان تک پہنچتے ہیں۔اور جاپان کے آسمان پر غبار بن کر چھا جاتے ہیں۔

لیکن آج کی رپوٹ میں بتایا گیا تھا کہ جاپان بھر میں دھوئیں کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور ایسا لگ رہا ہے جیسے بادلوں اور ریت کے غبار کی دبیز تہہ پر کسی نے موٹے کپڑے کی چادر اوڑھا دی ہے۔یا موٹا سوتی ہیٹ رکھ دیا ہے۔ایسے موقعوں پر دن کے وقت پیلی پیلی ریت برستی ہے۔اس کی وجہ سے ایک عجیب سی روشنی پھیل جاتی ہے۔اس وقت میرے گھر کے سامنے والا گھاس کا قطعہ، تمام درخت اور پہاڑیاں سب اس روشنی میں نہائے ہوئے ہیں۔پیلی سی روشنی کچھ ایسی نظر آرہی ہے جیسے دودھیا سے دھندلی فضا نظر آئے۔

چین وہ جگہ ہے جہاں میرا لڑکپن گذرا ہے۔ہم شنگھائی میں رہا کرتے تھے۔اس زمانے میں چائنا کو شائنا کہا جاتا تھا۔خیر تو اس مقام اور علاقے سے جو شنگھائی سے آگے پھیلتا جاتا ہے

دھوئیں کا ایک بادل اٹھتا ہے اور اندرون جاپان میں ہواؤں کے دوش پر اترتا ہے۔

اس وقت میری خواہش تھی کہ آندھی کے غبار کو براہ راست اپنی جلد پر محسوس کروں۔ چنانچہ میں باہر میدان کی طرف چلی گئی اور اپنے بازو پھیلا کر میں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر میں نے منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کتے کی مانند جھرجھری سی آ گئی جو نہاتے ہوئے لرزتا اور کانپتا اور اپنا سر جھٹکتا ہے۔ ہوا کی نمی میرے رخساروں کو چھو رہی تھی۔ فضا میں دور دراز برعظیم کی مٹی کی باس تھی۔ دھوپ میں ہر سو ایک بدبو تعفن سا پھیلا ہوا تھا۔ لیکن ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو۔

جب ہم شنگھائی میں تھے تو وہاں عموماً مارچ کے مہینے میں ایسی آندھیاں چلتی تھیں۔ وہاں ایک کہاوت تھی ''دس ہزار گز پرے سے آنے والی پیلی آندھی۔'' یہ زرد آندھی تائی یوآن کے آس پاس کے علاقے سے جو صحرائے گوبی سے بہت نزدیک ہے، اٹھتی اور شنگھائی کا رخ کرتی تھی۔ شنگھائی میں آندھی کے دوران آسمان زمین کا ہم رنگ نظر آتا ہے۔ دونوں ایک ہی زرد رنگ میں رنگے ہوئے۔ یہاں تک کہ دریائے ہوانگ یو کا پانی تک مٹیالا اور گدلا ہو جایا کرتا تھا۔ پانی کی روانی میں اضافہ ہو جاتا اور پانی کی سطح اونچی ہو جاتی تھی۔ ان دونوں کھیتوں میں سرسوں پھول رہی ہوتی تھی۔ وہاں کی زمین اور آسمان ایک ہی پیلے رنگ میں ڈوبے ہوتے۔ شنگھائی کے موسم بہار کا دلچسپ پہلو یہی تو ہے کہ ان دنوں زمین اور آسمان ایسے ہی ہم رنگ ہو جاتے ہیں کہ دونوں کے درمیان فرق اور امتیاز مٹ جاتا ہے۔

اب اس وقت غبار آلود ہونے کے باوجود ہوا میں نمی اور بھیگا پن ہے اور جلد پر اس کے لمس کی نرمی اور نمی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ کھیت والے قطعے میں بھی نمی اور گرمی کی کیفیت موجود ہے۔ اور اب دنوں میں چلنے والی مخصوص زرد اور نم ہوا چار سو چلتی نظر آ رہی ہے۔ بالکل اسی انداز میں جیسے میرے خیالوں میں متوقع تھی۔ فضا میں سے، غبار میں سے دنیا کتنی دھندلی دھندلی نظر آ رہی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ بس اس واقعے یعنی آندھی اور غبار کے اس طرح فضا میں تن جانے سے میری بچپن کی یادوں کے ذخیرے میں سے ایک منظر بہت نمایاں اور اجاگر ہو کر میرے سامنے پھیل گیا ہے۔ ایسا ہو بہو اور من و عن نقشہ اتنا واضح اور شفاف کہ ایک انگلی کا نشان بھی اس پر نظر آئے۔ میں زیادہ گہرے غبار سے لدی پیلی زرد ہوا کے جھکڑوں کی کھوج میں آگے بڑھنے لگی اور

چلتے چلتے راستے کے اس طرف چلی گئی جسے تین طرف سے پہاڑیوں نے گھیر رکھا تھا۔ پھر راستہ بند ہوگیا۔ میں ایک معمولی سی چکنی ڈھلان پر پہنچ گئی۔

ڈھلان پر پہنچ کر اس بلندی سے نیچے کی طرف دیکھا تو مجھے قصبے کے مکانوں کی قطاریں نظر آئیں۔ چونکہ قصبہ گہرائی یعنی وادی میں تھا۔ اس لئے کھیتوں کی کھلی فضا کی بہ نسبت یہاں ہوا کا دباؤ زیادہ تھا۔ اور فشار کم، اسی وجہ سے یہاں چلنے والے آندھی کے جھکڑوں کا رنگ زیادہ نمایاں اور گاڑھا تھا۔ ہوا کے بگولے مکانوں کی اولتیوں پر رقصاں نظر آتے تھے۔ میں سڑک کے عین وسط میں جاکر رک گئی۔ بل کھاتی ہوا کے بگولے ڈھلوان کے دامن سے اٹھتے ہوئے مخصوص سی آوازیں پیدا کرتے اوپر کی طرف آرہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ہوا کا راگ سننے لگی۔ ہوا کا یہ مرتعش راگ جب میرے کانوں میں رقصاں انداز میں ہورہا تھا تو اس وقت یادوں کے دریچے سے ایک اور منظر کھلا۔ میں یادوں کی راہ گزر پر چلتی چلتی سرسوں کے اس کھیت کے منظر میں داخل ہوگئی جہاں میں پہلی مرتبہ اوکی یوسان کے ساتھ گئی تھی اور وہ میرے بہت بچپن کا زمانہ تھا۔

پہلی مرتبہ میں اوکی یوسان سے 1937ء کے موسم بہار میں ملی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب میں نئی نئی شنگھائی کے اسکول کی پرائمری جماعت میں داخل ہوئی تھی۔ اس وقت اوکی یوسان کی عمر کوئی تیئس چوبیس سال رہی ہوگی۔ اسی سال جولائی کی سات تاریخ تھی۔ جب مارکو پولو برج پر چینی افواج کے درمیان تصادم ہوا۔ اور یہی وہ چنگاری تھی جس نے چین اور جاپان کے درمیان جنگ کے شعلوں کو ہوا دی تھی۔ ہم دونوں ہی کے گھر یعنی اوکی سان کا اور میرا گھر گارڈن برج کے قریب اس علاقے میں تھے جسے ہانگ کاؤ کی شہر پناہ کہا جاسکتا ہے۔ ہانگ کاؤ شنگھائی ضلع میں تھا جو ان دنوں جاپانی کی عمل داری میں تھا۔ گارڈن برج کے مساوی، ہوانگ پو کے بالائی علاقہ کی حد بندی کے طور پر ایک بین الاقوامی بستی آباد تھی جس پر انگریزی، فرانسیسی اور امریکی کنٹرول تھا۔ پل کے اس جانب ہانگ کاؤ کی جاپانی آبادی تھی اور یہیں اوکی سان کا گھر میرے سے چار قدم کے فاصلے پر تھا۔ اس علاقے میں سرخ اینٹوں کے ایک ہی طرز پر بنے ہوئے گھر قطار در قطار کھڑے تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کا رخ بین الاقوامی بستی کی جانب تھا جو دریا کے اس پار تھی۔ اس لئے ان کی طرز تعمیر پر بیرونی اثرات غالب تھے۔ وہی برطانوی طرز پر بنی ہوئی سرخ اینٹوں والی سہ منزلہ بھوری ڈھلوان چھتوں والی بلڈنگیں ہر گھر کی چھت پر مستطیل دودکش

(چمنیاں) جس کے ساتھ رہائشی کمروں کے آتش دان منسلک تھے۔ ہر چھت پر ایک گھوڑے کی زین سے مشابہ ابھار، تنگ تنگ سے لان جس کے ساتھ کوئی باڑھ یا جنگلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ سنگی راستہ سے براہ راست ہی لان تک جا سکتے تھے۔

اوکی سان ایسے ہی گھر میں چند طوائفوں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ اس کی تمام ساتھی طوائفیں سفید فام روسی نژاد تھیں اور ان کے درمیان وہ واحد جاپانی تھی۔ جس دن چین اور جاپان کی جنگ چھڑی تھی اسی شام تک شنگھائی میں جاپانی فوجی ٹڈی دل کی طرح امڈ آئے تھے۔ اور شنگھائی شہر یعں لگتا تھا جیسے فوج سے لبالب بھرا پیالہ ہو۔ پورے شہر میں قحبہ خانے کھلے ہوئے تھے۔ جاپانی قحبائیں دراصل جاپانیوں کے اور ایسے ریستورانوں میں کام کرتی تھیں، جہاں کی انتظامیہ جاپانیوں پر مشتمل تھی۔ یہ قحبائیں دو حصوں میں منقسم تھیں، ایک فوجی طوائفیں دوسری بحریہ کی۔ انہیں طوائف یا قحبہ کے نام سے نہیں پکارا جاتا تھا۔ اب مجھے نہیں پتہ کہ ان کی خدمات کے معاوضوں کی کیا صورت تھی۔ خیر جو بھی طریقہ اختیار کیا جاتا ہو میں یہ جانتی ہوں کہ کوئی بھی جاپانی طوائف کے نام سے آشنا نہ تھا۔ اوکی یوسان ہی وہ واحد جاپانی عورت تھی جو کھلم کھلا یہ پیشہ کرتی تھی۔ گھروں کے آگے والے میدان کے ساتھ ایک پتلی سی سڑک تھی جس کے دورویہ بلین کے پیڑ کھڑے تھے۔ سنگی راستے کے آگے ہوانگ پو بہتا تھا۔ دریا کے بالکل سامنے ایک چوبی بنچ لوگوں کے ستانے اور بیٹھے کے لئے پڑی تھی۔ بالکل ایسی ہی دوسری بنچ اوکی یوسان کے گھر کے سامنے کی طرف پڑی تھی۔ مجھے اس بنچ پر بیٹھ کر دریا میں آتے جاتے اسٹیمروں کو دیکھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔

اس دن دوپہر کے کھانے کے بعد میں بنچ پر بیٹھی اسٹیمروں کی آمدورفت کا نظارہ کر رہی تھی کہ اچانک میری نگاہ اوکی یوسان کے گھر کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ عام طور پر دن کے وقت اس جگہ خاموشی ہی طاری رہتی تھی۔ میں نے شوروغوغا سن کر ادھر مڑ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ سب کے سب قلی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ بندرگاہ پر وہ اپنی ڈیوٹیاں ختم کر چکے تھے۔ انہوں نے چار پانچ منٹ کے اندر ہی اندر ایک انسانی باڑھ یا دیوار تیار کر لی تھی۔ یہ تعداد میں بیس تھے۔ وہ سب کے سب اس گھر کے احاطے کی طرف دیکھ کر چلا رہے تھے۔

احاطے میں ان لوگوں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت تھا۔ ایک شخص اس درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ یہ ایک کالے رنگ کا آدمی تھا جو اکثر یہاں گھومتا پھرتا نظر آتا تھا۔ کوئی

تئیس چوبیس سال اس کی عمر رہی ہوگی۔ یعنی وہ اوکی یوسان کا ہم سن ہی تھا۔ اور وہ چینی سلک کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ قلی انگلیاں اٹھا اٹھا کر اس آدمی کی طرف اشارے کر رہے تھے اور چلا رہے تھے، ایک سو، دوسو۔'' وہ آدمی جو بغلوں میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا، بڑے رئیسانہ اور نوابانہ انداز میں مسکرا رہا تھا اور اپنا سر نفی میں ہلاتا جا رہا تھا۔ اس کی ہٹ دھرمی کا اندازہ کر کے قلیوں نے آپ آپنی آوازیں اور بلند کر دی تھیں۔ اب بولی کے ہندسے دس دس پندرہ پندرہ کر کے بڑھتے جا رہے تھے۔

شنگھائی میں شرطیں لگانا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جہاں دس پانچ آدمی مل بیٹھتے وہیں شرطیں لگنا شروع ہو جاتیں۔ کسی چیز پر بھی شرط لگائی جا سکتی تھی۔ کبھی کبھی تو انتہا یہ ہو جاتی کہ گلی میں ایک چیونٹی رینگتی نظر آ جاتی یا کسی بے روغن کے برتن میں دو چار جھینگر پڑے ہوتے تو شرطیں لگنے لگیں۔ پھر یوں ہوتا کہ لوگ گھاس کے لمبے باریک تنکے ہاتھوں میں پکڑے جھینگروں کی ٹانگوں اور کولہوں کو کچوک کچوک کر یہ طے کر رہے ہیں کہ کون سا جھینگر زیادہ اچھی جھنکار لگائے گا۔ غرض جس شے پر نظر پڑ جاتی۔ شرطیں لگانے بیٹھ جاتے۔

مجھے ایسے لگا جیسے اوکی یوسان کے گھر کے سامنے بھی اب شرطیں لگنے کا کاروبار شروع ہو گیا ہے۔ مارے شوق کے میں نے جلدی جلدی دو رویہ درختوں والی گلی پار کی اور جا کر ہجوم میں مل گئی اور دیکھنے لگی کہ کس چیز پر شرطیں لگ رہی ہیں۔ گھاس والے قطعے کے بیچ میں بانس کی بنچ پڑی تھی۔ اور شرطیں اسی بنچ کے ارد گرد کھڑے ہو کر لگائی جا رہی تھیں لیکن اس کے آس پاس کوئی دوسری شے نظر نہیں آ رہی تھی، جو مجھے نظر آیا وہ موسم بہار کا ٹیالہ سورج تھا۔ زرد دھول میں لپٹا سورج، بانس کی عنبریں چھال پر چمکتا نظر آ رہا تھا۔

ایک قلی نے اونچی میں بولی لگائی تین سو۔ یکے بعد دیگرے تین انگلیاں اور اٹھ گئیں۔ تین سو۔ تین سو اور اس کے ساتھ ہی انگلیاں تیسری منزل کی جانب اٹھیں اور انہوں ے آواز لگائی ''اوکی یوا۔''

اس گھر کی تیسری منزل کا ایک دریچہ ہانگ پوکی جانب کھلتا تھا۔ ہمارے گھر میں تو یہ تیسیر منزل بچوں کے کھیلنے کودنے کے لئے مخصوص تھی۔ اگر ہم اپنے دونوں بازو اونچے کر کے اچھلتے تو بڑی آسانی سے چھت کی کڑیاں چھو سکتے تھے۔ اس لئے کہ چھت نیچی تھی۔ یہ کمرہ دس چٹائیوں بھر کا تھا۔ لیکن اس کا فقط ایک ہی دریچہ تھا۔ یہ کمرہ تو دن کے وقت بھی تاریک ہی رہتا تھا۔ خواہ کتنا

ہی روشن اور چمکیلا دن کیوں نہ ہو۔ اندر سے نیم تاریکی میں یہ گولڈفش کا ایک بڑا سا مرتبان ہی لگتا تھا۔ اس لئے سورج کا عکس سنہری حلقوں کی صورت میں کبھی اس دیوار پر کبھی اس دیوار پر پڑتا ہوتا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے سنہری مچھلی پانی کے اندر تڑپتی پھرتی ہو۔

یقیناً یہ تیسری منزل کی دوچھتی یعنی بالا خانہ ہی اوکی یو کا رہائشی کمرہ تھا۔ جس کے بند دریچے پر نیلے رنگ کا پردہ لگا ہوا تھا۔ قلی مسلسل آوازیں دے رہے تھے اور اس کو ترغیب دے رہے تھے کہ وہ اس کھڑکی کے راستے نیچے آجائے۔ پھر سلک کے لباس والے آدمی نے ہاتھ اونچے کرکے قلیوں کے ہجوم کو خاموش کیا۔ اور صدر دروازے کا دستہ آہستہ سے گھوما جیسے کوئی اندر سے کھول رہا ہو۔ پھر دودھیا شیشے والا آرائشی دروازہ تھوڑا کھلا اور اس میں سے اوکی یو ایسے دھیرے سے نمودار ہوئی جیسے چھوٹی سی نقرئی مچھلی پانی کی تہہ میں گھاس کے اندر سے لہراتی لہراتی سطح پر آجائے۔ اس کے سامنے آتے ہی قلی ایک دم خاموش ہوگئے۔

اوکی یوسان نے چینی لباس پہنا ہوا تھا۔ عام دنوں میں وہ ٹھنڈے کپڑے کے کیمونو پر سرخ باہکا تا کا ٹپکا باندھتی تھی۔ میں نے اسے آج پہلی مرتبہ چینی لباس میں دیکھا تھا۔ بالوں کا جوڑا ابھی فولادی خود کی طرح جھکتے ہوئے ایک گمزی کی صورت بندھا ہوا تھا۔ اس نے چینی کوٹ کے نیچے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا اور کوٹ نما کرتے کا چاک ران سے کچھ اوپر تک کھلا ہوا تھا۔ بغیر موزوں کے پیروں میں چینی جوتیاں پہن کر رکھی تھی اس نے جس قدر صفائی سے چکنا کر کے جوڑا باندھا ہوا تھا، اس کے مقابلے میں اسکی کھال اتنی چکنی اور شفاف نہ تھی۔ یا اس نے اپنے لچکنار بازوؤں کو سادہ فطری انداز میں ڈھیلا چھوڑ رکھا تھا۔ اب اوکی یوسان دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ سلک کے لباس والا آدمی آہستہ آہستہ صوفے کی طرف جا کھڑا ہوا۔ اس کو ادھر جاتے دیکھ کر وہ بھی اسی طرف چل پڑی۔ پھر صوفے کے بالکل کنارے پر ٹک گئی اور پیروں کو بڑے انداز سے جوڑ لیا۔ آدمی بھی اسکے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ پھر اس آدمی نے اسکو تھوڑا سا اپنی طرف کھینچا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے۔ پھر اس کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر کاؤچ کے نیچے دھکا دے دیا۔ اوکی یوسان نے گرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اس شخص کو دوہتڑ مارنے شروع کر دیئے۔ وہ اپنی پانچوں انگلیوں کو علیحدہ علیحدہ چیر کر پنجہ سا بنا کر اسے مار رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ دوہتڑ نہ تو مذاق میں مار رہی ہے نہ ہی سنجیدگی اور غصے میں۔ آدمی نے اچانک اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کے ساتھ ہی دوسری کلائی بھی دبوچ کر پھر دونوں کو ایک ساتھ جکڑ لیا۔ دونوں ہاتھ

قابو میں کر لینے کے بعد اس نے دونوں ٹانگوں کی بندش میں اسے مضبوطی سے جکڑ لیا۔

اس کے ساتھ ہی دونوں بالکل ساکت ہو گئے۔قلیوں نے ''دی دی'' کی آوازیں نکالنا اور چیخنا شروع کر دیا۔ایک شخص پوری قوت سے اس آدمی کی پیٹھ پر ہاتھ مارنے لگا۔ پھر ایک آدمی اچھلا۔اس کے ساتھ ہی اوکی یوسان بھی پوری چستی اور عجلت سے اچھلی اور اپنے کپڑوں کی شکنیں درست کرتے ہوئے سرخ ڈیزی کے رنگ کی لپ اسٹک سے رنگے ہونٹ ٹیڑھے کر کے مسکرائی۔آدمی اس کے آگے جھکا اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر دست بستہ بیٹھ گیا۔قلی پاگلوں کی طرح تالیاں پیٹنے لگے۔اور انہوں نے بازی لگائی ہوئی رقم سوسو دو دوسو اور اس سے بھی زیادہ پھینکنا شروع کر دی تھی۔ وہ پورے جوش و خروش سے بار بار تالیاں پیٹ رہے تھے۔تانبے کے سکے اور نوٹ اپنے قدموں میں برستے دیکھ کر آدمی قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔اوکی یوسان بھی اونچے قہقہے لگا رہی تھی۔اور اپنا پیٹ گھونسوں سے پیٹ رہی تھی۔

شرط اس بات پر بدی گئی تھی کہ دیکھیں مرد عورت پر کامیابی سے حملہ آور ہو سکتا ہے یا عوت اپنا دفاع بہتر طریقے سے کر سکتی ہے۔میچ بڑی تیزی سے ختم ہو گیا اور عورت ہار گئی۔

میں نے اس قسم کا منظر پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔اور سچی بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا اور نہ ہی منظر اتنا واضح تھا کہ میرے ذہن پر اس کا کوئی تاثر قائم ہوتا۔اور بعد میں ذہن میں کوئی کھلبلی مچاتا۔بس ایک تماشہ تھا جو کھلے آسمان تلے دن کی روشنی میں ہوا۔دیکھنے میں ایسا ہی مزا آیا تھا جیسے دھان کی بالیوں پر اڑتی ہوئی کابلی مکھی کو آپس میں اختلاط کرتے دیکھ کر آئے۔

قلی جا چکے تھے۔اور وہ آدمی بھی جا چکا تھا۔روش اب لوگوں سے خالی ہو چکی تھی اور اب میں وہاں اکیلی کھڑی تھی۔اوکی یوسان کو غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ میری جانب سے پیٹھ موڑے کھڑی تھی۔شاید اس کو میرے مسلسل گھورنے کا احساس ہو گیا تھا اس لئے اس نے گھوم کر مجھے حیرت سے دیکھا اور مجھ سے پوچھا ''بیٹی تم جاپانی ہو؟''

''ہاں بالکل'' میں نے جواب دیا۔

''تم دیکھ رہی تھیں؟''

''ہاں آں'' میں وثوق سے کہا۔وہ چپ سی ہو گئی پھر بولی۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔''

ٹہلتے ہوئے ہم پھر پل کی طرف چلے گئے۔اوکی یوسان بنچ پر بیٹھ گئی۔میں بھی ذرا پرے

ہٹ کر بیٹھ گئی۔ ایک اسٹیمر دریا کے بالائی طرف سے آ رہا تھا۔ دریا کی سطح چڑھ رہی تھی اور جوار بھاٹے کے سبب پانی کی سطح اٹھی ہوئی تھی۔ اوکی یوسان نیم وا آنکھوں سے اسٹیمر کو موجوں کی مخالف سمت کو جاتے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اچانک ہی مجھ سے سوال کیا۔

''کیا تمہارا خیال ہے اگر کشتی کے اردگرد کسی مضبوط لکڑی مثلاً شاہ بلوط کا جنگلہ لگا دیا جائے تو اس کشتی کے ذریعہ وطن پہنچا جا سکتا ہے؟''

''خیر ناممکن تو نہیں لیکن بہت خطرناک ترکیب ہے اور جب کہ شنگھائی اور ناگاساکی کے درمیان چلنے والی پانچ ہزار ٹن کی نہایت اچھی بڑی کشتیاں مسلسل آتی جاتی رہتی ہیں۔ ایک بار کشتی میں سوار ہو جاؤ تو اگلے دن جاپان میں حسب خواہش پہنچ سکتی ہو۔ پھر یہ خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔'' مجھے بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ آخر اس پر کیا مصیبت ہے جو اس طرح خفیہ طور پر ایک چھوٹی کشتی پر تختوں کا جنگلہ لگا کر ہوانگ پو دریا عبور کر کے وطن پہنچنے کی سوچ رہی ہے۔

اوکی یوسان وطن واپسی کا ایسا ناممکن العمل منصوبہ بنا کر وطن سے دوری اور محرومی کے احساس سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اور محرومی کے احساس سے نجات حاصل کرنے کا سبب یقیناً اس کا اپنے ماضی سے تعلق تھا۔ ماضی کا وہ راز یا حادثہ جس نے اس کو تیئس چوبیس سال کی عمر میں سمندر عبور کر کے شنگھائی میں اپنی ہم وطن بہنوں سے دور رہ کر ایسی بدیسی عورتوں کے درمیان رہنے پر مجبور کر دیا جو اپنے ملکوں سے بھاگ کر یہاں آن بسی ہیں۔ یقیناً ماضی کا وہ واقعہ یا حادثہ ایسا دردناک اور سخت ہوگا جس نے اس کو اپنے وطن سے دور رہنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا۔ اس کا خیال میرے ذہن سے ماؤف ہوتا گیا۔ لیکن چونکہ مدتوں پہلے اس نے مجھ سے مشورہ لیا تھا کہ اس طرح کشتی کے سفر کے ذریعہ وطن پہنچنے کے کیا امکانات ہیں۔ وہ خیال اور تصور میرے ذہن میں جاگزیں رہا اور میں اس وقت سے ہی ہوانگ پو کے بہاؤ کی آخری حد پر اپنے وطن کا تصور کرنے لگی تھی۔ اب تک میرے ذہن میں اس پار رہنے والے ہم وطنوں کے بارے میں کوئی واضح تصور موجود نہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے میری والدہ کو بتا دیا کہ میں نے اوکی یوسان کے گھر پر ہونے والی واردات یا تماشے کا نظارہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے

تصدیق کی خاطر پوچھا۔ ''کیوں؟ تم نے وہ سب دیکھا تھا؟''

''جی'' میں نے جواب دیا۔ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دوبارہ سوال

کیا۔ ’’تم دیکھ رہی تھیں سب کچھ۔‘‘ ’’جی!‘‘ میں نے دوبارہ جواب دیا۔ ’’بے شرم کہیں کی۔‘‘ میری والدہ نے غصے سے کہا۔

’’کم بخت جاپانی ہو کر لوگوں کے سامنے یوں بے حیائی کا مظاہرہ کیا۔ یہ عورت تو ہماری قوم کے لئے باعث شرم ہے۔‘‘ پھر انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ ’’ایسی عورت کو تو جبراً وطن واپس بھیج دینا چاہئے۔‘‘

اوکی یوسان کے بارے میں ان بالغ اور باشعور جاپانیوں کے جو اس قصبے میں آباد تھے، یہی خیالات تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے والا ہر شخص اپنے وطن اور قوم کا نمائندہ ہوتا ہے اور ہر شخص کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے۔ یہ وقت اور زمانے کا تقاضہ تھا کہ ہر اس جاپانی کو قومی حمیت اور عزت کا بڑا خیال اور احساس ہونا چاہئے جو اس آبادی میں مقیم تھے۔ ان کی عورتوں پر یہ پابندی عائد کی گئی تھی کہ بغیر جرابوں کے یا لمبے موزے پہنے بغیر باہر نہ نکلیں۔ اس بات کا سختی سے خیال رکھا جاتا تھا کہ جاپانی عورتوں کی جلد تک پر غیر ملکیوں کی نگاہ نہ پڑے۔ خود میری والدہ ہمیشہ تابی یعنی پاجامے نما موزوں کے بغیر نہیں نکلتی تھیں۔ گویا امیری اور دولت مندی کی سند اور توثیق اور معیار ہی موزے تھے۔ فقیر یا چور ہونا تو بڑی بات تھی، وہاں تو مفلسی بھی غیر محبّ وطن ہونے اور بے حمیتی کی علامت تھی۔ یہ مظاہر صرف غیر ملکیوں اور بدیسیوں کی نگاہوں تک محدود نہ تھے بلکہ آپس میں بھی ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ ان کی گفتگو میں عموماً غدار، وطن دشمن کے الفاظ سننے میں آتے تھے۔ یہاں تک کہ جب بچے آپس میں لڑتے تو ایک دوسرے کو کہتے تم کو جبراً وطن بھیج دیا جائے گا۔ اگر چہ بچے ان باتوں کے مفہوم سے قطعی آگاہ نہ تھے۔ اور ان کو قطعی یہ احساس نہ تھا کہ اس طرح وہ وطن کی کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

جوں جوں ان کے انتہا پسندانہ الفاظ کا استعمال بالغ اور پختہ کار لوگوں کے درمیان بڑھتا تھا ان کے درمیان قبائلی عصبیتیں بھی پروان چڑھ رہی تھیں اور اس طرح شنگھائی میں امن عامہ کا مسئلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں نے اپنے تحفظ اور سلامتی کے خیال سے ایک شہری انجمن بنا ڈالی تھی۔ پھر ایک اور نگران کمیٹی بھی قائم کر دی گئی تھی۔

جب ممالک غیر میں بہت سے ہم وطن ایک ہی علاقے میں پاس پاس آباد ہوتے ہیں تو وہ اپنے تحفظ، اتحاد اور آپس داری کا مظاہر کرتے ہیں۔ اگر چہ اوکی یوسان بھی جاپانی ہی تھی لیکن

انہوں نے اس کو اپنے حلقہ اور کمیونٹی سے خارج کر دیا تھا۔ اور اس کو اس کی پرواہ بھی نہ تھی۔

اپریل کا مہینہ تھا۔ اور شاید اس نا قابل دید واقعہ کے تقریباً پندرہ دن بعد کا ذکر ہے جب میں اسکول میں داخل ہوئی۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر ندی کے پل پر سے گذرتے ہوئے اوکی یوسان سے میری ملاقات ہوگئی۔ یہ پل دریا سے نکلنے والی اس ندی پر پھیلا ہوا تھا۔ جو میرے گھر اور اسکول کے درمیان بہتی تھی۔ پل کے بیچوں بیچ لکڑی کی دو چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں سبز رنگ سے پینٹ کی ہوئی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں آمنے سامنے ایک دوسرے کے مقابل تھیں اور ان میں بحریہ کے مسلح سنتری سنگینیں لئے پہرے پر کھڑے رہتے تھے۔ ایک جھونپڑے کے پیچھے پل کے قریب چینی لوگوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ دراصل موسم گرما میں شنگھائی میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ پوری آبادی کو بلا تخصیص قومیت حفاظتی تدابیر اختیار کرنا پڑی تھیں۔ جاپانیوں کو بھی ہیضے کے ٹیکے لگوانے کی ہدایات تھیں کہ وہ یا تو جاپانیوں کے لئے مخصوص ہسپتالوں میں جا کر ٹیکے لگوائیں یا پھر چاہیں تو ڈاکٹر کو گھر بلا کر بھی ٹیکے لگوا سکتے ہیں۔ میری والدہ ان لوگوں میں شامل تھیں جنہوں نے ٹاؤن ایسوسی ایشن سے ٹیکے لگوائے تھے۔

پل پر اور سڑک کے گوشے میں صرف چینی باشندوں ہی کو ٹیکے لگائے جا رہے تھے۔ اوکی یوسان بھی چینیوں کی قطار میں لگی کھڑی تھی۔ وہی اس دن والا چینی لباس پہنے تھی۔ قطار آگے بڑھتی تو وہ بھی ایک قدم آگے سرک آتی تھی۔ چینی لباس میں وہ بالکل ان ہی جیسی لگ رہی تھی۔ اس کے آگے پیچھے کھڑے لوگ بھی اس کو چینی ہی سمجھ رہے تھے۔ اور اس سے اپنی ہی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ اگر چہ اس کے جسم کی ساخت اور رنگت چینیوں ہی جیسی تھی پھر بھی وہ کسی نہ کسی طور ان سے قدرے مختلف نظر آتی تھی۔ میں چونکہ جانتی تھی کہ وہ جاپانی ہے اس لئے چینیوں کے قطار میں کھڑی ہونے کے باوجود میں نے فوراً اس کو پہچان لیا تھا۔ مجھے وہ سب سے الگ نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس وقت اس پر بڑا ترس آ رہا تھا کہ اس کے ہم وطنوں نے اس کا حقہ پانی بند کر کے اسے غیروں کے ساتھ قطار میں لگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے پیچھے سے اس کو آہستہ سے آواز دی ''اوکی یوسان!'' اس نے مڑ کر دیکھا اور میرے اسکول بیگ پر ہاتھ رکھ کر بولی ''چلو بھاگو گھر جاؤ۔ جلدی بھاگو۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' میں نے کہا۔

اس کی باری آنے تک ہمیں آدھے گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ فوجی سرجن نے جو اپنی ٹانگیں

الگ الگ کھلی کر کے ایک شاہی دیوتا کی طرح کھڑا تھا۔اس کا بازو کھینچا اور جھٹ سے سوئی اندر گھسیڑ دی۔ جسے اس نے جراثیم سے پاک بھی کیا تھا۔بس یوں ہی ایک کے بعد دوسرے کو لگائے

چلا جا رہا تھا۔ایک سیکنڈ سے کم وقت میں پانی جیسی سیال دوا کے ایک کے بعد دوسرے کو انجکشن دیئے جا رہے تھے۔اس نے تیزی سے اس کے بازو سے انجکشن کی سوئی کھینچی۔ایسا لگتا تھا کہ سوئی بہت پرانی تھی۔اس لئے کہ سوئی کے ساتھ خون کا ایک سیاہ قطرہ بھی سوئی پر لگا ہوا باہر نکل آیا۔میں نے جلدی سے پوچھا'' کیا تم کو تکلیف ہو رہی ہے؟''

''ہونہہ۔'' سرجن نے سر جھکا کر دیکھا اور اوکی یوسان سے پوچھنے لگا'' کیا تم بھی جاپانی ہو۔''اوکی یوسان نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔چپ چاپ بازو پر نکلے ہوئے خون کو اپنی ہتھیلی سے بالکل اسی طرح ملتی رہی جس طرح چینی کر رہے تھے۔ وہ مخالف سمت سے گھر کی طرف چلنے لگی۔

پل پار کر کے اور پرائمری سکول سے آگے گذر کر ہم اسی ندی کے ایک اور پل پر آ گئے۔پھر اس ندی سے گذر کر ہم ہونگ کا وٗ ٹاوٗن اس علاقے سے نکل آئے تھے جو جاپانیوں کا تھا۔یہاں پر صرف چند مکان تھے اور چند ہی لوگ تھے۔پھر ہم ایک کھلے میدان میں نکل آئے۔ادھر کوئی مکان نہیں تھا۔صرف کھیت ہی کھیت تھے۔جو افق تک پھیلے ہوئے تھے۔چلتے چلتے ہم ریت اور تارکول کے آمیزے سے بنی سڑک پر آ گئے تھے۔یہ سڑک کھیتوں کے درمیان سے گذرتی تھی۔ اور جاپانی فوج نے تیار کی تھی تا کہ اپنا سامان رسد چینی علاقے کے قلب تک پہنچایا جائے۔

اوکی یوسان کشادہ سڑک کے درمیان چلی جا رہی تھی۔کھیتوں میں ہر طرف سرسوں پھول رہی تھی۔ نیلے پیلے بسنتی پھولوں کے درمیان سے کہیں کہیں مکانوں کی سفید دیواریں جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے سے سفید آدمیوں کی رہائش کے لئے نہیں تھے۔وہ اتنے نیچے نیچے سے تھے کہ سمجھئے ایک بچے کے قد سے سیاہ سلیٹ کے پتھر سے بنی ہوئی تھی۔بے آب سی سیاہ سیاہ چھتیں۔چھت کے ڈھلوائی حصے کے نیچے ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔بس اتنی چھوٹی جیسے پوسٹ کارڈ کے سائز کی۔یہ سفید دیواروں والے مکان کہتے ہیں چینیوں کی قبریں تھیں۔کسی کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ یہ کسی طبقے کے لوگوں کی قبریں ہیں۔اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ قبروں کی یہ طرز تعمیر صرف شنگھائی ہی میں رائج تھا یا کہیں اور بھی۔قبر پر نہ کوئی کتبہ تھا نہ مرنے والوں کے نام کندہ تھے۔نہ

ہی تاریخ وفات اور سنہ لکھے ہوئے تھے۔ جاپانیوں کی قبروں کے برعکس یہ ایک دوسری کے قریب قریب اور پچھی ہوئی نہ تھیں بلکہ ایک قبر سے دوسرے کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔

''آؤ ادھر آ کر ان کے اندر دیکھو۔'' اوکی یوسان نے سرسوں کے پھولوں کے درمیان سے مجھے آواز دی۔ اور میں کھیت میں گھس گئی جہاں بے تحاشہ سرسوں کے پھول کھل رہے تھے۔

''کھڑکی کے اندر جھانک کر دیکھو۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ میں نے جھانکا۔ مجھے وہاں موت کے حوالے سے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ نہ تابوت کے تختے نہ ہڈیاں نہ کفن۔ البتہ دریائی گھاس ضرور اگ آئی تھی جس کے سبز سبز سرے اب کھڑکی تک بلکہ کھڑکی کے باہر بھی نکل آئے تھے۔ ان پتوں کا رنگ سرسوں کے ان ہریالے پودوں کی تیز سبز رنگت سے بھی زیادہ گہرا ہرا تھا، جو اس وقت دھوپ میں نہائے کھڑے تھے۔ وہ ننھی سی پوسٹ کارڈ برابر کھڑکی سے سر نکال رہے تھے۔ اوکی یوسان سے میں نے کہا کہ مجھے تو قبر کے اندر سے یہ گھاس ہی نظر آ رہی ہے۔ اس پر وہ بولی ''ہاں بس یہی تو آدمی ہوتا ہے۔'' اس نے اپنی ہتھیلی کے درمیان لے کر سرسوں کے پھول مسلے۔ پھر وہ سرسوں کے پھولوں سے لہلہاتے پودوں پر پسر کر لیٹ گئی۔ اس نے اپنی کہنی پر سر ٹکایا ہوا تھا۔ پھر یوں ہی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ''آسمان بھی تو ایک دم بسنتی ہو رہا ہے۔'' میں نے سرسوں کے پھولوں سے لدے پودوں کے درمیان کھڑے ہو کر دیکھا۔ پھولوں کی شاداب زردی میرے اردگرد اور میرے سینے تک آ رہی تھی۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے یہی بسنت رت کا پیلا پن پھیلتے پھیلتے اوپر کی جانب اٹھتا اٹھتا آسمان سے ہم کنار ہو گیا ہے۔

نیچے کی طرف کھیتوں میں جیسے ایک زرد رنگ کی موج تھی۔ ایک شاداب سیلاب کی مانند ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ یا پھر سنہری بسنتی چادر کی یکسانیت کو جا بجا سے توڑتی ہوئی قبروں کی وہ ننھی ننھی کھڑکیاں تھیں۔ یہ یہاں سے وہاں تک بکھری ہوئی کھڑکیاں کال کوٹھریاں ہی تھیں۔ اور اوکی یوسان بھی اس وقت ایک بڑی سی کال کوٹھری ہی پر لیٹی تھی۔

پہلی آندھیوں کے موسم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ شنگھائی میں گرمی کا آغاز جولائی کے مہینے سے ہوتا ہے۔ اس دن کھیتوں سے باہر نکل کر ہم دونوں اپنے اپنے راستے پر چل پڑے۔ اس کے بعد میں نے اوکی یوسان کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔

میری والدہ کو میری اس حرکت کا اچھی طرح علم تھا کہ اس دن میں اس کے ساتھ انجکشن لگانے والی قطار میں موجود تھی۔ اور پھر وہاں سے اس کے ساتھ سرسوں کے کھیتوں میں گئی تھی۔

ہمارے ایک جاپانی ہمسائے نے مجھے اس کے ہمراہ دیکھ کر انہیں یہ اطلاع دی تھی اور ہوشیار رہنے کی تاکید بھی کی تھی۔ یہ سن کر میری اماں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تم جان بوجھ کر مجرمانہ عادتوں میں مبتلا ہونا چاہتی ہو تو پھر یہ مکمل طور پر تمہارا اپنا فعل ہوگا۔

پھر انہوں نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ ''وہاں بیٹھ کر سرسوں کے پھولوں کے بارے میں اس نے تم سے کیا باتیں کی تھیں؟'' میں کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر میں اس کی یہ بات ان کو بتادیتی کہ اس نے سرسوں کے پھولوں کے درمیان بیٹھ کر قبروں میں سے جھانکتی ہوئی سمندری گھاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''یہ ہے آدمی'' تو وہ ہرگز بھی کچھ نہ سمجھ پائیں۔ لیکن چونکہ میں نے بہار کے موسم میں جب سرسوں پھولی تھی، اور زمین آسمان ہم رنگ نظر آرہے تھے تو، اس طرح زمین اور آسمان کے ملن کو دیکھا تھا اور اس کے الفاظ میں چھپے مفہوم کو سمجھا تھا اس لئے میں جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔

جاپان دشمن عناصر کی مخالفانہ کارروائیوں میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اب یہ ہوا کہ ہونگ کاؤ کے پررونق علاقے میں دن دیہاڑے ایک فوجی لیفٹیننٹ کو گولی ماردی گئی۔ راہ چلتی سڑک کی دوسری جانب سے گولی چلائی گئی تھی۔ اس واقعہ نے جاپانیوں کا سراسیمہ کردیا تھا۔ ان میں دہشت اور ہراسانی پھیل گئی تھی۔ ملٹی پروڈکٹس کا، جہاں میرے والد کام کرتے تھے، یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنے ملازمین کو ایسا کوئی واقعہ رونما ہونے کے امکانات کے پیش نظر فوری طور پر ہدایات جاری کردیتے تھے کہ وہ دشمن کی زد میں نہ آئیں اور اپنے بچاؤ کی خاطر وہ علاقہ فوری طور پر خالی کردیا کریں جہاں کسی بھی خطرے کے امکانات ہوں۔ ان کے ذہن میں بحرالکاہل کی جنگ کے خاتمے اور اس کے نتائج ابھی تک واضح اور نمایاں تھے۔ یہ بھی ان کے خفیہ محکمہ اطلاعات کا کمال تھا کہ ادھر وہ علاقہ خالی ہوتا ادھر ہی حملہ ہوجاتا۔

سات جولائی کو مارکو پولو کے پل پر ہونے والی جھڑپوں سے پہلے ہی کمپنی کے ملازمین کو علاقہ چھوڑ کر دینے کے احکامات جاری ہوچکے تھے۔ اور اب ہم لوگ جاپان واپسی کے لئے تیار تھے۔ لیکن ٹکٹوں کا انتظار تھا کہ ادھر ٹکٹ ملیں اور ہم لوگ وطن جانے والی کشتی میں بیٹھ جائیں۔ میری والدہ نے مجھے بتایا تھا کہ ہم نے اپنا وطن کبھی نہیں دیکھا ہے۔ وہاں پہنچ جائیں تو اطمینان بھی ہوجائے گا اور ہم محفوظ بھی ہوجائیں گے۔ ادھر ادھر پناہ گزینوں کی طرح بھاگے بھاگے تو نہیں پھریں گے۔

کچھ تو خوف کی وجہ سے اور کچھ موسم کے باعث مجھے باہر نکلنے اور احاطے سے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ چنانچہ میں نے احاطے ہی کے ایک گوشے میں کھڑی پائپ کے منہ کو انگوٹھے سے دبائے چھڑکاؤ کر رہی تھی اور پانی کی پھوہار باہر سڑک پر چلا رہی تھی کہ میری نظر اوکی یوسان پر پڑی۔ وہ سڑک پر سے گذر رہی تھی۔ اس نے ٹھنڈے سوتی کیمونو پر سرخ پٹکا باندھ رکھا تھا۔ میں نے پائپ ہاتھ سے ڈال دیا اور اس کے پاس چلی گئی۔ اس نے مجھ سے کہا تم میرے ساتھ بعد میں کھیل لینا۔ میں تمہیں بسکٹ اور مصری دوں گی۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

''تم لوگ کیا وطن جا رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اوکی یوسان نے بھی سر ہلا دیا اور بولی ''اچھا یہ بات ہے۔''

اس بات کے کوئی دو گھنٹے بعد کی بات ہے کہ سہ پہر کو چار بجے کے قریب اوکی یوسان نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ میں اپنی والدہ کی آنکھ بچا کر چپکے سے اس کے گھر کی طرف گئی تو اس کے مکان کے آگے ایک بھیڑ لگی تھی۔ درختوں کے برابر والی سڑک پر بہت ہجوم تھا۔ شرطوں اور مقابلے والے دن کے ہجوم سے بھی زیادہ بھیڑ تھی۔ ایک سیاہ رنگ کی پولیس کی گاڑی سڑک سے گھر جانے والے راستے پر کھڑی تھی۔ یہ کچرا اٹھانے والی گاڑی کہلاتی تھی۔ یہ زمانے بھر کا کوڑا کرکٹ سمیٹ کر اٹھا کر لے جاتی تھی۔ ہر قسم کی پرانی گری پڑی اشیا جن میں مردے تک شامل ہوتے تھے۔ ادھر ادھر سڑکوں پر پڑے بے شمار لاوارث مریض، کوڑے پر پھینکے ہوئے مردہ بچے۔ مردہ بلیاں، کتے سمیٹ کر لے جانے والی گاڑی میں قلیوں کے درمیان اس طرح گھستی چلی گئی کہ کسی جاپانی کی مجھ پر نظر نہ پڑے جائے۔ پھر میں نے اوکی یوسان کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔

''ایسا لگتا ہے کہ اس نے آپنے آپ کو چھت کی کڑی سے لٹکا لیا ہے۔'' میں نے ایک جاپانی خاتون کو کہتے سنا۔

''سنا ہے اس نے اپنے آپ کو چھت کی کڑی سے لٹکایا ہے۔'' ایک اور نسوانی آواز کان میں پڑی۔

''اف توبہ یہ اندرونی ٹپکے بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔''

میں نے ہجوم کے درمیان غیر متوقع طور پر اپنی والدہ کی آواز سنی اور میں چپکے سے جھونک کھا کر ہجوم کے درمیان سے نکل آئی۔

کہتے ہیں اوکی یوسان اپنے کمرے کی چھت کی کڑی سے لٹکی ہوئی مردہ پائی گئی تھی۔ اوکی یوسان مختصر سی ہلکی پھلکی تھی۔ وہ اتنی بھاری اور چوڑی چکلی نہ تھی۔ لیکن اگر اس نے اپنے گلے میں ٹیکے کا پھندا لگا کر اپنے آپ کو شہتیر سے لٹکا بھی لیا تو اس کے انگوٹھے فرش سے لگ رہے ہوتے۔ آخر اس نے اپنے آپ کو اتنی نیچی کڑی سے کیسے لٹکایا؟

جب میں نے اپنی والدہ کو اس موضوع پر بات کرتے سنا تو ادھر ہی کان لگا دیئے۔ ان کی گفتگو سنتے سنتے مجھے اچانک ہی یاد آ گیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ مجھے بلا کر گئی تھی اس نے مجھے بسکٹ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ہی اس کے دل میں یہ خودکشی کا کیسے خیال آ گیا۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے پہلے تو اس نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تم آؤ گی تو میں تم کو بسکٹ اور مصری کھلاؤں گی۔ اور اگر میں کچھ پہلے پہنچ گئی ہوتی تو یقیناً ٹشو پیپر میں لپٹے ہوئے بسکٹ میز پر رکھے ہوتے یا چائے کے سامان والی الماری میں رکھے ہوتے۔

آہستہ سے دروازے کا دستہ گھوما۔ آرائشی دودھیا شیشے والا دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم ڈیل ڈول اور سرخ بالوں والی طوائف اندر آ گئی۔

اوپر کی جانب جانے والے زینے کا جنگلہ صدر دروازے سے صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک آدمی بالکل سفید کپڑوں میں ملبوس ایک اسٹریچر اٹھائے اندر آیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے قدم دوسروں کے قدموں سے مل نہیں رہے تھے۔ جو اسٹریچر اٹھانے میں اس کی مدد کر رہے تھے۔ اس لئے کہ اسٹریچر کبھی ادھر اور کبھی ادھر کو جھول جاتا تھا۔

اوکی یوسان ہم لوگوں کی طرف سر کئے پڑی تھی۔ اس کے بال سفید کپڑوں والے آدمی کے پیچھے سے نظر آ رہے تھے۔ اسٹریچر پر لیٹی ہوئی وہ پر ہجوم احاطے میں لائی گئی۔ اس کے جسم کو کسی چادر یا کمبل سے ڈھانپا بھی نہ گیا تھا۔ اس کے بازو اس کے دونوں طرف بے حس و حرکت پڑے تھے۔ اور اس کی گردن کھنچی ہوئی تھی۔ وہ مر چکی تھی۔ زندگی میں تو وہ چھوٹی ہی سی نظر آتی تھی مگر اب کچھ لمبی نظر آ رہی تھی۔ اس کے پہلے سے نسبتاً لمبے جسم پر وہی گرمیوں میں پہننے والا سوتی کیمونو تھا۔ کمر سے وہی معمولی پٹکا بندھا تھا۔

سفید کپڑوں والے شخص نے اوکی یوسان کا اسٹریچر سیدھا گاڑی کے اندر ڈال دیا اور سرکنے والے دروازوں کو بند کر دیا۔ بند گاڑی میں چھوٹی سی لوہے کی جالی دار کھڑکی لگی تھی۔ پھر گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور اسے لے کر چل دی۔ گرمی کی سہ پہر ابھی خاصی کیا بالکل روشن تھی۔

اوکی یوسان کی خودکشی کے پورے دو دن بعد ہمارا کنبہ جاپان روانہ ہو گیا۔ پھر وہاں سے چین جاپان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کی خبر سنی۔

زرد غبار نے جاپان کے پورے آسمان کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ میرے اندر بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں کئی مرتبہ باہر نکل آئی۔ پھر ڈھلان کی طرف گئی۔ آندھی کے تیز جھکڑوں میں مجھے سکون مل رہا تھا۔ ڈھلان کے دامن میں شام کے اترتے سایوں میں چند لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔

جوں جوں وقت گذر رہا تھا زرد ریت کا غبار دبیز ہوتا جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے آسمان، تمام قصبہ اور وہ بچیاں سب کے سب زرد غبار کی دبیز تہہ میں ڈوبتے چلے گئے۔ زمین آسمان کی یہ ہم رنگی سرسوں کے کھیت میں سہانے اور سنہری پھولوں سے مشابہ لگ رہی تھی۔ مجھے وہی سرسوں کے کھیتوں اور کھلتے پھولوں والا منظر یاد آ رہا تھا جہاں میں پہلی مرتبہ اوکی یوسان کے ساتھ گئی تھی۔ لیکن آج یہاں ڈھلوان کے دامن میں دن کی وہ روشن چمک مفقود تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ کھو گیا ہے۔ کوئی چیز گم ہے منظر میں سے۔